عقائد سے متعلق قرآنی آیات کی اشاری تعبیرات:

تفسیر ابن عربی کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے پی-ایچ-ڈی علوم اسلامیہ

مقالہ نگار

نذیر احمد

پی ایچ ڈی سکالر شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

رجسٹریشن نمبر: 794phd/is/F18

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لیگویجز اسلام آباد

سیشن: 2022ء

بسم الله الرحمن الرحيم

منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالہ کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: عقائد سے متعلق قرآنی آیات کی اشاری تعبیرات تفسیر ابن عربی کا تجزیاتی مطالعہ

Indicative Interpretations of Qur'anic Verses Related to Beliefs

Analytical study of Tafsir Ibn Arabi

نام ڈگری: ڈاکٹر آف فلاسفی علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: نذیر احمد

رجسٹریشن نمبر:794phd/is/F18

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی _____

(نگران مقالہ) دستخط نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی _____

(شعبہ اسلامی فکر و ثقافت) دستخط صدر، شعبہ علوم اسلامیہ

پروفیسر ڈاکٹر خالد سلطان _____

(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنس) دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

میجر جنرل (ر) محمد جعفر _____

(ریکٹر نمل) دستخط ریکٹر نمل

تاریخ _____

حلف نامہ فارم

(Candidate Declaration form)

میں نذیر احمد ولد میاں محمد ابراہیم

رولنمبر———— رجسٹریشن نمبر:794phd/is/F18

طالب علم، پی ایچ ڈی، شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل)

اسلام آباد حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ

مقالہ بعنوان: **عقائد سے متعلق قرآنی آیات کی اشاری تعبیرات: تفسیر ابن عربی کا تجزیاتی مطالعہ**

Indicative Interpretations of Qur'anic Verse elated to belief :

Analytical study of Tafsir Ibn Arabi

پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا ہے اور پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی

کی زیر نگرانی مکمل کیا ہے، راقم الحروف کا اصل نام ہے، اور یہ کہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کروایا گیا ہے، نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لیے کسی یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار نذیر احمد

دستخط مقالہ نگار ————

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Abstract

Islamic belief system is established upon five basic pillars: i) Tawheed/ Oneness of Allah Almighty, ii) Risalah/Prophethood as source of Islamic law and finality of the Holy Prophet Muhammad (PBUH) iii) Divinely revealed books, including the Holy Qur'an as the Last Divine Book) iv) Angels/ Malaikah lead by Jibraeel, v) The Last Day of Judgment & The Life Hereafter.

The Holy Qur'an, being the primary source of Islamic Shariah and ideology has been interpreted throughout history by virtue of intertextuality (Tafseer Qur'an bil Qur'an) and in the light of practice or Sunnah of the Holy Prophet (PBUH). This interpretation or Tafseer has been named as Tafseer Maasur.

On the other hand, an intuitive interpretation (Tafseer Ishaari) of the Holy Book has been in vogue parallel to the traditionalist approach. Tafseer Ishari, as a method owned by some of the Sufi scholars of Qur'an, remains mainly influenced by subjectivity & intuitive thinking of the mystic exegetist. Though this method of Tafseer is acclaimed to be the source of getting inner meanings of word of God. One of the most prominent examples, in this regard is Tafseer Ibn e Arabi; interpretation by twelfth century Sufi poet, mystic & philosopher Muhammad ibn 'Alī ibn Muhammad ibn `Arabī (1165-1240).

The following research focuses on the analytical study of the Ishaari method of Qur'anic interpretation, keeping in view the textual study of Tafseer ibn e Arabi, especially regarding only the verses of Qur'an that explain basic beliefs/ primary dogmas of Islam. The study comprises three chapters; the first discovering basic principles of Qur'anic Tafseer and the remaining critically analyzing Ibn e Arabi's interpretations of the verses relating to basic beliefs in Qur'an.

فہرست عنوانات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ	iii
2	حلف نامہ فارم	iv
3	**(Abstract) ملخص مقالہ**	v
4	**فہرست عنوانات**	vi
5	اظہار تشکر	xi
6	انتساب	xii
7	**مقدمہ**	xiii
8	موضوع تحقیق کا تعارف اور اہمیت	xiv
9	سابقہ تحقیق کا جائزہ	xv
10	مقاصد تحقیق اور بنیادی سوالات	xviii
11	منہج تحقیق	xviii
12	ابواب و فصول کی تقسیم و ترتیب	xix
13	**باب اول: قرآنی آیات کی اشاری تعبیرات اور تفسیر ابن عربی کے تفردات**	1
14	**فصل اول: تفسیر قرآن کے بنیادی اصول و مآخذ**	2
15	تفسیر بالماثور کے اصول	4
16	اسرائیلیات اور تفسیر قرآن	15
17	تفسیر بالماثور کا ارتقاء	18
18	**فصل دوم : تفسیر اشاری کا ارتقاء اور قبولیت کی شرائط**	25
19	تفسیر اشاری کا آغاز و ارتقاء	29

20	علماء کی نظر میں تفسیر اشاری کا مقام و مرتبہ	35
21	تفسیر اشاری کی قبولیت کی شرائط	38
22	مفسر کے لیے ضروری علوم	40
23	تفسیر اشاری کے لیے اضافی اصول	43
24	**فصل سوم: تفسیر ابن عربی کے تفردات**	50
25	حروف مقطعات کی وضاحت میں تفسیری روایت	50
26	حروف مقطعات سے متعلق ابن عربی کا نقطہ نظر	51
27	معجزہ موسوی کی وضاحت میں ابن عربی کا تصور	52
28	محل نظر پہلو	54
29	قلب انسانی کی ماہیت کے بارے ابن عربی کی توضیحات	55
30	محل نظر پہلو	57
31	ابن عربی کے ہاں علم کشفی کا تصور	61
32	محل نظر پہلو	62
33	خبیث اور طیب کی وضاحت میں ابن عربی کی توضیح	63
34	محل نظر پہلو	64
35	واقعہ سلیمان اور تخت بلقیس سے متعلق ابن عربی کی تشریح	65
36	واقعہ ابراہیم کی توضیح	67
37	باطنی ہجرت کا تصور	69
38	تصوف کے حق میں تفسیر قرآن سے استنباط	71
39	**باب دوم: عقیدہ توحید اور رسالت سے متعلق ابن عربی کی اشاری توضیحات کا جائزہ**	76
40	**فصل اول: عقیدہ توحید اور وحدۃ الوجود**	77

41	تفسیر بالماثور میں عقیدہ توحید	78
42	عقیدہ توحید سے متعلق ابن عربی کی تعبیرات	81
43	مقام فنا	85
44	عقیدہ توحید کے شخصیت پر اثرات	87
45	عقیدہ توحید اور وحدۃ الوجود کا نظریہ	88
46	مستشرقین اور وحدۃ الوجود	94
47	**فصل: علم وحی اور تصور رسالت**	99
48	وحی کی ماثوری تعبیر	99
49	نزول وحی کی صورتیں	103
50	ابن عربی کی تشریحات	105
51	انبیاء کی جانب وحی	106
52	انبیاء کی بشری حیثیت کی حکمت	109
53	علم الوحی سے روح کی ترقی	110
54	قرآنی آیات کی روشنی میں عقیدہ رسالت	111
55	مقام رسالت سے متعلق ابن عربی کی تعبیرات	114
56	رسالت، نبوت اور ولایت	114
57	محل نظر پہلو	115
58	رسول جنس انسانی اور قبیلہ سے ہی کیوں ہوتا ہے	116
59	رسول شریعت اور رسول عقل کی اختراع	118
60	معرفت خدا کو معرفت رسول پر تقدیم ہے	119
61	انبیاء کا غصہ قہر الٰہی ہے	120
62	**باب سوم: تقدیر، ملائکہ اور علامات قیامت سے متعلق ابن عربی کی تعبیرات کا تجزیہ**	122

63	**فصل اول: ملائکہ اور تقدیر سے متعلق اشاری تعبیرات**	123
64	ملائکہ سے متعلق ابن عربی کی تعبیرات	129
65	جبریل، عقل فعال	130
66	محل نظر نقطہ	130
67	مسئلہ تقدیر سے متعلق آیات کی تفسیر	135
68	تقدیر سے متعلق ابن عربی کی تعبیرات	141
69	**فصل دوم: علامات قیامت سے متعلق ابن عربی کی تشریحات**	146
70	علامات قیامت سے متعلق ماثوری اور اشاری تعبیرات	146
71	دخان کی علامت	148
72	ظہور مہدی اور نزول عیسیٰ علیہ السلام	151
73	ابن عربی کی تعبیرات	160
74	**باب چہارم: قیامت اور آخرت سے متعلق ابن عربی کے نظریات**	166
75	**فصل دوم: قیامت اور اس کے مراحل**	165
76	ابن عربی کے ہاں قیامت صغریٰ اور کبریٰ	167
77	قیامت کا آغاز	168
78	ابن عربی کے خیال میں بعث بعد الموت	173
79	میزان کا قائم ہونا اور اعضاء کی گواہی	176
80	عقیدہ صراط اور عقیدہ شفاعت	179
81	**فصل دوم: جنت اور دوزخ سے متعلق تصورات**	187
82	جنت الفردوس کی اشاری تعبیر اور تجزیہ	190
83	جنت نعیم کی اشاری تعبیرات	195
84	جنت الماویٰ	201
85	جہنم کی بالماثور تعبیرات	201

86	نتائج تحقیق اور سفارشات	217
887	فہرست آیات،	222
88	فہرست احادیث،	231
89	فہرست مصادر و مراجع	232

اظہار تشکر

الحمدلله رب العالمین ولصلوۃ والسلام علیٰ نبی الکریم ﷺ امابعد !

سب سے پہلے میں اپنے رب کریم کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے ان لوگوں میں شامل کیا جو تعلیم و تعلم سے محبت کرتے ہیں اور اربوں کھربوں رحمتوں کا نزول ہو نبی رحمت ﷺ کی ذات پر جن کی تشریف آوری سے مؤمنین کو شرف ایمان ملا۔ یہ تحقیقی کام یقیناً ایک سنگ میل تھا جس میں چند شخصیات کی راہنمائی شامل رہی، جس سے یہ منزل میرے لیے آسان ہوئی ان افراد اخراج کو تحسین پیش نہ کرنا یقیناً بخل ہو گا۔ سب سے پہلے میں شکر گذار ہوں اپنے والد مرحوم اور والدہ محترمہ کا جن کی دعاؤں سے مجھے اس شرف سے بہرہ یاب ہونا نصیب ہوا۔

اس کے بعد میرے استاد محترم ڈاکٹر مفتی مظہر فرید شاہ صاحب (مہتمم جامعہ فریدیہ ساہیوال) جن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آج اس منزل تک پہنچا اور اس کے بعد ڈاکٹر مظہر حسین (پروفیسر آف ہسٹری اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور) جنہوں نے ہر مشکل فیصلہ میں اعلیٰ انداز میں راہنمائی کی اور ماسٹر محمد عمر صاحب جو مجھ جیسے کئی افراد کو اس منزل تک پہنچانے والے ہیں۔ ایک شخصیت جن کی باتوں میں بہت اثر ہے میری مراد ڈاکٹر عبد الغفار بخاری جب (پی ایچ ڈی) کی پہلی کلاس ہوئی بہت پریشان تھا لمبا سفر اور دیگر مسائل مگر ان کے پہلے لیکچر نے ساری تھکاوٹ اتار دی اور یہ سفر اپنی انتہا تک پہنچ گیا اور پتہ بھی نہیں چلا اور ان کے الفاظ کی تازگی اب بھی میرے قلب وروح میں موجود ہے۔

مذکورہ سب شخصیات میں جن کو سب سے زیادہ اپنے لیے قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں وہ ایک شفیق شخصیت، جن میں ہر وہ خوبی موجود ہے جو ایک عظیم انسان میں ہونی چاہیے، میری مراد پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی صاحب (سابق ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز اور موجودہ صدر شعبہ اسلامی فکر و ثقافت) ہیں جن کے زیر سایہ یہ تحقیقی سلسلہ تیزی سے پایہ تکمیل تک پہنچا، انہوں بہت وقت دیا، اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود ہر میسج کا جواب دیا اور یوں یہ تحقیقی کام جو انتہائی مشکل محسوس ہو رہا تھا بڑی آسانی سے پایہ تکمیل تک پہنچا۔

آخر میں اپنی وفا شعار بیوی (عزیز فاطمہ) کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے گھریلو ذمہ داریوں کو احسن انداز میں چلایا اور میرے تعلیمی معاملات میں میری پوری معاونت کی اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ سے

دعا گو ہوں اللہ تعالیٰ میری اس تعلیمی سعی کو قبول فرمائے اور اس کو میرے لیے فلاح دارین کا سبب بنائے اور میرے معاونین کو اللہ تعالیٰ مزید عزت اور کامیابی سے سرفراز فرمائے آمین!

انتساب

اپنی تحقیق کو میں نبی رحمت تاجدار و راہبر دوعالم ﷺ کے نام کرتا ہوں خدا کرے کہ بارگاہ محبوب خدا میں قبول ہو جن کی تخلیق اور بعثت کے باعث انسانیت کے نصیب کا ستارہ عوج پر پہنچا اور انسانیت کو اس کا اصل مقام ملا

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ محمد وآلہ واصحٰبہ وسلم

مقدمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدلله رب العالمين و العاقبة للمتقين والصلوٰة والسلام علىٰ رسوله الكريم وعلىٰ آله واصحابه اجمعين۔

1۔ موضوع تحقیق کا تعارف:

قرآنی آیات کی اشاری تعبیرات کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی تفسیر بالماثور کی مگر اس میں بنیادی حیثیت تفسیر بالماثور کو حاصل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تفسیر بالماثور معقولیت پر مبنی ہوتی ہے جو مضبوط دلائل کی روشنی میں بڑھتی ہے جو سب کے لیے یکساں قابل قبول ہوتے ہیں تفسیر بالماثور ہو یا تفسیر بالرائے المحمود دونوں کو قبولیت عامہ حاصل ہے لہذا اس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے مگر ان دونوں اقسام تفسیر کے اصول و قواعد ہیں جن کا جاننا ضروری ہے ان کی وضاحت سے اس تحقیق کا آغاز ہوا ہے اور ضروری قواعد کو ضروری وضاحت سے بالترتیب لکھا گیا ہے۔

عقائد کا حصہ انسان کی زندگی میں سب سے مقدم ہے اور ان کی پختگی کے لیے دلائل بھی مضبوط چاہیے ہوتے ہیں اور اسلام میں سب سے مضبوط اور معیاری دلائل کا منبع قرآن مجید ہے اور اس کی وضاحت کے لیے سب سے مضبوط طریقہ تفسیر بالماثور ہے جس میں سب عقائد کو معقول اور روایتاً بیان کیا گیا ہے مگر تفسیر اشاری کے انداز توضیح میں وہ پختگی نہیں ہے اگرچہ اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی تفسیر بالماثور کی مگر یہ قسم تفسیر ہمیشہ فرد واحد کی ذات کے گرد گھومتی ہے اور اسی کی فکر پر ترقی کرتی ہے جیسے جو تفسیر تکمیل دین کی آیت کی سیدنا فاروق اعظم نے نبی رحمت ﷺ کے متعلق کی کہ اس سے مراد نبی رحمت ﷺ کا وصال ہے وہ دوسرے صحابہ نے نہیں کی۔

تفسیر ابن عربی اشاری اقسام تفسیر کی نمائندہ تفسیر ہے مگر یہ قسم بالماثور تفاسیر سے مختلف تو ہے ہی مگر یہ اشاری تفسیر سے بھی مختلف ہے جس کا اندازہ اس مثال سے ہو جائے گا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی قوم کے لیے پانی مانگا اور اپنا عصا پتھر پر مارا اس سے بارہ چشمے جاری ہوئے ابن عربی اس کو انسانی ذات کی تبدیلی سے منسوب کرتے ہیں کہ یہ حواس خمسہ ظاہرہ، لطائف باطنیہ اور قوت علمیہ اور عملیہ ہیں اس کے علاوہ وہ فرشتوں کی عجیب وضاحت کرتے ہیں کہ یہ آسمانوں کی روح ہیں اور اسی طرح عقائد کی وضاحت بھی مختلف کرتے ہیں۔

موضوع کی ضرورت واہمیت :

عقائد کی حیثیت انسان کی زندگی میں کلیدی ہے اس پر علم عمل اور انسان کے اخلاص کی بنیاد ہے مگر ابن عربی کی عقائد سے متعلق وضاحت تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے المحمود سے بہت مختلف ہے اور عقائد کی وضاحت میں فرد واحد کی رائے کی قابل قبول نہیں ہے تفسیر اشاری چونکہ کشف پر مبنی ہوتی ہے جو انفرادی شخصیت کی رائے ہوتی ہے جب کہ تفسیر بالماثور کو مقبولیت عامہ کی وجہ سے ترجیح حاصل ہے کیونکہ یہ قسم تفسیر موزوں ترین ہے اور عقائد کا موضوع بھی حساس ترین ہے۔ تو عقائد کی وضاحت میں اولین درجہ تفسیر بالماثور کو ہی حاصل ہے اگر اس میں ترجیح تفسیر اشاری کو دی جائے تو خرابی کا باعث بن سکتا ہے۔

ابن عربی کی عقائد سے متعلق وضاحت بہت ہی مختلف ہے جس کا اندازہ عقیدہ وحدۃ الوجود، عقیدہ رسالت، عقیدہ وحی، آخرت، جنت دوزخ جتنے عقائد ہیں کی وضاحتوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے یہ ساری وضاحتیں اکثر ابن عربی کی ذاتی رائے اور کشف پر چلتی ہیں اور کشف کی کوئی اہمیت نہیں ہے کشف کی صحت ہمیشہ معقولیت کے تابع ہوتی ہے وگرنہ مردود ہوتی ہے جبکہ ابن عربی ایک متنازعہ ترین شخصیت ہیں جو ایک خاص طبقہ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں دوسری جانب ایک طبقہ ان کی فکر کو رد کرتا ہے تو اس امر کی ضرورت کو محسوس کیا گیا کہ ابن عربی کی عقائد سے متعلقہ فکر کو اور جمہور مفسرین کی وضاحت کو باہم تجزیہ سے واضح کیا جائے تاکہ اس کا صحت اور سقم واضح ہو جائے۔

اس تحقیق میں بنیادی عقائد جو فکر آخرت سے تعلق رکھتے ہیں ان کی ابن عربی کی مشکوک وضاحت صرف اس مادی جہان کے گرد گھومتی ہے اور انسان کی ذات میں تبدیلی تک ہی محدود رہتی ہے اور ایک حقیقی جہان جہاں انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ ملنا ہے اعمال کی سزا کا سلسلہ ہے اور قیامت کا قیام ہے سب عقائد کو انتہائی مبہم انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کی وضاحت اور اس ابہام کو جمہور مفسرین کی وضاحتوں کی روشنی میں بیان کرنے کی ضرورت تھی تو جمہور مفسرین کی آراء کو بنیاد بنا کر اس کی روشنی میں تفسیر ابن عربی کی آراء پر واضح تجزیہ کیا جائے اور اس ابہام کو دور کیا جائے اس لیے اس موضوع کو منتخب کیا اور ایک رائے تفسیر ابن عربی کے متعلق یہ بھی ہے کہ یہ تفسیر ابن عربی کی نہیں بلکہ عبد الرزاق قاشانی کی ہے اس کا ذکر شیخ محمد عبدہ کے حوالہ سے سید رشید رضا اپنی تفسیر المنار میں کرتے ہیں

" ومن ذلك التفسير الذي ينسبونه للشيخ الأكبر محي الدين بن عربي، وإنما هو القاشاني"[1]

یہ تفسیر جو شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی جانب منسوب ہے یہ قاشانی کی ہے

---

[1] ۔رضا، السید محمدرشید، التفسیرالقرآن الحکیم تفسیر المنار، (دارالمنار قاھرہ1947ء) 18/1

2۔ موضوع پر سابقہ کام کا جائزہ:

1۔ تزکیہ نفس اور تہذیب نفس تفسیر اشاری کے آئینہ میں ایک تجزیاتی مطالعہ (ایم۔فل مقالہ حافظ محمد ابو بکر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد)

اس مقالہ میں صرف نفس کی اصلاح اور اس کے احوال پر تبصرہ ہے اور تفسیر اشاری میں اس پر کس طرح تبصرہ ہوا اس کی اقسام اور اس کی تبدیلی ایک حالت سے دوسری کی جانب منتقلی اور پھر اس کا تفسیر اشاری پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے خواہشات سے نفس امارہ اور اور ان کے تصفیہ سے نفس مطمئنہ پروان چڑھتا ہے پر بات ہے

2۔ تفسیر مظہری میں تصوف اور اخلاق کی تعلیمات کا جائزہ (ایم۔فل مقالہ نوید اقبال علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد)

اس مقالہ میں نفس کی بیماریوں اور اثرات اور نفس کی تبدیلی تفسیر مظہری کی روشنی میں اور اثرات پر بحث ہے کس طرح ایک متقی پر اصلاح قلب کے بعد قرآن کے اثرات مرتب ہوتے ہیں ان تعلیمات کو بالترتیب لکھا گیا ہے تفسیر مظہری ایک صوفی تفسیر ہے اس میں تصوف کی تعلیمات کو صاحب مقالہ نے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔

3۔الجانب الاشاری فی تفسیرعندالشیخ محمد متولی الشعراوی درجه ماجیستر ،صفی الله خطیبی هروی الجامعه الاسلامیه العالمیه 2019

یہ ایم۔اے لیول کا مقالہ ہے جس میں شیخ متولی الشعراوی کی تفسیر کی صوفیانہ ابحاث کو ترتیب دیا گیا ہے اور ان کے تفردات کو ذکر کیا گیا ہے۔

4۔ تفسیر ضیاء القرآن میں مباحث تصوف مقالہ نگار غلام رسول نگران مقالہ ڈاکٹر شیر علی گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد 2013۔

یہ مقالہ تفسیر اشاری فیضی پر محیط ہے اور پیر کرم شاہ صاحب کے منفرد انداز کو ترتیب دیا گیا ہے خاص کر ان کے منفرد انداز جس میں وہ ہر تصوف کی اصطلاح کو اس کی مخالف اصطلاح سے تطبیق دیتے ہیں مثلا اطمنان نفس کی کیفیت کو اضطراب کی کیفیت بیان کر کے واضح کرتے ہیں اور یہ طریقہ تقریبا ایسا ہے جو سب سے منفرد ہے۔

5.Three Muslim Sages Avicenna Suhrawardi.Abne ,ArabiBy:**Seyyed Hossein Nsar** .Cavan Books : Delmar,New York

معروف اسلامی دانشور اور مصنف ڈاکٹر سید حسین نصر کی یہ کتاب، مسلم فلسفے کے سنہری دور سے متعلق ہے جس میں انہوں نے خاص طور پر تین مسلم فلسفیوں پر تفصیلی بحث کی ہے۔ مذکورہ شخصیات ابن سینا، سہر وردی اور ابن عربی ہیں۔ ابن عربی سے متعلق مصنف نے تصوف کے آغاز وارتقا سے لے کر ابن عربی کی انفرادیت تک کے سفر پر بحث کی ہے ۔ان کے خیال میں ابن عربی پہلے صوفی ہیں جنہوں نے تصوف کی روایت کو علمی اور اصولی بنیاد فراہم کی۔

6.The self Disclosoure of God Principals of Ibn al Arabi,s cosmologyBy: **William C, Chittick,** State university of New York Press

اس کتاب میں مصنف نے ابن عربی کے صوفی فلسفے کو شہود خداوندی کے تصور سے منسلک کیا ہے۔اس ضخیم کتاب میں ابن عربی کے تقریباً تمام اہم نظریات کو تحقیق کے ساتھ زیر بحث لایا گیا ہے۔ان کے خیال میں ابن عربی کا فلسفہ کائنات کی حقیقت کبریٰ کے گرد گھومتا ہے۔اسلام کے عقیدہ توحید کی تشریح بھی ابن عربی نے وحدت الوجود کے تصور کے ساتھ بیان کیا ہے۔

7.Ibn al-, Arbi,s Metaphysics of Imigination**TheSufi Path of KnowledgeBy:William C. Cahittick** State university of New York Press

معروف مصنف ولیم سی چیٹیک کی یہ کتاب تصوف کی علمی و فکری بنیادوں سے بحث کرتی ہے۔اس کتاب میں ابن عربی کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔

8.Roultedge-Studies in IslamicPhilosophy"**Philosophical Sufism**"An Introduction To The School of Ibn Al -, Arbi**By:Mukhtar H.Al**Taylors Francis Group London and New York

یہ کتاب تصوف کی فلسفیانہ بنیادوں کی وضاحت پر مبنی ہے۔ مصنف کے مطابق ابن عربی، تصوف میں میں الگ مکتب کے بانی ہیں اور ان کے روحانی تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر، صوفی منہاج کی الگ تشریحات دی ہیں.

9۔ **التفسیر الصوفی والشاری فی اعمال القلوب دراسۃ النقدیہ فی تفسیر روح البیان** محی الدین ہاشم (جنرل توراتھ 2018)

اس آرٹیکل میں اعمال اور تقویٰ کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے کہ باعمل اور بے عمل کے قرآن فہمی میں فرق ہوتا ہے ایک یہ آرٹیکل ہے جس میں تفسیر نظری پر تبصرہ ہے کہ ایک فلسفی کس طرح اپنے نظریات کے مطابق تفسیر کرتا ہے اور اس

میں فرقہ باطنیہ کا رد کیا گیا ہے یعنی اس آرٹیکل میں تفسیر اشاری کے ہر پہلو پر انتہائی مختصر بات کی گئی ہے اور اس پر مناسب تبصرہ بھی کیا گیا ہے

10۔ **تفسیر اشاری کی روایت و منہج کا اختصاصی مطالعہ** غلام شمس الرحمٰن شش ماہی التفسیر کراچی ج12 شمارہ32 جولائی دسمبر 2018

یہ آرٹیکل غلام شمس الرحمٰن نے التفسیر کراچی کے جولائی دسمبر 2018 کے شمارے میں لکھا اس تفسیر اشاری کی حکمت اور لطافت پے بات کی ہے اور تفسیر اشاری کی تاریخی پس منظر پر بات کی ہے چند صوفی تفاسیر کا ذکر کیا ہے تفسیر اشاری کے جواز اور عدم جواز پر بات کی ہے اور چند تفاسیر میں سے ایک ایک آیت لے کر سے تطبیق دی ہے۔

11۔ **روح المعانی میں صوفیانہ تفسیری رجحانات کا ایک تحقیقی جائزہ** (ممتاز حسین ڈاکٹر عطاء الرحمٰن شمارہ20 تہذیب الافکار جلد8 جولائی دسمبر 2018)

انہوں نے آغاز میں امام آلوسی کا تعارف دیا ہے پھر اشارہ کی اقسام بیان کی ہیں صوفیانہ تفسیر کا حکم بیان کیا ہے اس میں تفسیر اشاری کے حق میں اور مخالف آراء لکھی ہیں اور قبولیت اور عدم قبولیت کی صورتیں لکھی ہیں اور تفسیر اشاری کی دس کے قریب امثلہ لکھی ہیں مثلاً بسم اللہ میں ب کے کسرہ کی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تک پہنچنے کے لیے اس کی رضا اور عاجزی بہت ضروری ہے یعنی نقطہ کی طرح عاجزی اختیار کریں تو ایسے مقام حاصل کر لیں گے جس کو حیلہ اور تدبیر سے حاصل نہیں کر سکتے۔

جہاں تک تفسیر ابن عربی کی بات ہے اس پر اس انداز میں تحقیق کہ جمہور مفسرین کی عقائد سے متعلقہ وضاحت کی روشنی میں ابن عربی کی وضاحتوں کا تجزیہ کیا جائے ماضی میں کسی یونیورسٹی میں اس موضوع پر یا اس سے قریب کسی موضوع پر کام نہیں ہوا ہے۔

8۔ تحدید موضوع:

مجوزہ تحقیق منتخب عقائد سے متعلق آیات قرآنی کا تجزیہ ابن عربی اور جمہور مفسرین کی آراء تک محدود رہے گا۔

6۔ مقاصد تحقیق:

1۔ بنیادی عقائد سے متعلق قرآنی آیات کا مطالعہ اور ان کی اشاری تفہیم حاصل کرنا۔

2۔ تفسیر قرآن میں اشاری تعبیرات کے اصول وضوابط کا مطالعہ کرنا۔

3۔ اشاری تعبیرات میں ابن عربی کے منہج کا مطالعہ کرنا۔

بنیادی تحقیقی سوالات

1۔ کیا عقائد کی وضاحت تفسیر اشاری میں موجود ہے؟

2۔ کیا تفسیر اشاری کے لیے بھی قبولیت اور عدم قبولیت کے اصول موجود ہیں؟

3۔ کیا ابن عربی کا طرز تفسیر دیگر مفسرین کے طرز تفسیر سے مطابقت رکھتا ہے؟

9۔ منہج تحقیق:

1۔ قرآن مجید کی آیات کا ترجمہ تفسیر ضیاء القرآن سے لیا گیا ہے۔
2۔ یہ تحقیق کی قسم ناقدانہ جائزہ اور تنقیدی مطالعہ پر مشتمل ہے

سب سے پہلے عقائد سے متعلقہ کتب کا مطالعہ کیا گیا اور عقائد کی ابحاث تلاش کیں پھر ان عقائد میں سے ضروری عقائد کا انتخاب کیا اس کے بعد قرآن مجید سے ان عقائد سے متعلقہ آیات قرآنی کو تلاش کیا اور ان کو پھر عقائد کے اعتبار سے مختلف ابواب اور فصول میں موضوع کے اعتبار سے تقسیم کیا اس کے بعد بالماثور تفاسیر کا مطالعہ کر کے جمہور مفسرین کی آراء جو انہوں نے ان عقائد کے متعلق دیں انہیں قرآن سنت کی روشنی میں تحریر کیا گیا اور اس کے لیے چند تفاسیر جو دوران تحقیق میرے مطالعہ میں رہیں اور جن کو ترجیح دی وہ علامہ طبری کی جامع البیان، امام سیوطی کی در منثور، امام سمرقندی کی بحر العلوم، اور رازی کی تفسیر الکبیر سے بھی کچھ استفادہ کیا گیا ہے۔

اور اشاری تفاسیر میں سہل بن عبد اللہ تستری کی تفسیر تستری اور عبد الرحمٰن سلمی کی تفسیر سلمی، آلوسی کی تفسیر روح المعانی، اسماعیل حقی کی تفسیر روح البیان شامل ہیں اور اس کے علاوہ امام ابو لقاسم کا رسالہ قشیریہ، ابن عربی کی فصوص الحکم، فتوحات مکیہ، امام غزالی کی احیاء العلوم سے استفادہ کرتے ہوئے تفسیر اشاری کو واضح کرنے ک کوشش کی گئی ہے۔

اور انداز تحقیق یہ رہا کہ ہر عقیدہ کو قرآن وسنت کی روشنی میں تحریر کیا گیا ہے اور اس کے لیے تفسیر بالماثور کو معیار بنایا گیا ہے کیونکہ اس قسم تفسیر کو امت میں قبولیت عامہ حاصل ہے اور روایت اور درایت کے اصولوں کے مطابق بھی ہے اور پھر ابن عربی کی توضیحات کو اس تفسیر کے ذریعے دیکھا گیا ہے کہ یہ اس کے مخالف ہے یا اس کے مطابق اور متفق ہے بہت سی تشریحات میں ابن عربی اور تفسیر بالماثور میں اتفاق بھی ہے مگر اکثر مقامات پر تفسیر ابن عربی کی تشریحات میں ابن عربی کی اپنی رائے ہے جو تفسیر بالماثور سے ٹکراتی ہے تو اس کو واضح کر دیا گیا ہے متفق پہلو بھی واضح کیئے گئے ہیں مگر کچھ ایسے مقامات ہیں جن کی تشریح تو مختلف ہی ہے مگر وہ محل نظر ہیں ان کو محل نظر پہلو لکھ کر واضح کر دیا گیا ہے۔

ابواب وفصول کی تقسیم:

تحقیق ہذا کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے باب اول قرآنی آیات کی اشاری تعبیرات اور تفسیر ابن عربی کے تفردات پر مشتمل ہے جس میں تین فصول ہیں پہلی فصل تفسیر قرآن کے بنیادی اصول و مآخذ پر مشتمل ہے اس فصل میں تفسیر کی اقسام بالماثور اور بالرائے کی وضاحت کی گئی ہے اور اصول تفسیر بیان کئے گئے ہیں تفسیر میں اصح تفسیر، تفسیر القرآن بالقرآن ہے پھر تفسیر القرآن بالحدیث ہے اور اس کے علاوہ اصول تفسیر کے اصول وضوابط بیان کیئے گئے ہیں اور تفسیر القرآن کے لیے کن علوم کی ضرورت ہوتی ہے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔

فصل دوم میں تفسیر اشاری کا ارتقاء اور قبولیت کی شرائط پر بحث ہے اس کا آغاز نبی رحمت ﷺ کی حیات مبارکہ میں ہی ہو گیا تھا جس کی مثال الیوم اکملت لکم دینکم کی آیت کے نزول پر سیدنا فاروق اعظم کا رونا تھا اس کی تعبیر نبی رحمت ﷺ کی وفات سے کرنا تھا تفسیر اشاری کی پہلی تفسیر تفسیر تستری ہے جو مکمل ہوئی اس کے علاہ اس کو بالعموم سند قبولیت حاصل نہیں ہے چند شرائط کے ساتھ اس کو قبول کیا جاتا ہے۔

تیسری فصل ابن عربی کے تفردات پر مشتمل ہے ابن عربی کی تمام تفسیر اپنے انداز کی منفرد تفسیر ہے مگر اس کی کچھ مباحث اور توجیہات ایسی ہیں جو حقیقت سے بہت دور ہیں جن میں حروف مقطعات کی تفسیر جو بہت ہی مختلف ہے فرعون اور موسیٰ کا قصہ اس کی توجیہات بہت ہی مختلف ہیں مثلاً فرعون نفس امارہ ہے موسیٰ علیہ السلام قلب، سلیمان علیہ السلام کا عفریت قوت وہمیہ، ابراہیم علیہ السلام کا آتش نمرود میں جانا یہ رحم مادر کی آگ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے

چشمے نکلنے سے مراد حواس ظاہری، باطنی، قوت علمیہ اور عملیہ مراد ہے جب کہ بالماثور میں ان سب واقعات کی ایک تاریخ ہے اور قرائن سے ثابت ہے۔

باب دوم عقیدہ توحید اور رسالت سے متعلق ابن عربی کی اشاری توضیحات کے جائزہ پر مشتمل ہے جس میں دو فصلیں ہیں فصل اول عقیدہ توحید سے متعلق اشاری تعبیرات پر مشتمل ہے اس میں تفسیر بالماثور کی روشنی میں عقیدہ توحید کی تعبیرات لکھی گئی ہیں کہ اگر کوئی دوسرا خدا ہوتا تو کبھی نہ کبھی تو ان میں ٹکراؤ ہو جاتا اس کے علاوہ مفسرین بالماثور کی روشنی میں اس کو واضح کیا گیا ہے اس فصل میں تفسیر ابن عربی کی عقیدہ توحید سے متعلق توجیہات کو واضح کیا گیا جو بہت حد تک عقیدہ وحدۃ الوجود سے مماثل ہیں مگر کسی مقام پر رسالہ قشیریہ کی اصطلاح فنا اور بقا سے مشابہہ بھی ہیں۔

اس باب کی دوسری فصل علم وحی اور تصور رسالت سے متعلق اشاری تعبیرات پر مشتمل ہے اس فصل میں وحی کی صورتیں جن کا ذکر قرآن وحدیث میں موجود ہے بیان کی گئی ہیں البتہ ابن عربی نے وحی کے لغوی معانی کو ہی زیادہ زیر بحث رکھا ہے اس کے لیے ابن عربی ایک خاص روحانی ترقی روح کا افق اعلیٰ تک عروج پانا کہا ہے جب یہ عروج ملتا ہے تب وحی کی کیفیت ملتی ہے اور شیاطین بھی وحی کرتے ہیں اور انبیاء کی طرف بھی وحی آتی شیاطین کو طاقت دینے کیوجہ ابن عربی کہتے ہیں تاکہ حق اپنی مخالفت سے اور زیادہ واضح ہو جائے۔

اس فصل کا دوسرا حصہ عقیدہ رسالت سے متعلق ہے تفسیر بالماثور کے مطابق انبیاء کی بعثت کا مقصد انسانیت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جانب لانا ہوتا ہے رسول صاحب شریعت ہوتا ہے اور نبی صاحب طریقت ابن عربی کے نزدیک رسول صاحب عرفان بھی ہوتا ہے اور صاحب احکام بھی ابن عربی کے نزدیک عقل بھی رسول ہوتی ہے کیونکہ جب تک انسان مکلف نہیں ہوتا اسے رسول عقل کا نام دیا جاتا ہے اور مزید کہتے ہیں جن کو معرفت رسول نہیں ان کو معرفت خدا بھی نہیں کیونکہ اگر ان کو معرفت خدا ہوتی تو ان کو خدا کے احکام کی بھی معرفت ہوتی اور اللہ تعالیٰ لوگوں پر غضب اپنے انبیاء کی مخالفت کی وجہ سے کرتا ہے۔

باب سوم: تقدیر، ملائکہ اور علامات قیامت سے متعلق ابن عربی کی تعبیرات کا تجزیہ پر مشتمل ہے اس کی دو فصلیں ہیں۔ فصل اول: ملائکہ اور تقدیر سے متعلق اشاری تعبیرات پر مشتمل ہے فرشتوں کا ذکر قرآن مجید میں جلی الفاظ میں موجود ہے یہ نوری مخلوق ہیں یہ مومنین کی مشکلات کی صورت میں مدد کرتے ہیں اور کافروں کے لیے باعث عذاب ہیں جیسا کہ غزوہ بدر اور احزاب میں ہوا ان کا مسکن افلاک ہیں فرشتے سراپا خیر ہیں شر نہیں اور مزید جمہور مفسرین کے نزدیک ایک قسم فرشتوں کی ایسی بھی ہے جن کو روح کہا جاتا ہے یہ فرشتوں کو بھی نظر نہیں آتے فرشتے ابن عربی

کے نزدیک ماتحتوں سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں اس فصل کا دوسرا حصہ تقدیر سے متعلق ہے تقدیر ایمان کا حصہ ہے اس کا منکر حدیث کے مطابق مجوس ہے جو کائنات میں ہونے والا ہے سب سے پہلے اسے لوح تقدیر میں لکھا گیا ہے جبکہ ابن عربی کے نزدیک اس کی چار قسمیں ہیں لوح قضاالسابق ،لوح قدر ، تقدیر کی قسم جو نہاں ہے اور لوح ھیولیٰ یہ جب انسان بطن مادر میں ہوتا ہے تو اس کی قسمت لکھی جاتی ہے۔

فصل دوم :علامات قیامت سے متعلق ابن عربی کی تشریحات

فصل دوم علامات قیامت سے متعلق ابن عربی کی تشریحات پر مشتمل ہے جن میں کچھ علامات پوری ہو چکی ہیں اور کچھ علامات کبریٰ ہیں جو قرب قیامت پوری ہوں گی احادیث میں دس کے قریب علامات قیامت بیان کی گئی ہیں شق قمر یہ نبی رحمت ﷺ کے زمانہ پوری ہو چکی ہے اسکے بعد دخان یہ دھواں ہے اس کی توجیہات مفسرین نے مختلف بیان کی ہیں یہ دھواں ہے جو کافر اور منافق کے لیے عذاب اور مومن کے لیے محض نزلہ کی کیفیت ہو گی ابن عربی اس کو موت کی سختی سے تعبیر کرتے ہیں پھر خروج دجال اور نزول عیسیٰ بن مریم ہے مگر ابن عربی نے اس پر بات نہیں کی سورج کا مغرب سے طلوع ہونا بھی علامات قیامت سے ہے مگر ابن عربی اس کو بھی موت سے تشبیہ دیتے ہیں جو ایمان سے محرومی کی صورت قرار دیتے ہیں پھر دابۃ الارض کا نکلنا جو صحیح احادیث سے ثابت ہے مگر ابن عربی اسے جسم میں گناہوں کی بری تبدیلی سے تعبیر کرتے ہیں اور امام مہدی کے ظہور پر آحادیث سے اس فصل میں استدلال ہے ابن عربی کے نزدیک یا تو یہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں یا ان پر ختم ولایت ہے اور آخری علامت یمن سے آگ نکلے گی جو سب لوگوں کو میدان محشر میں جمع کر دے گی۔

باب چہارم: قیامت اور آخرت سے متعلق ابن عربی کے نظریات پر مشتمل ہے اس باب میں دو فصلیں ہیں فصل اول قیامت اور اس کے مراحل پر مشتمل ہے اس کا آغاز صور پھونکنے سے ہو گا جس سے سب مر جائیں پھر دوسرے نفخہ سے سب زندہ ہو جائیں گے ابن عربی کہتے ہیں یہ اسرافیل کی آواز حقیقت میں آواز قدسی ہو گی پھر آسمان پھٹ جائے گا یا تو حقیقتاً یا آسمانوں کی مخلوقات اتر پڑیں گی مگر ابن عربی کہتے ہیں اس سے مراد انسان کی روح کا کشف ہے اس کے بعد انسان یا عزت پائیں گے اور حساب سے قبل بھی ان کے لیے سواریاں ہوں گی یا ذلت ان کا مقدر ہو گی مگر اسے ابن عربی عین الجمع سے تعبیر کرتے ہیں اس کے بعد میزان کا ذکر ہے جس پر اعمال کا وزن ہو گا مگر ابن عربی اس سے مراد موت کا وقت لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہی یوم عدل وحساب ہے اس کے بعد انسان کے اعضا گواہی دیں گے زبانیں بند ہوں گی مگر ابن عربی کہتے کہ اعضا کی گواہی بولنا نہیں بلکہ اعضا کی صورت بدل جائے گی پھر پل صراکا ذکر ہے جو جہنم کے اوپر ہے اس سے گزر

کر جنت میں پہنچیں گے اور جہنمی اس میں گریں گے مگر ابن عربی اس کو عالم ناسوت کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ پھر عقیدہ شفاعت جس کی تفصیل قرآن وحدیث میں موجود ہے ابن عربی اس کو مقام ختم نبوت قرار دیتے ہیں اور آخر میں موت کے ذبح کیے جانے کا ذکر ہے جو آحادیث سے ثابت ہے مگر اس موت کی موت کو ابن عربی انسان کی موت ہی قرار دیتے ہیں۔

دوسری فصل جنت اور دوزخ سے متعلق تصورات پر مشتمل ہے جنت اچھے اعمال کا بدلہ ہے جنت کی چوڑائی زمین وآسمان کے برابر ہے جبکہ ابن عربی کہتے ہیں یہ اصلاح ذات اپنی ذات سے برائی ختم کرنے پر سکون کا نام ہے جس قدر ہم اپنی اصلاح کریں گے اس قدر سکون کی دولت ملے گی تفسیر بالماثور کے مطابق جنت کی چار اقسام ہیں جنت فردوس، عدن، نعیم اور ماویٰ جنت الفردوس سب سے بلند مقام ہے فردوس کا مطلب باغ ہے یہ رومی زبان کا لفظ ہے یہ متقین کا مقام ہے یہ عرش کے نیچے ہے جہاں عرش کے چرچرانے کی آواز سنائی دے گی ابن عربی کے نزدیک یہ حظریہ قدس ہے اس مقام پر نیک روحیں اور فرشتے جو وحی والہام کرتے ہیں ٹھہرے ہیں۔ پھر جنت نعیم ہے یہ جنت عدن اور فردوس کے درمیان میں ہے اس کی نعمتیں اور رونق صدا بہار ہے ابن عربی کے نزدیک یہ جنت افعال ہے۔

جنت عدن یہ جنت کا تیسر مقام ہے یہ جنت ایک موتی میں بنائی گئی ہے اس میں نبی صدیق اور شہید رہیں گے ابن عربی اسے افعال اور صفات کی جنت بتاتے ہیں یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرنے والے اور اس کی رضا پر راضی رہنے والے ہوں گے اور آخر میں جنت ماویٰ کا ذکر ہے یہ ایسے باغات ہیں جہاں لوگ اپنے اعمال سے پہنچیں گے یہاں شہدا کی روحیں شہادت کے بعد منتقل ہوتی ہیں ابن عربی کے نزدیک یہاں مقربین کی ارواح ہوتی ہیں۔

اس فصل کے دوسرے حصہ میں جہنم پر تحقیق اور تجزیہ ہے جہنم سزا کا گھر ہے اس کے سات درکات ہیں جہنم، لظیٰ حطمہ، السعیر سقر، جحیم، ھاویہ ابن عربی کہتے ہیں کہ کہ یہ سات جہنم کے درکات اصل میں پانچ تو انسان کے حواس ہیں اور قوت غضبیہ اور شہوانیہ ہیں جبکہ ہر ایک کی وضاحت کچھ یوں ہے لظیٰ یہ جہنم کا دوسرا طبقہ ہے کہ خالص انگارے ہیں اس میں شقی ہوں گے ابن عربی کے نزدیک یہ طبیعہ سفلیہ کی آگ ہے اس میں امیہ بن خلف جائے گا اس کے بعد حطمہ ہے یہ بھڑکتی آگ ہے جو دلوں پر چڑھ جائے گی مگر ابن عربی کہتے ہیں یہ آگ کے عذاب کی ایسی صورت ہے جو انسانی روح سے متصل ہے اس کے بعد سقر یہ جہنم کا چھٹا طبقہ ہے یہ آگ کے شعلے ہیں جو سب جلادیں گے اس میں ولید بن مغیرہ رہے گا اور اس میں تقدیر کے منکر رہیں گے ابن عربی نے اس کی کوئی وضاحت نہیں کی اس کے بعد سعیر ہے یہ شعلوں والی آگ ہے جو سب جھلسادے گی ابن عربی نے اس پر بھی تفصیل نہیں دی اس کے بعد جہیم ہے یہ جہنم کا وسط

ہے اس میں گاڑھاسیال مادہ ہے ابن عربی نے اس کا بھی نہیں لکھا اور آخری طبقہ ھاویہ ہے اسے امہ ھاویہ اس لیے کہا گیاہے انسان بار بار لوٹ کر اس میں جائے گا ابن عربی اسے طبع جسمانیہ کا جہنم قرار دیتے ہیں۔

باب اول

باب اول: قرآنی آیات کی اشاری تعبیرات اور تفسیر ابن عربی کے تفردات

فصل اول: تفسیر قرآن کے بنیادی اصول و مآخذ

فصل دوم: تفسیر اشاری کا ارتقاء اور قبولیت کی شرائط

فصل سوم: تفسیر ابن عربی کے تفردات

فصل اول:

تفسیر قرآن کے بنیادی اصول و مآخذ

تفسیر کا مادہ "فسر (ف س ر) " ہے، جس کا معنٰی واضح کرنا اور پردہ ہٹانا ہے۔ ابن منظور لکھتے ہیں: "الفسر كشف المغطى" [1] (فسر کا معنٰی چھپی ہوئی چیز کو ظاہر کرنا) اسی سے لفظ تفسیر معرض وجود میں آیا ہے۔ الفراہیدی کے قول کے مطابق "التفسير "هوا لبيان وتفصيل الكتاب" [2] تفسیر، بیان اور کتاب کی تفصیل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور ابن المنظور کہتے ہیں: "التفسيرهوالكشف المرادعن اللفظ المشكل"[3] (تفسیر سے مراد مشکل الفاظ کی مراد کو ظاہر کرنا) الفیروزآبادی کہتے ہیں کہ تفسیر کا مترادف تاویل بھی ہے:" التفسير والتاويل واحدهو كشف المراد عن المشكل"[4] (تفسیر اور تاویل ایک ہی ہیں، ان کا مفہوم ہے مشکل الفاظ کی مراد کو ظاہر کرنا)

ان تمام تصریحات سے جو چیز ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تفسیر مخفی، مرادی اور چھپے ہوئے معانی کی وضاحت کا عمل ہے۔ جس سے آیات کے حقیقی معانی تک راہنمائی ہوتی ہے، یوں تفہیم قرآن میں مدد ملتی ہے اور منشاء ربانی تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔

لفظ تفسیر، خود قرآن میں انہیں معانی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا﴾ "[5]

(نہیں پیش کریں گے آپ پر کوئی اعتراض مگر ہم لائیں گے آپ کے پاس اس کا صحیح جواب اور عمدہ تفسیر)[6]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "احسن تفسيراًيقول احسن تفصيلا "[7] (احسن تفسیر سے مراد احسن تفصیل ہے۔)

1۔ الافریقی، ابن منظور ، **لسان العرب** (دار صادر بیروت1992ء) 55/5

2۔ الفراھیدی ،خلیل بن احمد ،**کتاب العین** (مکتبہ الہلال،س۔ن) 247/7

3۔ الافریقی، **لسان العرب** 55/5

4۔ الفیروز آبادی، محمد بن یعقوب ، **القاموس المحیط** ،(مکتبہ تحقیق التراث موسسۃ الرسالہ دمشق،1998ء) 456

5۔ الفرقان :33

6۔ الازہری، کرم شاہ، **ضیاءالقرآن** (ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور1978ء)364/3

7۔ الطبری ،محمد بن جریر ،**جامع البیان** (مرکزالبحوث والدراسات العربیہ والاسلامیہ ، یمامہ، 2001ء) 448/17

قرآن مجید کی تفسیر دو طرح سے کی جاتی ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ قرآنی آیات کا مفہوم خود قرآن کے ذریعے متعین ہو، حدیث و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت ہو اور صحابہ کرام اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کے اقوال کی بنیاد پر تشریح کی جائے۔ اس طریق پر کی جانے والی تفسیر کو تفسیر بالماثور کہا جاتا ہے، جو سب سے معتبر مانی جاتی ہے اور اسے امت مسلمہ میں قبولیت عامہ کا درجہ بھی حاصل ہے۔ تفسیر ماثور کی بنیادیں درج ذیل ہیں:

1۔ عربی زبان میں مہارت 2۔ اسباب نزول سے واقفیت 3۔ عربوں کے مزاج اور عادات سے واقفیت
4۔ اہل کتاب کے احوال سے واقفیت 5۔ علم لدنی یا اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد اور معانی کا القاء۔[1]

تفسیر بالماثور کا انحصار روایت پر ہے، جب کہ تفسیر قرآن کا دوسرا طریق درایت پر مبنی ہوتا ہے اور مفسر اپنی اجتہادی بصیرت یا تعقل و تدبر کی بنیاد پر متن قرآن کی توضیح و تاویل کرتا ہے۔ ایسی تفسیر، تفسیر بالرائے کہلاتی ہے۔ تفسیر بالرائے کی دو اقسام ہیں: تفسیر باالرائے محمود اور مذموم۔ تفسیر بالرائے محمود ایسی تفسیر کو سمجھا جائے گا جو روایت کے قریب تر ہو اور جسے باالعموم امت کے خواص و عوام کی طرف سے سند قبولیت حاصل ہو جبکہ تفسیر بالرائے مذموم ایسی تفسیر کو کہا گیا ہے جو عقلی اجتہادات پر مبنی ہو جہاں مسلمہ اصول کو درخور اعتنانہ سمجھا جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ تفسیر کی ایک روایت وہ موجود ہے جو مفسر کی وجدانی بصیرت اور کشف و الہام پر مبنی رائے کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ بعض صوفیاء نے اپنی روحانی بصیرت کی بنیاد پر بعض آیات قرآنی کی تفسیر جمہور علماء کی رائے سے ہٹ کر کی ہے، جو تفسیر اشاری کے نام سے موسوم ہے۔ تفسیر اشاری میں بعض اوقات تاویل فاسد شامل ہو جاتی ہے جو تفسیر بالماثور کے اصول کے مطابق نہیں ہوتی۔ اس صورت حال سے بچنے کے لئے، کچھ اضافی اصول و شرائط بھی ترتیب دیئے ہیں، جن کے استعمال سے تفسیر اشاری میں موجود افراط و تفریط سے، تفسیر قرآن کو محفوظ بنایا جاسکتا ہے۔

تفسیر بالماثور کے اصول:

قرآن مجید کل انسانیت اور سب زمانوں کے لئے ہدایت کا پیغام لایا ہے۔ چونکہ انسان کی ہدایت اس کتاب کا مقصود اولیں ہے اس لیے ایک انسانی زبان عربی مبین میں نازل ہوئی ہے۔ قرآن کی اپنی ایک خاص زبان ہے جو اپنی

1۔ ندوی فیصل احمد، **تفسیر واصول تفسیر کے قواعد** (مکتبہ الشباب المیلہ لکھنؤ 2021ء) 28 (بحوالہ تفسیر القرآن بالقرآن تاصیل وتقویم)

اصطلاحات اور اپنے محاورے میں ڈھلی ہیں۔ قرآن مجید میں فہم حاصل کرنے اوراس کی تفسیر و تشریح کرنے کے کچھ اصول وضوابط ہیں جو اہل علم نے، خود قرآن اور صاحب قرآن سے اخذ کرکے مرتب کر دیے ہیں۔

جمہور علماء نے انہی اصولوں کو اپنا کر قرآن کی تفسیر کو جاری و ساری رکھا ہے، یہ سلسلہ تفسیر تفسیر ماثور کہلاتا ہے۔ ذیل میں اہم اصول و مآخذ کی مختصر وضاحت کی گئی ہے۔

تفسیر قرآن بالقرآن:

ا۔ تفسیر کا سب سے پہلا مصدر خود قرآن مجید ہے جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اسے سب سے بہتر جانتا ہے۔ شیخ ابن تیمیہ فرماتے ہیں اگر تم سے کوئی سوال کرے کہ سب سے اچھا تفسیر کا طریقہ کون سا ہے؟ تو اس کا جواب ہے۔

"ان اصح الطرق فی ذالک ان تفسیر القرآن بالقرآن"[1]

(بے شک تفسیر کا صحیح ترین طرز قرآن مجید کی تفسیر قرآن سے کرنا ہے)

قرآن مجید میں ایک مقام پر ایک بات اجمالی کی جاتی ہے، تو دوسرے مقام پر خود قرآن مجید اس کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اس لیے علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

" من اراد تفسیر الکتاب العزیز طلبہ اولاً من القرآن فما اجمل منہ فی مکانٍ فقد فسر فی موضع آخر وما اختصر فی مکان فقد بسط فی موضع آخر "[2]

(جو کوئی بھی قرآن مجید کی تفسیر کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے وہ اسے قرآن مجید سے تلاش کرے کیونکہ قرآن مجید ایک مقام پر اگر ایک بات مجمل کرتا ہے تو دوسرے مقام پر اس کی وضاحت بیان کرتا ہے اور اگر ایک مقام پر بات مختصر کرتا ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل بیان کرتا ہے)

قرآن مجید کی تفسیر قرآن سے کرنے کی کئی صورتیں ہیں جو درج ذیل ہیں:

1۔ پہلی صورت یہ ہے کہ قرآن مجید میں مسلسل آیات قرآنی آرہی ہوں جو اپنے مابعد کی وضاحت کرتی ہوں مثلا

﴿وَٱلسَّمَآءِ وَٱلطَّارِقِ وَمَآ أَدۡرَىٰكَ مَا ٱلطَّارِقُ ٱلنَّجۡمُ ٱلثَّاقِبُ﴾[3]

(قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی آپ کو کیا معلوم یہ رات کو آنے والا کیا ہے ایک تارا نہایت تاباں)

1۔ ابن تیمیہ، احمد بن علیم، **مقدمہ اصول التفسیر**، (مکتبہ الحیاۃ بیروت1980ء)، 39

2۔ السیوطی، جلال الدین، **الاتقان فی علوم القرآن**، (الناشر الہیئۃ العامۃ المصریہ، 1974ء) 200/4

3- الطارق: 1-3

اس آیہ مقدسہ میں پہلی آیت میں لفظ طارق ہے۔ دوسری آیت میں اس پر سوال ہے۔ اور تیسری میں اس کا جواب ہے کہ طارق نجم ثاقب ہے۔

2۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آیات الگ الگ مقامات پر ہوں لیکن نبی رحمت ﷺ نے خود دوسری آیت سے تفسیر فرمائی ہو مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں جب یہ آیت: ﴿ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَلَمۡ يَلۡبِسُوٓاْ إِيمَٰنَهُم بِظُلۡمٍ أُوْلَٰٓئِكَ لَهُمُ ٱلۡأَمۡنُ وَهُم مُّهۡتَدُونَ﴾ [1] (وہ لوگ جو اپنے ایمانوں کو ظلم کے ساتھ جمع نہیں کرتے وہی لوگ امن میں ہیں اور وہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں) نازل ہوئی تو صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عرض کی یارسول اللہ یہ تو بہت مشکل ہے غلطی تو سب سے ہوتی ہے تو اس کی وضاحت میں نبی رحمت ﷺ نے قرآن مجید کی سورہ لقمان کی آیت مقدسہ تلاوت فرمائی: ﴿يَٰبُنَيَّ لَا تُشۡرِكۡ بِٱللَّهِۖ إِنَّ ٱلشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيمٞ﴾ [2] (اے بیٹے شرک نہ کر بے شک شرک ظلم عظیم ہے)

3۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کسی آیت کی تفسیر میں کوئی سوال پیدا ہو اور صحابی رسول اس کے جواب کے لیے کسی آیت کو پیش کر دیں، مثلاً سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ﴿والسقف المرفوع﴾ [3] فرمایا ﴿وَجَعَلۡنَا ٱلسَّمَآءَ سَقۡفَۢا مَّحۡفُوظٗاۖ وَهُمۡ عَنۡ ءَايَٰتِهَا مُعۡرِضُونَ﴾ [4] (ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا اور پھر بھی ہماری آیتوں سے منہ پھیرتے ہیں) اس آیت میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے آیت کی وضاحت دوسری آیت سے فرمادی۔ [5] کہ چھت سے مراد آسمان ہے۔

4۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مفسر اپنی رائے اور اجتہاد سے ایک آیت کو دوسری آیت کی تفسیر قرار دے۔ یہ اجتہاد اور استنباط ٹھیک بھی ہو سکتا ہے اور مختلف فیہ بھی: مثلاً ﴿وَٱلۡمُطَلَّقَٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَٰثَةَ قُرُوٓءٖ﴾ [6] (اور طلاق یافتہ عورتیں تین حیض گزاریں) یہاں لفظ قروء کے معانی میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد طہر بھی ہے اور حیض بھی۔

1۔ الانعام: 82

2۔ لقمان: 13

3۔ الطور: 5

4۔ الانبیاء: 32

5۔ یوسفی، عبدالرحمٰن، **تفسیر القرآن کے اصول وقواعد** (مکتبہ اسلامیہ لاہور 2016ء) 102

6۔ البقرہ: 228

5۔ایک پہلو یہ ہے کہ قران میں ناسخ اور منسوخ آیات کی پہچان اور حکمت کی تعیین کر کے تفسیر کی جائے، مثلاً قرآن میں ہے کہ:

﴿ وَٱلَّٰتِي يَأۡتِينَ ٱلۡفَٰحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمۡ فَٱسۡتَشۡهِدُواْ عَلَيۡهِنَّ أَرۡبَعَةٗ مِّنكُمۡۖ فَإِن شَهِدُواْ فَأَمۡسِكُوهُنَّ فِي ٱلۡبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّىٰهُنَّ ٱلۡمَوۡتُ﴾ [1]

(اگر تمہاری عورتیں کوئی بے حیائی کا کام کریں پس اس پر تم چار گواہ لاؤ پس اگر وہ گواہی دیں تو ان کو اپنے گھروں میں روک لو یہاں تک کہ ان کو موت آئے)

علماء نے اس آیت کو سورہ النساء کی آیت کے ساتھ منسوخ سمجھا ہے:﴿ٱلزَّانِيَةُ وَٱلزَّانِي فَٱجۡلِدُواْ كُلَّ وَٰحِدٖ مِّنۡهُمَا مِاْئَةَ جَلۡدَةٖ﴾ [2] (اگر زانی مرد یا عورت بے حیائی کا ارتکاب کرے تو اسے سو کوڑے مارے جائیں)

6۔ قرآن کے مطلق اور مقید الفاظ کی تفسیر: قرآن کے مطلق الفاظ وہ ہیں جن کی دلالت اپنی پوری جنس پر ظاہر ہوتی ہے ،مثلاً جب قرآن میں آتا ہے کہ: ﴿فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوۡ عَلَىٰ سَفَرٖ فَعِدَّةٞ مِّنۡ أَيَّامٍ أُخَرَۚ﴾[3] (جو کوئی تم میں سے مریض یا مسافر ہو تو دوسرے ایام میں اپنے روزوں کی تعداد پوری کرے)، تو اس میں ایام مطلق ہیں سارے سال میں جب چاہیں روزے رکھ سکتے ہیں۔

دوسری طرف قرآن حکیم، بعض مقامات پر اپنے احکام کے اسلوب بیان میں ہی تقیید کا پہلو صادر فرماتا ہے، تو اس کی تفسیر اسی لحاظ سے قرآن کے الفاظ سے کی جاتی ہے۔ مثال کے لیے ذیل کی آیت مقدسہ:

﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ ٱلۡمَيۡتَةَ وَٱلدَّمَ وَلَحۡمَ ٱلۡخِنزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ بِهِۦ لِغَيۡرِ ٱللَّهِۖ فَمَنِ ٱضۡطُرَّ غَيۡرَ بَاغٖ وَلَا عَادٖ فَلَآ إِثۡمَ عَلَيۡهِۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٞ رَّحِيمٌ ﴾[4]

1۔ النساء:15

2۔ النور :2

3۔ البقرہ: 185

4۔ البقرہ:173

(بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا جائے حرام قرار دیا ہے پس جو کوئی تم میں سے مجبور ہو وہ سرکشی نہ کرے اور نہ ہی حد سے بڑھے تو اس پر گناہ نہیں بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے)

علمائے تفسیر کے مطابق، اس آیہ مقدسہ کے حکم میں اضطرار مطلق ہے، جسے انتہائی مجبوری کی حالت کے ساتھ مقید کر کے ، حرام کھانے کی اجازت دے دی گئی، جب کہ کھانے والا اللہ کے قانون کی مطلقاً بغاوت پر نہ آئے اور نہ ہی حرام کا عادی ہونے لگے، پس اجازت مشروط کر دی گئی:

﴿ فَمَنِ ٱضۡطُرَّ فِي مَخۡمَصَةٍ غَيۡرَ مُتَجَانِفٖلِّإِثۡمٖ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُور رَّحِيم﴾[1]

(پس جو لاچار ہو جائے بھوک میں درآں حالانکہ نہ جھکنے والا ہو گناہ کی طرف)

7۔ قرآن میں مجمل اور مفصل احکام کا معاملہ: تفسیر قرآن بالقرآن کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض احکام کے بیان میں قرآنی آیات، اجمال کا اسلوب اختیار کرتی ہیں مگر دوسرے مقام پر مجمل کو تفصیل سے بیان کر کے مفصل کر دیتی ہیں۔ لہٰذا، مفسر قرآن، اسی تفصیل سے قرآنی ہدایت کی تشریح کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی آیت ملاحظہ ہو:

﴿ وَلَا تَقۡرَبُواْ مَالَ ٱلۡيَتِيمِ إِلَّا بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ أَشُدَّهُ﴾[2]

(یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اچھے طریقے سے مگر جب وہ جوانی کو پہنچ جائے۔)

اس آیت کے مجمل حکم کو دوسری آیت مقدسہ کے ذریعے مفصل کیا گیا ہے کہ یتیم کے بلوغ / جوانی تک پہنچنے کا مطلب، اس کا سن رشد کو پہنچنا اور نکاح کے قابل ہو جانا ہے:

﴿ وَٱبۡتَلُواْ ٱلۡيَتَٰمَىٰ حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغُواْ ٱلنِّكَاحَ فَإِنۡ ءَانَسۡتُم مِّنۡهُمۡ رُشۡدا ﴾[3]

1۔ المائدہ: 3

2۔ الانعام: 152

3۔ النساء: 6

(اور آزماتے رہو تم یتیموں کو یہاں تک کہ پہنچ جائیں اپنی نکاح کی عمر کو اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لوٹا تم ان کو ان کے مال)

تفسیر قرآن بالحدیث و سنت:

قرآن مجید کی تفسیر کا دوسرا بڑا مصدر حدیث نبوی ﷺ ہے۔ جس کے بارے میں مفسرین فرماتے ہیں "السنۃ شارحۃ للقرآن"[1] (سنت نبوی قرآن مجید کی وضاحت کرتی ہے)۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿إِنَّآ أَنزَلۡنَآ إِلَيۡكَ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ﴾[2]

(ہم نے آپ کی جانب قرآن نازل فرمایا تاکہ آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہے۔ اس کے ذریعے لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمائیں)

اسی طرح کئی آیات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی رحمت ﷺ کو قرآن مجید کا مکمل فہم عطا فرمایا تھا اور آپ ﷺ اس کے ذریعے لوگوں کے درمیان فیصلے فرماتے تھے۔ بہت سی احادیث مبارکہ قرآن کی تفسیر حدیث کے ذریعے کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ نبی رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا((انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ یعنی السنہ))[3] (اللہ تعالیٰ نے مجھے قرآن اور اس کے ساتھ اس کی مثل بھی عطا فرمائی ہے یعنی سنت)۔

گویا حدیث نبوی تفسیر قرآن کا دوسرا بنیادی ماخذ ہے۔ علماء کے مطابق وضاحت حدیث نبوی ﷺ کی قرآن مجید سے تطبیق کی تین صورتیں ہیں جن میں دو صورتیں اتفاقی ہیں البتہ ایک صورت میں اختلاف ہے اس کی وضاحت میں امام شافعی فرماتے ہیں:

" فلم اعلم من اہل العلم مخالفاً فی ان سنن النبی ﷺ من ثلٰثۃ وجوہ فاجتمعوامنہا علیٰ وجہین "[4]

(میں نہیں جانتا کہ کبھی اہل علم کا اس میں قطعاً اختلاف ہوا ہو کہ حدیث کی تین اقسام ہیں جن میں دو میں تو سب کا اتفاق ہے البتہ ایک میں اختلاف ہے)

1۔ السیوطی ، **الاتقان** ،200

2۔ النساء:105

3۔ السیوطی ، **الاتقان** 200

4۔ الشافعی ، محمد بن ادریس ، **الرسالۃ**(دار الکتب العلمیہ بیروت، 2005ء) 91

ایک یہ قرآن مجید اور حدیث کا مفہوم ایک ہو:

"ما انزل الله فیہ نص الکتاب فبین رسول الله ﷺ مثل ما نص الکتاب "[1]

(اللہ تعالیٰ نے کوئی نص نازل نہیں فرمائی۔ مگر نبی رحمت ﷺ نے اسی طرح اس کی وضاحت فرمادی یعنی مفہوم بھی ایک جیسا اور مراد بھی ایک جیسی)

دوسرا قرآن مجید میں کوئی ایسا جملہ یا حکم نازل ہوا کہ جس کی مراد واضح نہیں تھی تو نبی رحمت ﷺ نے اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد اور منشاء واضح فرمادی:

"مما انزل الله تعالیٰ فیہ جملۃ الکتاب فبین معنیٰ ما اراد ایضاً"[2]

(قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا جملہ نازل فرمادیا جس کی مراد واضح نہیں تھی تو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی وضاحت فرمادی)

یہ دو ایسی اقسام ہیں جن کی مراد میں کسی کو اختلاف نہیں البتہ تیسری میں اختلاف ہے یہ سنت کی ایسی قسم ہے جو نص سے کسی بھی اعتبار سے مطابقت نہیں رکھتی۔

"وجہ الثالث ماسن رسول الله ﷺ فیما لیس فیہ نص "[3]

(نبی رحمت ﷺ کی ایسی حدیث جس کی تائید میں قرآن مجید کی کوئی آیت نہیں یہ اختلافی صورت ہے)

اس کی توجیہ میں آئمہ کے کئی اقوال ہیں ایک یہ ہے کہ نبی رحمت ﷺ کی تمام احادیث قرآن مجید کی تفسیر ہیں۔ مگر وہ روایات جن کو محدثین خیال کرتے ہیں کہ ان کی اصل قرآن میں موجود نہیں حقیقت میں یہ احادیث بھی تدبر فی القرآن ہی کا نتیجہ ہی ہیں۔

" قال لم یسن سنۃ قط الا ولہا اصل فی الکتاب"[4] **کوئی بھی حدیث ایسی نہیں جس کی اصل قرآن میں موجود نہ ہو۔ اس کی وضاحت میں امام شافعی اس کی مثال دیتے ہوئے وضاحت فرماتے ہیں :** عدد الصلوٰۃ و عملہا علیٰ اصل جملۃ الصلوٰۃ فرض الصلوٰۃ [5] **(نمازوں کی تعداد اور طریقہ حقیقت میں اس کی اصل فرض نماز والا جملہ ہے)**

1: الشافعی ،**الرسالۃ** ،92

2۔ ایضاً

3: ایضاً

4: الشافعی ،الرسالۃ ،92

5: ایضاً

اقوال صحابہ و تابعین کے ذریعے تفسیر قرآن:

تفسیر قرآن کا ایک ماخذ، صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین (اور تابعین کرام) کی طرف سے کی گئی بعض تشریحات ہیں۔ جب کوئی صحابی کسی آیت کی لغوی تشریح کر دیتا ہے اور ایسی بہت سی امثلہ صحابہ کرام سے ملتی ہیں، تو اسے تفسیر قرآن میں موزوں تر سمجھا جائے گا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آیت: ﴿وَكَانَتِ ٱلْجِبَالُ كَثِيبا مَّهِيلًا﴾[1] ((الرَّمْلُ السَّائِلُ وَبِيلًا شَدِيدًا))[2] میں مہیل کی وضاحت ہو گئی اب کوئی مہیل سے دیگر معنیٰ مراد لیا تو باطل ہو گا۔ امام شافعی کی رائے کے مطابق تفسیر القرآن میں صحابہ کا قول مستقل حجت نہیں ہے بلکہ انہیں دلائل اور قرائن کی روشنی میں دیکھا جائے گا اگر اس پر پورا اترتا ہے تو حجت ہو گا وگرنہ نہیں۔ تاہم، اگر کوئی صحابی کسی اہل کتاب کے علماء یا ان کی کتابوں سے کوئی قول پیش کرتا ہے۔ نہ تو یہ صحابی کا اپنا قول ہو گا نہ ہی مرفوع روایت کے درجہ میں ہو گا بلکہ اس کا حکم وہی ہو گا جو اسرائیلی روایات کا ہوتا ہے۔[3]

> صحابہ کا قول اس وقت حجت ہو گا جب وہ کسی ایسی آیت یا کلمہ کی وضاحت کرے وہ تفسیر قرآن کے کسی صریح قول کے خلاف نہ ہو۔ پھر یہ کہ اس کے خلاف کسی صحابی کا قول نہ ہو کیونکہ کسی دوسرے صحابی کی خاموشی یا ان سے عدم نقل اس بات کی دلیل ہے کہ صحابی کی رائے صائب ہے۔[4]

لغت عرب بطور مصدر تفسیر:

تفسیر قرآن کا ایک مصدر لغت عرب ہے، اس لیے قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا اور جس قوم میں نازل ہوا فصاحت و بلاغت ان کی گھٹی میں ملی ہوئی تھی، جو الفاظ کے اسرار و رموز اور گہرائی سے بخوبی واقف تھے۔ قرآن مجید کی تفسیر میں لغت کا کتنا حصہ ہے اس کا اندازہ حضرت مجاہد کے اس قول سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، آپ فرماتے ہیں:

"لا يحل لاحد يومن بالله واليوم الآخر ان يتكلم فى كتاب الله اذ لم يكن عالماً بلغات العرب" [1]

1۔ المزمل:14

2۔ البخاری، محمد بن اسماعیل **الجامع الصحیح** کتاب التفسیر، باب وداً ولا سواعا **(مکتبہ الکبریٰ مصر 2000ء)** 161/6 الرقم 4921

3۔ یوسفی، **تفسیر القرآن کے اصول و قواعد**، 168

4۔ ایضاً 169

(کسی بھی شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتا ہے۔ یہ جائز نہیں کہ وہ قرآن کے متعلق کوئی بات کرے جب تک وہ لغت عرب کو نہیں جانتا)

1۔ قرآن مجید کی تفسیر میں اجتہاد کے لئے لغت عرب سے واقفیت بنیادی شرط ہے۔ سب سے پہلے ان معانی کو استعمال کیا جائے گا جو صحابہ نے مراد لئے ہیں اور ان معانی کی مخالفت نہیں کی جائے گی کیونکہ جب قرآن مجید کا نزول ہو رہا تھا تو سب سے پہلے مخاطب صحابہ ہی تھے اور وہ عرب ہونے کی وجہ سے لغت عربی زبان کے رازو نیاز سے بخوبی واقف تھے۔ اس وجہ سے ان کی توجیہات کو معاجم قوامیس اور آئمہ لغت پر ترجیح دی جائے گی۔

مثال کے طور پر یہ آیت دیکھیے:

﴿إِذۡ يُغَشِّيكُمُ ٱلنُّعَاسَ أَمَنَةٗ مِّنۡهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيۡكُم مِّنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءٗ لِّيُطَهِّرَكُم بِهِۦ وَيُذۡهِبَ عَنكُمۡ رِجۡزَ ٱلشَّيۡطَٰنِ وَلِيَرۡبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمۡ وَيُثَبِّتَ بِهِ ٱلۡأَقۡدَامَ﴾ [2]

(جب امن کی وجہ سے تم پر نیند چھائی ہوئی تھی اور تم پر آسمان سے پانی نازل کیا تاکہ تم کو پاک کر دیں شیطان کی پلیدی سے اور تمہارے دلوں کو مربوط کر دیں اور تم کو ثابت قدمی عطا کر دیں)

اس آیت کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں کہ بعض اہل علم جو بصرہ سے ہیں نے کہا ہے کہ ثابت قدمی صبر سے اور ڈٹ جانے سے مجاز ہے جب کہ تمام صحابہ اور تابعین کے اقوال اس کے خلاف ہیں۔ لہٰذا، یہاں مفہوم اثبات اقدام کا ان معنوں میں ہو گا کہ بارش سے ریت بیٹھ گئی اور چلنا آسان ہو گیا قدم مستحکم ہو گئے:

"ويثبت به الاقدام بتلبيد المطر الرمل حتى ' لا تستوخ فيه اقدامهم وحوافر ادواتهم "3

(یہاں بارش کی وجہ سے قدموں میں استحکام کا مطلب ہو گا کہ ریت بیٹھ گئی۔ اور انہیں اور ان کی سواریوں کو چلنے میں آسانی ہو گئی) [4]

1۔ الزرکشی، ابو عبداللہ بدرالدین، محمد، بن عبداللہ، **البرہان فی علوم القرآن**، (دار الاحیاء الکتب العربیہ البابی الحلبی، 1957ء)، 292/1

2۔ الانفال: 11

3۔ الطبری، **جامع البیان** 68/11

4۔ ایضاً 68/11

گویا، چونکہ صحابہ نے مراد لیا ہے اس لئے کسی اور کی وضاحت کی جانب التفات نہیں کیا جائے گا اس کو اس کے ظاہری معنٰی پر برقرار رکھا جائے گا اور مجازی معنٰی سے احتراز کیا جائے گا۔

2۔ اس سلسلے کا ایک اصول یہ ہے کہ الفاظ کے شاذ معانی کو ترک کیا جائے۔ بعض الفاظ کے کچھ معانی مشہور اور کثرت استعمال میں ہوتے ہیں اور بعض کم اور قلیل استعمال ہوتے ہیں۔ جب لغوی معانی کی روشنی میں تفسیر کی جائے گی تو شاذ معانی کو ترک کیا جائے گا اور معروف معانی مراد لئے جائیں گے مثلاً ﴿لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا﴾ [1] علامہ ابن جریر اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:

"قیل ان البردفی ہذاالموضع النوم ان معنی الکلام لا یذوقون منہا نوماً ولا شراباً" [2]

(بعض علماء نے کلام عرب سے استشہاد کرتے ہوئے برد سے مراد نیند لی ہے۔ تو اس صورت میں اس کا مطلب ہے کہ جہنمی نہ تو وہاں نیند چکھیں گے اور نہ ہی پینے کی کوئی چیز)

مگر برد نیند کے لئے معروف نہیں اس لئے اسے ترک کیا جائے گا اور علامہ ابن جریر فرماتے ہیں" اغلب المعانی علی ظاہر التنزیل " [3] غالب معانی جو ظاہری تنزیل کے مطابق ہیں وہی مراد لیے جائیں گے۔ لہٰذا، اس سے مراد ٹھنڈک ہی ہو گی۔

3۔ اس سلسلہ میں ایک اور احتیاط کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن میں شرعی اصطلاحات کے معنٰی کو لغوی پر مقدم رکھا جائے گا۔ شریعت نے قرآن میں کچھ معانی کو متعین کر دیا ہے لغوی معانی کو استعمال کر کے ان کی مراد کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یہ اس کا عقلی فطور اور نادانستگی ہے۔ مثلاً صوم کا معنٰی امساک ہے اور ڈھال مگر اس کا شرعی معنی روزہ ہے۔ جس کے خاص قواعد ہیں۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں:

"الصیام فی اللغۃ الامساک ترک التنقل من حال الی حال وفی الشرع الامساک عن المفطرات مع اقتران النیۃ من طلوع الفجر الی غروب الشمس" [4]

(لغت میں صوم کا معنٰی رکنا ہے۔ اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ ہونا ہے۔ مگر اس کا شرعی معنٰی روزہ کو افطار کرنے سے احتراز کرنا ہے طلوع فجر سے غروب آفتاب تک۔ تو اس شرعی معنٰی کو لغوی معنٰی سے بدل کر دوسرے معنٰی میں بدلنا یہ غلط ہو گا)

1۔ النباء:24

2۔ الطبری، **جامع البیان** 27/24

3۔ ایضاً 509/21

4۔ الشوکانی، محمد بن علی بن محمد بن عبداللہ، **فتح القدیر** (ناشر دار الکلم الطیب بیروت دمشق، 1957ء) 207/1

4۔ لغوی ظاہری معنیٰ کی تقدیم: الفاظ کئی معانی کا احتمال رکھتے ہیں جو اکثر اوقات ظاہر سے موافقت نہیں رکھتے مگر تفسیر میں ہمیشہ اس معنیٰ کی تقدیم ہوتی ہے جو ظاہر سے موافقت رکھتا ہے۔ فہد بن عبد الرحمٰن لکھتے ہیں:" التفسير يكون بالاغلب الظاہر من اللغة" [1] (تفسیر اکثر لغت کے ظاہری معنیٰ کے مطابق ہوتی ہے)

گویا آیت کا ایک واضح مفہوم ہوتا ہے جس پر معنیٰ کا محمول ہوتا ہے مگر کبھی اسی لفظ کا ایسا معنیٰ ہوتا ہے جو لغت کے اعتبار سے ٹھیک ہوتا ہے مگر آیت پر اس کا محمول ٹھیک نہیں ہوتا ایسی صورت میں آیت کے مفہوم کے مطابق معنیٰ کو مراد لیا جاتا ہے لغوی نہیں لیس كل مايثبت فی اللغة يصح حمل آيات القرآن عليه [2] (جو کچھ لغت سے ثابت ہو اس پر قرآن کو محمول کرنا ٹھیک نہیں۔) یعنی لغت کی وجہ سے قرآن کے مفہوم کو تبدیل نہیں کیا جائے گا۔

5۔ سب متقدمین کا اس پے اجماع ہے کہ عرب نہ تو اہل علم تھے اور نہ ہی اہل کتاب ان کی صرف پہچان یہ تھی کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں جب بھی انہیں کوئی پریشانی یا علمی مسئلہ پیش آتا تو یہ اہل کتاب کی جانب رجوع کرتے:

> " ان العرب لا يكون اہل الكتاب ولا اہل العلم فانما يساءلون اہل الكتاب قبلہم يستفيدونہ منہ وہم اہل الكتاب من اليہود ومن تبع دينہم من النصارىٰ" [3]
>
> (عرب کو جب بھی کوئی مسئلہ پیش آتا تو وہ اس سے متعلق اہل کتاب سے سوال کرتے اور انہیں سے استفادہ کرتے اور وہ یہودی اور یا وہ جنہوں نصاریٰ کی پیروی کی تھی۔
>
> عرب کا علمی مصدر اہل کتاب ہی تھے اور انہیں سے یہ اپنی علمی ضروریات پوری کرتے تھے۔

عادات عرب سے واقفیت:

قرآن مجید میں کچھ ایسی اصطلاحات اور وسوم ورواج ہیں ۔ جن کی وضاحت کے لئے عرب کی زندگی کی ایسی عادات کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ یہ وضاحت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک عرب کی عادات سے واقفیت حاصل نہ کرلی جائے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿مَا جَعَلَ ٱللَّهُ مِنۢ بَحِيرَةٍ وَلَا سَآئِبَةٍ وَلَا

1۔ فہد بن عبدالرحمٰن، **اصول التفسیر ومناہجه**، (الریاض 2016ء) 162

2۔ ایضاً

3۔ الذہبی، محمد حسین **التفسیر والمفسرون (دارالحدیث قاہرہ 2012ء)** 157/1

وَصِيلَة وَلَا حَام﴾ [1] (اللہ تعالیٰ نے بحیرہ، سائبہ، وسیلہ اور کوئی حام نہیں بنایا۔) یہ اصطلاحات جب تک آپ عرب سے پوچھیں اور پڑھیں گے نہیں اسے سمجھنا ممکن نہیں کیونکہ یہ اصطلاحات عرب نے خود وضع کی تھیں اس لئے اسے واضح بھی عرب ہی کر سکتے ہیں۔

مثلاً ان میں سے ایک بحیرۃ کی وضاحت یوں کی جاتی ہے:

بحیرة "ھی ابنة سائبہ والسائمہ ہی الناقة اذتابعت بین عشراناث لیس بینہن ذکر لم یرکب ظہرہا ولم یتخذ برہا ولم یشرب لبنہا الالضیف"[2]

(یہ ایسی اونٹنی کی بچی ہے جس نے مسلسل دس مرتبہ مونث کو جنم دیا ہو اس دوران ایک مرتبہ بھی مذکر نہ جنا ہو اب دسویں مرتبہ جنم لینے والی اونٹنی بحیرہ کہلائے گی۔ اس پر نہ تو سواری کی جاسکتی ہے نہ ہی نہ اس کی اون کو استعمال کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کا دودھ استعمال کیا جاسکتا ہے)

ایسی جتنی بھی اصطلاحات قرآن مجید میں استعمال ہوئی ہیں اب ان کو جاننے کے لئے عرب کی وضع کی گئی اصطلاحات کو جاننا ضروری ہے۔ اسی طرح عرب کی کچھ ایسی عادات تھیں جن کی وضاحت بھی سوائے عرب کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے﴿ وَلَيْسَ ٱلْبِرُّ بِأَن تَأْتُواْ ٱلْبُيُوتَ مِن ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ ٱلْبِرَّ مَنِ ٱتَّقَىٰ﴾[3] نیکی اس میں نہیں کہ تم اپنے گھروں کو چھتوں سے آؤ۔ بلکہ نیکی تقویٰ میں ہے۔)

اس آیت مقدسہ میں ایک ایسے اصول کی وضاحت کی گئی ہے کہ عرب جب احرام باندھ لیتے تو اگر کسی کو گھر آنے کی ضرورت پیش آتی تو اگر وہ احمسی (مکے کا رہائشی) نہ ہوتا تو اسے دروازے سے آنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ چھت یا دیوار کو پھاڑ کر آتا اس کی وضاحت میں مفسرین فرماتے ہیں:

"کان ا لناس فی ا لجاہلیة واول الاسلام اذا حرم الرجل منھم لم یدخل حائطاً ولا داراً الا فسطاطاًمن بابہ"[4]

(زمانہ جہالت اور آغاز اسلام میں جب بھی کوئی شخص احرام پہن لیتا تو اسے گھر دروازے اور کھڑکی سے گزرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی)

1۔ المائدہ:103

2۔ القرطبی ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری۔ **الجامع لاحکام القرآن**(دارالکتب مصریہ قاہرہ،1964ء) 336/6

3۔ البقرۃ:189

4۔ الخازن، علاؤالدین علی بن محمد بن ابراہیم ، **الباب التاویل ومعانی التنزیل**، (دار لکتب العلمیہ بیروت 1993ء) 120/1

اور دروازے اور راستوں سے آنے کی اجازت صرف خاص قبائل کے لوگوں کو ہوتی تھی۔ جو یہ تھے:

"قریش خزاعہ کنانہ ومن دان بدینہم سمو حمساً لتشددہم فی دینہم ولحماسۃ والشدۃ کانو اذا احرموا لم یدخلوا البیت البتۃ"[1]

قریش، خزاعہ اور کنانہ جو ان کے دین کو جانتے تھے۔ ان کو وہ حمس کا نام دیتے تھے اپنے دین میں پختگی اور شدت کی وجہ سے ان کے علاوہ احرام کی حالت میں گھروں میں کوئی بھی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ تفسیر کے جاننے میں اہم کردار عرب کی روایات اور رسم ورواج کا بھی ہے۔

اسرائیلیات اور تفسیر قرآن:

عمومی طور پر اسرائیل کا لفظ یہود کے لئے بولا جاتا ہے [2]

مگر حقیقت میں اس سے مراد صرف یہودی نہیں بلکہ یہودی اور نصرانی دونوں ہیں۔ اسرئیلیات سے مراد وہ روایات ہیں جو یہودی اور نصرانیوں دونوں سے حاصل کئے گئے ہیں۔

صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق، نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

((قال ابو ہریرۃ عن النبی ﷺ لا تصدقو ا ہل الکتاب ولا تکذبوہم وقولوا آمنا باالله وما انزل الینا)) [3]

(اہل کتاب کی تصدیق اور تکذیب نہ کرو بلکہ کہو میں اس پر ایمان لایا جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر نازل کیا)

سوال یہ پیدا ہوتا کہ ان کی ضرورت کیوں پیش آئی اس کی دو وجوہات ہیں۔ عرب کی کم علمی اور الہامی کتب کا نہ ہونا اور سبب دونوں کتابوں کے مفاہیم کا مشترک ہونا۔ سب سے پہلی بات اسرائیلیات صرف ان افراد سے لی جاتی تھیں جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہو چکے تھے جیسے عبد اللہ بن سلام، کعب بن احبار وغیرہم۔ علامہ ذہبی کے بقول:

"النفرالذین دخلوا فی الاسلام وحملو ا الی اہلہ ومعہم منالثقافۃ فالقوا الیہم فاالقو ا من اخبارہم القصص الدینی" [4]

1۔ الخازن، **الباب التاویل ومعانی التنزیل**، 1/120

2۔ طاہر محمود یعقوب، **اسباب الخطا فی التفسیر**(دار ابن جوزی الدمام 1993ء) 1/280

3۔ البخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الشہادات، باب لا یساءل اہل الشرک عن الشہادۃ ن وغیرہا 3/181

4۔ الذہبی، **التفسیر والمفسرون** 1/148

(وہ لوگ جو اہل کتاب میں سے اسلام میں داخل ہوئے تو وہ اپنے اہل عیال کے ساتھ اپنی ثقافت بھی لے آئے اوراس کے ساتھ اپنے خبریں اور قصے بھی لے کر آئے)

اس کی بہت سی امثلہ ملتی ہیں جب کبھی یہ لوگ مل کر بیٹھتے تو مختلف موضوعات پر ان کی بات ہوتی اور اپنے دلائل بھی دیتے اور ایک دوسرے کی باتوں سے رجوع بھی کر لیتے ایک مرتبہ کعب احبار اور ابو ہریرہ کے درمیان جمعہ کی قبولیت کی گھڑی سے متعلق بات ہوئی کعب احبار کہتے ہیں:

" انہا موجودة فی الجمعة لکن فی جمعتواحدة فی سنة قالہ لابی ہریرة فردعلیہ فرجع الیہ" [1]

(حضرت کعب احبار فرماتے کہ جمعہ میں قبولیت کی گھڑی سال میں کسی ایک جمعہ میں ہی آتی ہے۔ مگر حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ یہ ہر جمعہ میں ہوتی ہے۔ جس سے کعب احبار نے رجوع کر لیا)

تاہم اہل کتاب کی رائے یا وضاحت کو صرف اس صورت میں ہی تسلیم کیا جاتا تھا جب تک وہ قرآن وحدیث کے مخالف نہ ہو جس کی مثال یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس سے کعب احبار نے رجوع کر لیا تھا۔

اسرائیلیات کی ایک قسم جو شریعت اور قرآن وسنت سے ٹکراتی نہیں ہے بلکہ اس سے مطابقت رکھتی ہے اس کے بارے کہا گیا ہے:

" موافق لما فی شریعتنا من الکتاب والسنة فہو صحیح بذالقسم انما یذکر استشہاداً لا اعتقاداً" [2]

(جو ہماری شریعت اور کتاب وسنت سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہ صحیح قسم ہے یہ بطور استشہاد تو پیش کی جاسکتی ہے۔ مگر بطور عقیدہ نہیں)

یعنی یہ بطور دلیل موئید ہو سکتی ہے مگر بطور عقیدہ نہیں۔ مثلاً حضرت عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے ایک مرتبہ موسیٰ علیہ السلام ایک مجلس میں تھے ان سے ایک شخص نے سوال کیا:

"اتعلم احداً اعلم منک فقال موسیٰ لا فاوحیٰ اللہ الیٰ موسیٰ علیٰ عبدنا خضر [3]

(اے موسیٰ کوئی آپ سے بھی زیادہ علم والا ہے تو موسیٰ نے فرمایا نہیں تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا ہاں وہ ہمارا بندہ خضر ہے)

1۔ العسقلانی ،احمد بن علی بن حجر ، الشافعی ا **لفتح الباری ، شرح لبخاری** (دارالمعرفة البیروت 1957ء) ، 417/2

2۔ ڈاکٹر طاہر محمود ،**اسباب الخطافی التفسیر** ، 162/1

3۔ البخاری الجامع **الصحیح** ،بَابُ مَا ذُكِرَ فِي ذَهَابِ مُوسَى صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي البَحْرِ إِلَى الخَضِرِ 26/1

یہ حدیث ابی ابن کعب سے بھی مروی ہے اور وہ خود نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں جب کہ بنی اسرائیل بھی اس ساتھی سے خضر علیہ السلام ہی مراد لیتے ہیں۔ مگر اس میں ایک خاص بات جس کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ کہ اس میں اعتماد ہمیں اپنے ہی مصدر پر ہو گا، نا کہ اسرائیلی مصدر پر۔ جیسا کہ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

"فاما شہد لہ شرعنا بالصدق فلا حاجۃ بنا الیہ استغنا ء بما عندنا "[1]

اگر اسرائیلیات ہماری شریعت کی تائید کرتی ہے تو ہمیں اپنی شریعت سے استغنا نہیں برتنا چاہیئے بلکہ ہمارا اعتماد ہمارے اپنے مصادر پر ہی ہو گا۔

اسرائلیات کی دوسری قسم وہ ہے جو شریعت کے خلاف ہے، وہ تو رد کر دی جائے گی، مثال کے طور پر ایسی روایات جو انبیائے کرام کی شان اور اعلیٰ کردار کے برعکس، ان کے ساتھ منسوب واقعات پر مشتمل ہوتی ہیں:

"مخالف لما فی شریعتنا فہو مردود ،غیر مقبول "[2]

(جو ہماری شریعت میں نہیں وہ مردود اور غیر مقبول ہے)

ظاہر بات ہے کہ یہ اسلامی اصولوں میں سے ہے۔ کہ انبیاء کی عصمت کو پیش نظر رکھنا اور ان کو سفہاء کے عمل سے برتر خیال کرنا ان سے فواحش کو بعید جاننا جبکہ بنی اسرئیل ان پر عجیب عجیب الزامات لگاتے ہیں۔ [3]

اسرائیلیات پر اس ساری بحث میں جو بات واضح ہوئی وہ یہ ہے کہ اسرئیلیات صرف ان افراد سے لی جاتی ہیں۔ جو اہل کتاب سے مسلمان ہوئے ہیں ان سے یہ روایات صرف ہم تائید کے لئے لیں گے اثبات کے لئے نہیں اسی لئے احکام اور عقائد میں ان دلائل اور روایت سے استدلال نہیں ہو گا۔ ہماری شریعت سے اتفاق کی وجہ سے اپنایا جائے گا اور مخالفت کی وجہ سے رد کیا جائے گا۔ اور گر ان کا شریعت سے تعلق نہیں تو اسے رد کیا جائے گا۔

الغرض، تفسیر بالماثور وہ تفسیر ہو گی جو قرآن، حدیث، اقوال صحابہ اور اقوال تابعین کی روشنی میں کی جائے اور حسب ضرورت، جس میں لغت عرب، رسوم وعادات عرب اور اسرائیلیات سے استفادہ اس صورت میں کیا جائے کہ وہ قرآن وسنت کی بنیادی اصولوں سے انحراف پر مبنی نہ ہو۔

---

1 ۔ ابن کثیر، ابو الفدا اسماعیل بن عمر ، **البدایہ والنہایہ**(ء مکتبہ دار الہجر للطباعۃ النشر والتوزیع والاعلان ، 1997ء) 8/1

2۔ڈاکٹر طاہر محمود ، **اسباب الخطاء فی التفسیر** 162/1

3: ایضاً، 163

تفسیر بالماثور کا ارتقاء:

قرآن مجید میں بہت سے احکام ایسے ہیں جن کی تفصیل قرآن مجید میں نہیں، اگر ہے تو واضح نہیں، جس سے مقصد اور منشاء الٰہی کو جاننا انتہائی مشکل ہے۔ اور سنت نبویہ سے ہی اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ عبد الرحمٰن سلمی روایت فرماتے ہیں۔

" حدثنا ۔الذین کانو یقرؤننا انہم لیقرؤن من النبی ﷺ فکانو اذا تعلموا عشر آیات لم یجاوزن حتیٰ یعلم بما فیہا من العمل فتعلمنا القرآن و العمل جمیعا" [1]

(صحابہ کرام فرماتے ہیں۔ جب ہم نبی ﷺ سے قرآن پڑھتے تو دس آیات پڑھتے اس سے آگے نہ بڑھتے حتیٰ کہ اس سے متعلق علم اور عمل دونوں سیکھتے۔)

نبی کریم ﷺ ہر مشکل اور مبہم کلمہ اور حکم کی وضاحت فرماتے علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

" فا لسنۃ النبویہ شارحۃ للقرآن مبینۃ للمجملۃمقیدۃ للمطلقۃ مخصصۃ للعامۃ موضحۃللمبہمۃ شارحۃ للقرآن مفسرۃ للمشکلۃمفصلۃ للمختصرۃ [2]

(پس سنت نبویہ قرآن کی تشریح کرتی ہے۔ مجمل کو واضح کرتی ہے۔ مطلق کو مقید کرتی ہے، عام کو خاص کرتی ہے، مبہم کو واضح کرتی ہے، مشکل کی تفسیر اور مختصر کی تفصیل کرتی ہے)

اسی بنیاد پر، صحابہ کرام سے بھی مروی ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ سے قرآن مجید کی تفسیر سیکھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ مختلف انداز میں قرآن مجید کی تفسیر کرتے کبھی خود وضاحت کرتے، کبھی صحابہ کرام سوال کرتے حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں نبی رحمت ﷺ فرمایا یوم یقوم الناس لرب العالمین تو اس کے جواب میں خود فرمایا لوگ نصف کان تک پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ قرآن مجید کے نزول میں بہت سے احکامات تھے مگر ان کی تفصیل نماز کی رکعات ادائیگی کا طریقہ زکوٰۃ کی مقدار اور مدت روزے میں خیط ابیض اور اسود کی وضاحت جیسے کتنے اور مقامات تھے جو تفصیل طلب تھے جن کی نبی رحمت ﷺ نے وضاحت فرمائی۔

گویا، نبی رحمت ﷺ کی حیات طیبہ میں صحابہ کرام کے پاس قرآن فہمی کا سب سے بڑا ذریعہ نبی رحمت ﷺ کی ذات طیبہ ہی تھی جو اپنے صحابہ کی سب تفسیری ضروریات پوری فرماتے تھے۔ مگر آپ ﷺ کے وصال کے بعد بھی صحابہ کرام کو تفسیر کی ضرورت تھی اور نبی رحمت ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کی تربیت اس انداز میں کی تھی کہ وہ قرآن

1۔ الطبری، **جامع البیان** 74/1

2۔ الدکتور طاہر محمد یعقوب، **اسباب الخطا فی التفسیر** 55/1

مجید کی تفسیر خود کر سکتے تھے اسی وجہ سے صحابہ کرام میں کچھ صحابہ مفسر قرآن کے نام سے موسوم تھے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں" نعم ترجمان القرآن ابن عباس " [1] (سب سے اچھا قرآن مجید کا مفسر عبد اللہ بن عباس ہے۔)

یہ مقام عبد اللہ بن عباس کو کیوں دیا جاتا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے ان کے لئے دعا کی حضرت عبد اللہ ابن عباس فرماتے ہیں

((دعانی رسول اللہ ﷺ فمسح علیٰ ناصیتی وقال اللہم علمہ الحکمۃ وتاویل الکتاب))[2]

حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں نبی رحمت ﷺ نے مجھے بلایا اور میری پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور کہا اے اللہ عبد اللہ بن عباس کو حکمت اور قرآن مجید کی تفسیر سکھا دے۔

اس دعا سے یہ وضاحت بھی ہوتی ہے حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں:

" کنت لا ادری فاطر السمٰوات والارض حتیٰ جاءاعرابیا ن یختصمان فی البئر فقال احدہما انا فطرتہا ، یقول ابتداءہا "3

(حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں میں لفظ فاطر کا مطلب نہیں جانتا تھا یہاں تک کہ دو اعرابی میرے پاس لڑتے ہوئے آئے اور ان میں سے ایک کہنے لگا میں نے اس کنویں کو ابتدا میں کھودا تھا)

جہاں تک صحابہ کرام سے تفسیری روایات لینے کی بات ہے تو دس صحابہ مشہور مفسرین ہیں جو اس فن میں مہارت رکھتے تھے: "عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن مسعود، علی بن ابی طالب، ابی ابن کعب، ابو بکر صدیق، عمر بن خطاب، عثمان بن عفان، زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری اور عبد اللہ بن زبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں"[4]

ان دس صحابہ میں چار صحابہ تفسیری میدان میں ید طولیٰ رکھتے تھے جن میں "سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، اور ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ ہیں۔"[5] ان چاروں صحابہ میں سب سے زیادہ تفسیری مرویات سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ہیں۔ اور ان چاروں صحابہ میں سے تین نے اپنے تفسیری مدارس بھی قائم کئے سوائے سیدنا علی المرتضیٰ کے ان سے اگرچہ سب سے زیادہ تفسیری روایات ہیں ۔باقی تین خلفاء کو ملا کر اتنی روایات نہیں جتنی تنہا سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ:

"تفرغہ عن مہام الخلافۃ مدۃ ابی بکر وعمر وعثمان رضوان اللہ عنہم وتاخر وفاتہ" [6]

1۔ الزہری محمد ابن سعد بن منیع ، **الطبقات الکبیر** (مکتبہ الخانجی ، قاہرہ 2001ء)/ 315

2۔ ابن سعد ، **طبقات2** / 315

3۔ السیوطی ، جلال الدین ، **الاتقان فی علوم القرآن** ، (موسسۃ الرسالۃ بیروت لبنان 2008ء)239/4

4۔ ایضاً، 232/4

5۔ فہد بن عبد الرحمٰن **بحوث فی اصول التفسیر و مناہجہ**، 26

6: ایضاً 26

(آپ کو خلافت کی ذمہ داریوں سے فرصت ملی جب کہ باقی تینوں خلفائے راشدین امور خلافت میں مصروف رہے اور آپ کی وفات بھی سب سے آخر میں ہوئی)

تاریخ اسلام سے واقف ہر آدمی اس بات سے واقف ہے تفسیری میدان میں حضرت عبد اللہ بن عباس کا ایک خاص مقام ہے۔ یہاں تک کہ صحابہ کرام بھی آپ کی اس صلاحیت کے معترف تھے۔ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ آپ کی تعریف میں فرماتے ہیں کانما ینظر الیٰ الغیب من ستر رقیق [1] گویا کہ آپ تفسیری معاملات کو باریک پردے کے پیچھے سے دیکھ رہے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباس نے مکہ میں اپنا ایک مکتب قائم کیا تھا جہاں اپنے تلامذہ کو تفسیر پڑھاتے تھے:

۔ "قامت مدرسۃ بمکۃ علیٰ عبداللہ بن عباس فکان یجلس لاصحابہ من التابعین تفسیر لہم کتاب اللہ ویوضح لہم ما اشکل من معانیہ وکا ن تلامیذہ یروون عنہ ما یقول ویروون لمن بعدہم ما سمعوہ منہ" 2

(حضرت عبد اللہ بن عباس نے مکہ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں وہ اپنے تابعین تلامذہ کے ساتھ بیٹھتے تھے ان کو کتاب اللہ کی تفسیر سکھاتے تھے اور مشکل معانی کی تعلیم دیتے تھے اور آپ کے تلامذہ آپ سے روایت کرتے اور آپ کے بعد یہ روایات بعد والے لوگوں کو سناتے تھے)

حضرت عبد اللہ بن عباس کے بعد عبد اللہ بن مسعود ہیں جن کا تفسیر میں بڑا مقام ہے۔ کیونکہ آپ کو نبی رحمت ﷺ سے بہت قرب رہا ہے۔ آپ سفر وحضر میں آپ ﷺ کے ساتھی تھے:

"کان صاحب طہورہ و سواکہ ونعلہ و یمشی امامہ اذاً و یسترہ اذا اغتسل ویوقظہ اذانام وقراء القرآن علیٰ رسول اللہ ﷺ حتیٰ فاضت عیناہ "3

(آپ ﷺ کے لئے وضو کا پانی لاتے مسواک لاتے آپ ﷺ کے نعلین کی حفاظت کرتے ہر معاملہ میں پیش پیش رہتے۔ اور آپ ﷺ کے لئے پردہ کا اہتمام کرتے جب آپ ﷺ غسل فرماتے اورآپ ﷺ کو نیند سے بیدار کرتے، نبی رحمت ﷺ کو قرآن مجید کی تلاوت سناتے حتیٰ کہ آپ ﷺ کی آنکھیں بہہ پڑھتیں)

حضرت ابی ابن کعب انصار کے خزرج قبیلہ سے تھے۔ یہ اصحاب بدر اور بیعت عقبہ میں شامل تھے۔ مدینہ میں یہ پہلے شخص تھے جنہوں نبی رحمت ﷺ کے لئے کتابت کی نبی رحمت ﷺ نے فرمایا۔

1۔ الاندلسی، شہاب الدین احمد بن محمد المعروف ابن عبدربہ، **العقدالفرید** الذہبی دار الکتب العمیہ بیروت1982، 206/2،

2: الذہبی، **التفسیر والمفسرون** ۔ 93/1

3: العسکری ابوھلال الحسن بن عبداللہ **الاوائل للعسکری** المکتبہ دار البشیر الطنطا1986، 213

((اقرؤبم لكتاب الله ابی بن کعب [1] (اے ابی ان کو اللہ تعالیٰ کی کتاب پڑھاؤ) (یہ حدیث امام ترمذی کے نزدیک حسن اور صحیح ہے) آپ کا علمی مقام اتنا بلند تھا کہ نبی رحمت ﷺ نے فرمایا ((ان الله امرنی ان اقراء علیک لم یکن الذین کفروا قال سمانی لک قال نعم فبکیٰ(إسناده صحیح علی شرط الشیخین))[2] (بے شک اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ آپ کے لئے یہ سورۃ البینہ پڑھوں آپ نے عرض کی اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا ہے فرمایا ہاں تو آپ رونے لگے۔"

اس واقعے سے آپ کا مقام جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہے، اس کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ آپ کا تعلق ایک یہودی قبیلہ سے تھا اور آپ ان کے مذہبی راہنماء اور اور عالم تھے تو آپ آسمانی کتابوں کے علوم سے واقف تھے۔

مدینہ میں بہت سے صحابہ تھے جن سے تفسیر سیکھنے کے لیے لوگ رجوع کرتے تھے مگر جس قدر شہرت اور مقام آپ کو حاصل ہوا وہ اور کسی کے حصہ میں نہیں آیا مدینہ میں تفسیری مکتب کا قیام آپ ہی کا عظیم کارنامہ ہے:

"فقامت بالمدینۃ مدرسۃ للتفسیر تتلمذ فیہا کثیر من التابعین لمشاہیر المفسرین من الصحابۃ ونستطیع ان نقول ان قیام ہذہ المدرسۃ کان علیٰ ابی ابن کعب" 3

(آپ نے مدینہ میں تفسیر پڑھانے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں بہت مشہور صحابہ تابعین مفسرین نے شرف تلمذ کیا ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ اس مدرسہ کی بنیاد ابی ابن کعب نے ہی رکھی)

مدینہ منورہ میں مدرسہ کی بنیاد ابی ابن کعب نے ہی رکھی اور تفسیر پر کام مدینہ میں زیادہ ابی ابن کعب نے ہی کیا۔ جو مستقبل میں مدینہ کی سرزمین پر عظیم مفسرین بنے ان میں اکثریت آپ کے تلامذہ کی تھی۔ وہ مشہور مفسرین جنہوں نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ اور آپ کی تفسیری مرویات اور ملفوظات کو جمع کیا اور امت کے لئے عظیم علمی اور تفسیری ذخیرہ چھوڑا ان میں زیادہ شہرت ان افراد کو ملی:

ابولعالیہ الریاحی ، زید بن اسلم ، مُحَمَّد بن کعب قرظی ، طفیل بن کعب قرظی [4]

1۔ الترمذی ، محمد بن عیسیٰ بن سورہ **الجامع الترمذی** (مکتبہ مصطفیٰ البابی الحلبی 1975ء)5/665۔ح3791

2۔ احمد بن حنبل ، **مسند احمد بن حنبل**(مؤسسۃ الرسالۃ بیروت2001ء)21/357،ح13883

3:الذہبی **التفسیروالمفسرون** 1/104

4۔فہد بن عبدالرحمٰن ، **بحوث فی اصول التفسیر و منابجہ**،34

تاریخ تفسیر میں تفسیر بالماثور دور تابعین تک ہی شمار کی جاتی ہے دور نبوی ﷺ میں نبی رحمت ﷺ خود تفسیر ی وضاحتیں فرماتے تھے دور صحابہ میں تفسیری مصادر بنے اوراقوال صحابہ بھی تفسیر بالماثور میں شامل ہیں۔ پھر صحابہ نے علمی تفسیری حلقے اور مراکز قائم کئے جس میں لوگ تفسیر کا علم حاصل کرتے اور صحابہ نے اس علم پر خاص توجہ دی پھر ان کے شاگرد تابعین نے اسے مزید وسعت دی اور یہ علمی ذخیرہ محفوظ ہو گیا۔

دور صحابہ کے بعد دور تابعین آتا ہے جس میں تفسیری میدان میں بہت ترقی ہوئی اور قرآن مجید کی مکمل تفسیر ہوئی۔جب کہ اس سے قبل مکمل تفسیر منصہء شہود پر نہیں آئی تھی ۔ تابعی کی تعریف میں ابن قیم فرماتے ہیں: من صحب الصحابي [1] (تابعی اسے کہتے ہیں جسے صحابی کی صحبت ملی ہو۔)

دور تابعین میں تفسیر کی ضرورت دور نبوی ﷺ اور دور صحابہ سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ دور تابعین میں اسلامی فتوحات خطہ عرب سے نکل کر عجم میں پہنچ چکی تھیں۔پہلے دونوں ادوار،دور نبوی اور صحابہ میں صرف وہی آیات ہی وضاحت طلب تھیں جن کی مراد ظاہر نہیں تھی۔صحابہ کرام چونکہ خود عرب تھے اس لئے بہت سی آیات قرآنی کے مفہوم کو از خود جانتے تھے۔اس لئے ایسی واضح آیات کی تفسیر کی ان کو ضرورت نہیں تھی مگر جب اسلام خطہ عرب سے نکل کر عجم میں پہنچا۔تو اب ہر ایک آیت کی تفسیر کی ضرورت پیش آئی علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

"لاتساع الفتوحات الاسلامیہ ودخول کثیر من العجم فی الاسلام زادت الحاجۃ الیٰ تفسیر کثیر من الآیات التی لم یتناولھا الصحابۃ رضی اللہ عنہم لظہورمعنہا عندہم فزادا لتابعون تفسیر مااحتاج الناس الیٰ التفسیر فاتقو ا التفسیر وشمل القرآن "[2]

(فتوحات اسلامیہ کی وسعت کی وجہ سے کثیر عجمی علاقے اسلام میں داخل ہوئے ۔تو بہت سی ان آیات کی تفسیر کی ضرورت بھی پیش آئی جن کو صحابہ نے معنیٰ ظاہر ہونے کی وجہ سے تفسیر میں شامل نہیں کیا تھا۔پس تابعین آگے بڑھے اور تفسیر کی اس ضرورت کو پورا کیا پس اس طرح پورے قرآن پر مشتمل تفسیر مکمل ہوئی)

1۔ الشہزوری ،ابوعمر عثمان بن عبدالرحمٰن ، ابن الصلاح ، **علوم الحدیث لابن الصلاح** (دارالفکر المعاصر البیروت ،لبنان ،1886ء)302/2

2۔الرومی فہد بن عبدالرحمٰن بن سلیمانی ، **اصول التفسیر و منابجہ** (مکتبہ الملک الفہد الوطنیہ 2017ء)42

دور تابعین میں اگرچہ تفسیری ضرورت بہت بڑھ گئی تھی مگر باقاعدہ طور پے الگ سے تفسیری کتب وجود میں نہیں آئی تھیں۔ بلکہ تفسیر سے متعلقہ اقوال مختلف کتب آحادیث میں ابواب کی صورت میں موجود تھے محمد بن لطیفی لکھتے ہیں :

"وما زال التفسير يتضخم فى عهدهم حتىٰ اجتمع منه الشئ كثير لكن هذه الاقوال فى التفسير لم تكن مجموعة ولا مرتبة بشكل منظم وفق الترتيب المصحف بل كانت نروى منثورة تفسير الآيات متفرقة بين الروايات لا علاقة لها بالتفسير اى ان التفسير كا ن مختلطاً بالحديث غير المميز عنه" [1]

(مسلسل تفسیر میں ضخامت کی وجہ سے اس میں بہت سی چیزوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ مگر ان تفسیری اقوال کا مجموعہ کسی بھی منظم اور مرتب شکل میں قرآن کی ترتیب کی صورت میں موجود نہیں تھا بلکہ یہ مختلف تفسیری روایات کی صورت میں منتشر تھا جس کا تفسیر سے تعلق نہیں تھا بلکہ تفسیر حدیث سے ملی ہوئی تھی حدیث سے الگ نہیں تھی)

علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

تبداء مرحلة الثانيه للتفسير من عصر التابعين الذين تلمذوا للصحابة فتلقوا غالب معلوماتهم عنهم [2]

(دوسرے مرحلہ کا آغاز دور تابعین سے ہوتاہے جنہوں صحابہ سے ہی تلمذ کیا تھا۔ اور معلومات کا زیادہ حصہ انہیں سے حاصل کیا تھا)

ایک بہت بڑی تعداد تابعین کی تھی جنہوں نے تفسیر القرآن کی ذمہ داری کا بیڑا اٹھایا جس طرح صحابہ کی تعداد تو بہت زیادہ ہے مگر مفسر صحابہ کی تعداد کم ہے ایسے ہی تابعین کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے مگر ان میں مفسر تابعین کم ہیں اور ان میں چند مشہور مفسر تابعین درج ذیل ہیں:

"سعيد ابن جبير ،مجاہد ابن جبر ،عکرمہ مولیٰ ابن عباس ، طاوس بن کیسان ، عطابن ابی رباح ، حسن بصری ، ضحاک بن مزاحم الہلالی ،ابو العالیہ ، رفیع بن مہران ،قتادۃ بن دعامہ سدوسی ، عطیہ بن سعد العوفی ،زید بن اسلم ، ربیع بن انس ، مرہ بن شراجیل الہمدانی ، عامر بن شراجیل الشعبی ، مُحَمَّد بن کعب قرظی ، علقمہ بن قیس النخعی ،مسروق بن اجداع الہمدانی ،سدی ،اسماعیل بن عبدالرحمٰن۔" [3]

دور تابعین تک کے دور کو ہی تفسیر بالماثور کے دور کو شمار کیا جاتا ہے اور اس دور تک جو اصول مفسرین نے مرتب کر دیئے تھے وہی تفسیر بالماثور کے لیے ضروری قرار پائے۔ دور صحابہ میں تین تفسیری مدارس وجود میں آچکے تھے جو تین

1۔محمد بن لطیفی ، **لمحات فی علوم القرآن واتجاہات لتفسیر**(المکتب الاسلامی بیروت 1990ء) 208

2۔الذہبی ،**التفسیر والمفسرون** ، 91/1

3۔فیصل احمد ندوی **تفسیر واصول التفسیر تعارف،ضرورت واہم کتب**(مکتبہ شباب العلمیہ لکھنو2016ء) 36

جلیل القدر صحابہ نے قائم کیئے تھے۔عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر اور ابی ابن کعب ان تینوں مفسرین کے اپنے اپنے مکاتب میں اثرات بھی بہت گہرے تھے۔

فصل دوم:

تفسیر اشاری کا ارتقاء اور قبولیت کی شرائط

تفسیر بالرائے کی ایک قسم تفسیر اشاری ہے، علامہ زرقانی نے اشاری تفسیر کے بارے لکھا ہے کہ:

"هو تأويل القرآن بغير ظاهره لإشارة خفية تظهر لأرباب السلوك والتصوف ويمكن الجمع بينها وبين الظاهر" 1

(قرآن مجید کے ظاہر کے علاوہ ایسی تاویل جو کسی مخفی اشارہ کی وجہ سے ہو جو صرف ارباب سلوک و تصوف پر ہی ظاہر ہوتی ہے لیکن اس میں شرط ہوتی ہے کہ اس کو قرآن کے ظاہر سے تطبیق دینا ممکن ہوتا ہے)

علماء کے بقول تفسیر اشاری مجاہدہ نفس اور تصفیہ قلب پر مشتمل ہوتی ہے جو صرف اہل تصوف و سلوک پر ہی منکشف ہوتی ہے۔ آیات قرآنی کے معانی صرف علمی مباحث نہیں ہوتے بلکہ یہ مخفی اشارات ہوتے ہیں جو صوفیا پر منکشف ہوتے ہیں مگر یہ قرآن مجید کے ظاہر سے متصادم نہیں ہوتے بلکہ ان کے درمیان تطبیق ممکن ہوتی ہے۔ علامہ ذہبی فرماتے ہیں:

"انما ہی معانی الاسرارا لقرآنیہ فیہ تنقدح فی القلب المومن التقی الصالح العالم فہو اما ان یبقیہا بینہ وبین ربہ تبارک وتعالیٰ" [2]

(یہ معانی قرآنی اسرار ہیں جو مومن متقی صالح اور عالم کے دل میں منکشف ہوتے ہیں۔ جو کہ بندے اور اس کے رب کے درمیان باقی رہتے ہیں)

صوفیاء کی تفسیری روایت تفسیر اشاری کے ذیل میں آتی ہے چونکہ صوفیاء کی بھی دو اقسام ہیں۔ ایک نظری اور فلسفی اور دوسرے زاہد اور متقی۔ اس اعتبار سے تفسیر کی بھی دو اقسام ہیں تفسیر اشاری نظری اور تفسیر اشاری فیضی۔ تفسیر اشاری نظری فلسفیانہ نظریات و مباحث پر مشتمل ہوتی ہے اور تفسیر فیضی تزکیہ نفس اور قلبی منکشفات پر مبنی ہے۔ اس لیے علامہ ذہبی فرماتے ہیں:

1۔ الزرقانی، محمد عبدالعظیم، **مناہل العرفان فی علوم القرآن**، (دارالکتب العربیۃ بیروت(س۔ن)، 2/78

2۔ الدکتور طاہر محمود یعقوب، **اسباب الخطاء فی التفسیر**، (دار ابن جوزیہ، الدمام سعودی عریبیہ 1993ء)، 1/743

"من بنی تصوفہ علیٰ مبا حث نظریۃ، تعالیم فلسفیۃ فکان من البدیہی ان ینظر ھولاء المتصوفہ الیٰ القرآن نظرۃ تتمشیٰ مع نظریاتھم ، متفق تعالیمھم"[1]

(جنہوں نے اپنے تصوف کی بنیاد نظری مباحث اور فلسفی تعلیمات پر رکھی یہ ایک فطری بات تھی کہ وہ سب صوفیاء قرآن مجید سے اپنے نظریات سے متفق معلومات کو تلاش کرتے ہیں)

تفسیر اشاری نظری فلسفی میں مفسر اپنی فکر کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ ایسی تفسیر ہے جو مفسر کے ذہن میں پہلے آتی ہے بعد میں وہ اپنے نظریات کی تائید قرآن مجید سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

علامہ ذہبی کے بقول:

"ان التفسیر الصوفی النظری یبنی علیٰ مقدمات العلمیہ تنقدح فی ذہن الصوفی اولا ثم ینزل القرآن علیہا بعد ذالک "[2]

(تفسیر صوفی نظری ایسے علمی مقدمات پر مشتمل ہوتی ہے جو پہلے صوفی کے ذہن میں آتے ہیں بعد میں وہ انہیں قرآن مجید پر پیش کرتا ہے)

تفسیر اشاری نظری ایسی تفسیر ہے جو فکری اور فلسفی نظریات پر مبنی ہوتی ہے جو صرف بحث وتبحیث اور علمی مقدمات تک محدود ہے اس کی مثال تفسیر ابن عربی سے سورہ البقرہ کی ذیل کی آیت کے حوالے سے ذکر کی جاتی ہے:

﴿وَلَقَدۡ ءَاتَيۡنَا مُوسَى ٱلۡكِتَٰبَ وَقَفَّيۡنَا مِنۢ بَعۡدِهِۦ بِٱلرُّسُلِۖ وَءَاتَيۡنَا عِيسَى ٱبۡنَ مَرۡيَمَ ٱلۡبَيِّنَٰتِ وَأَيَّدۡنَٰهُ بِرُوحِ ٱلۡقُدُسِۗ أَفَكُلَّمَا جَآءَكُمۡ رَسُولُۢ بِمَا لَا تَهۡوَىٰٓ أَنفُسُكُمُ ٱسۡتَكۡبَرۡتُمۡ فَفَرِيقٗا كَذَّبۡتُمۡ وَفَرِيقٗا تَقۡتُلُونَ ﴾[3]

(اور ہم نے عطا فرمائی موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور ہم نے پے در پے ان کے پیچھے پیغمبر بھیجے اور دیں ہم نے عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں اور ہم نے تقویت دی انہیں جبرائیل علیہ السلام سے تو کیا جب لے آیا تمہارے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم جسے تمہارا نفس پسند نہ کرے تو تم اکڑ گئے بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو قتل کرنے لگے)

اس آیت کی وضاحت میں ابن عربی فرماتے ہیں:

" ظاہر ومعلوم ممامر والظاہر ان جبرائیل ہو عقل الفعال ومیکائیل ہو روح الفلک السادس وعقلہ المفیض للنفس النباتیہ الکلیۃ الموکلۃ بارزاق العباد والاسرافیل ہو رو ح الفلک الرابع وعقلہ المفیض للنفس الحیوانیۃ الکلیۃ الموکلۃ باالحیوانات وعزرائیل ہو روح الفلک السابع الموکل باالارواح الانسانیۃ کلہا "[4]

1۔ الذہبی، **التفسیر والمفسرون** 297/2

2۔ ایضاً: 308/2

3۔ البقرہ:87

4۔ ابن عربی، محی الدین محمد بن علی ،**تفسیر ابن عربی** (دارالکتب العلمیہ بیروت 2001ء،) 1/ 68

(پیچھے جو گزرا اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بے شک جبرائیل عقل فعال ہے اور میکائیل چھٹے آسمان کی روح ہے اس کی عقل تمام نباتاتی نفوس کو فیض پہنچاتی ہے اور وہ لوگوں کو رزق پہنچانے کے مؤکل ہیں اور اسرافیل یہ چوتھے آسمان کی روح ہے اس کی عقل تمام نفوس حیوانیہ کو فیض پہنچاتی ہے جو حیوانات کے مؤکل ہیں اور عزرائیل یہ ساتویں آسمان کی روح ہے جو سب ارواح انسانی کے مؤکل ہے)

ابن عربی نے جبرائیل کو عقل فعال میکائیل کو چھٹے آسمان کی روح اور نباتات کو فیض پہنچانے والی طاقت قرار دیا ہے، اسرافیل کو چوتھے آسمان کی روح اور نفس حیوانیہ کا مؤکل کہا ہے اور عزرائیل کو ساتویں آسمان کی روح اور سب ارواح انسانی کا مؤکل قرار دیا ہے یہ وضاحت، تفسیری اصول وضوابط کی روشنی میں دیکھنا محل نظر ہیں۔

تفسیر اشاری فیضی کی مثال میں سورہ فاتحہ کی چوتھی آیت کی ﴿ ٱهۡدِنَا ٱلصِّرَٰطَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ﴾[1] (چلا ہم کو سیدھے راستے پر) کی تفسیر میں ابن عربی کا یہ قول ہے:

"ای ثبتنا علیٰ الہدایۃ ومکنا بالاستقامۃ فی طریق الوحدۃ التی ہی طریق المنعم علیہم بالنعمۃ الخاصۃ الرحیمیۃ التی ہی المعرفۃ والمحبۃ والہدایۃ الحقانیۃ الذاتیۃ من النبیین والشہداء والصدیقین والاولیا ء" [2]

(یعنی ہمیں ہدایت پر ثابت قدم رکھ اور وحدت کے راستہ پر استقامت اور تمکین عطا فرما یہ راستہ خاص انعام اور رحمت پانے والے لوگوں کا ہے۔ یہ معرفت، محبت اور ہدایت حقانیہ ذاتیہ ہے جو نبی، شہید، صدیق اور اولیاء کو عطا ہوئی)

ابن عربی کی یہ وضاحت پہلے حصے کی حد تک تفسیر بالماثور کے مطابق ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحیمیت کی وضاحت ہے۔ بعد میں فرمایا کہ یہ معرفت، محبت اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایت ہے جو صرف منفرد لوگوں کے نصیب میں ہے، جن میں انبیاء کے علاوہ شہداء، صدیق اور اولیاء شامل ہیں، یہ توضیح ایسی ہے کہ اس کی تطبیق آیت کے ظاہر سے ناممکن ہے۔

ان دونوں امثلہ سے واضح ہوتا ہے کہ تفسیر اشاری ایسے معانی ہیں جو یا تو فکر اور فلسفہ کا نتیجہ ہیں یا تزکیہ نفس اور کشف والہام سے متعلق ہیں۔ یہ حقیقت میں فرد واحد کی ذاتی رائے ہے۔ اسی حوالے سے بہت سی تفاسیر ہیں جن کو تنقید کا سامنا ہے مگر ان سب میں سب سے زیادہ تنقید تفسیر ابن عربی پر ہے۔

تفسیر اشاری کی وجہ تسمیہ:

1۔ الفاتحہ:6

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 29/1

تفسیر اشاری کو تفسیر اشاری کیوں کہتے ہیں؟اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ طاہر محمود یعقوب فرماتے ہیں:

"ماکان فی نفسہ حقاً لکن یستدلون علیہ من القرآن والحدیث بالفاظ لم یردبہا ذالک فہٰذالذی یسمونہ اشارات"[1]

(فی نفسہ یہ حق نہیں ہے لیکن اس پر قرآن وحدیث سے ایسے الفاظ سے استدلال کیا جاتا ہے جن الفاظ سے یہ معانی مراد نہیں ہوتے انہیں اشارات کانام دیاجاتاہے)

بعض لوگ اسے قیاس سے تشبیہ دیتے ہیں۔کہ فقہاء جس طرح قیاس کرتے ہیں اسی طرح صوفیاء بھی معانی سے اپنی مراد اور استدلال کی کوشش کرتے ہیں۔

"ان یجعل ذالک من باب الاعتبارالقیاس لا من باب دلالت اللفظ فہذا من نوع القیاس فالذی تسمیہ الفقہا ء قیاساً ہو الذی تسمیہ الصوفیہ اشارۃ "[2]

(اسے قیاس کی طرح شمار کیا جاتا ہے لفظوں کی دلالت کے اعتبار سے نہیں بلکہ یہ قیاس کی ہی ایک قسم ہے جس کو فقہاءنے قیاس کہاہے اسے صوفیاءاشارہ کہتے ہیں)

تفسیر اشاری کو اشاری اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس سے مفہوم لفظاًثابت نہیں ہوتابلکہ اشارۃً ثابت ہوتاہے اور یہ مرادبعض اوقات ثابت ہوتی ہی نہیں بلکہ ثابت کی جاتی ہے اور اسے اصول فقہ کی اصطلاح میں قیاس سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے جس میں علت مشترکہ کی بنیاد پہ احکام ثابت ہوتے ہیں۔تواسے بھی قیاس کے درجہ میں رکھا جاتاہے جس کو فقہا قیاس کہتے ہیں اسے صوفیاءاشارہ کہتے ہیں اس فکری انفرادیت کی وجہ سے ہی اسے الگ نام (تفسیر اشاری) دیا گیاہے۔

علماء کے مطابق، معانی کی دواقسام ہیں: ایک جو اپنی ذات کے اعتبار سے مخفی ہوتاہے اور دوسراجو علمی دسترس کے اعتبار سے مخفی ہوتاہے ذاتی خفاء تک اکیلا علم نہیں پہنچ سکتا لیکن علمی خفا تک علماء کی رسائی ہوتی ہے۔ان چیزوں کا خفاءدور کرنے کے لئے بھی دوقسم کے اشارات ہوتے ہیں:

" اشارہ حسی: ایسے اشارات جو اسمائے اشارہ کے ذریعے کیئے جائیں۔

اشارہ ذہنی: یہ انتہائی پیچیدہ ہوتاہے۔جس میں کلام کئی معانی کوشامل ہوتاہے، اگر اس کی تعبیر الفاظ میں کی جائے توبہت زیادہ الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔تفسیر اشاری اسی قبیل سے ہے"[3]

1۔ طاہر محمود یعقوب، **اسباب الخطاء فی التفسیر 1/**740.

2۔ ایضاً

3۔ العک،خالد عبدالرحمٰن **اصول التفسیر وقواعدہ** (دارش الفائس 1986ء)106

ایسے معانی ہیں جن کی جانب توجہ کی انتہائی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت میں یہ معانی انتہائی مبہم ہوتے ہیں۔ ان کو جاننا اس فن کے واقفین کے سوا مشکل ہے اور تزکیہ نفس کے بغیر اس کی تفہیم ممکن نہیں ہو سکتی۔ مزید بر آں، ہر قول کے دو معانی ہوتے ہیں ایک اس کے ظاہر سے متعلق ہوتا ہے ایک اس کے باطن سے متعلق ہوتا ہے:

" فظاہر القول لفظ الانسان وباطنہ ما یقوم من حقائقہ ومعانیہ بالجنان وظاہرالعمل حرکات الابدان وباطنہ مایقوم بالقلب من حقائقہ ومعانیہ بالجنان "[1]

(ظاہر قول انسان کے الفاظ ہیں اور باطن میں وہ معانی اور حقائق ہیں جو اس کی روح کے ساتھ قائم ہیں ظاہر عمل انسان کے جسم کی حرکات ہیں اور باطنی وہ حقائق اور معانی ہیں جو قلب اور روح سے تعلق رکھتے ہیں)

ابن تیمیہ واضح کرتے ہیں کہ الفاظ صرف لفظی معنوں تک محدود نہیں ہوتے ان کے اثرات بہت گہرے ہوتے ہیں جو روح تک اثر کرتے ہیں۔ جیسے انسان جسم اور روح کا مرکب ہے ایسے ہی الفاظ بھی ظاہری صورت اور باطنی حقائق پر مشتمل ہوتے ہیں صورت میں اور حقیقت میں خاصا فرق ہوتا ہے صورت کی قدر و قیمت روح کے ساتھ ہوتی ہے۔

تفسیر اشاری کا آغاز و ارتقاء:

تفسیر اشاری کے آغاز سے متعلق علامہ ذہبی نے لکھا ہے:

"لم یکن التفسیر الاشاری بالامر الجدید فی ابراز المعانی القرآن بل ہو امر معروف من لدن نزولہ علیٰ الرسول اللہ واشاار الیہ القرآن ونبہ علیہ رسول ﷺ وعرفہ الصحابہ "[2] (إسناده ضعيف، وهو مرسل (مسند احمد بن حنبل101/25)

(تفسیر اشاری معانی کے ظہور میں کوئی جدید معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ امر تو رسول ﷺ پر قرآن مجید کے نزول وقت سے ہی معروف تھا اس کی جانب قرآن مجید نے خود بھی اشارہ کیا ہے اور نبی رحمت ﷺ نے بھی خبر دی ہے اور صحابہ کرام بھی اسے جانتے تھے)

تفسیر اشاری کی تاریخی حیثیت کا جہاں تک تعلق ہے تمام اصول تفسیر کی کتابوں میں اس کا باقاعدہ عنوان باندھ کر وضاحت کی گئی ہے۔ تفسیر اشاری کے جواز، آیات، احادیث اور اقوال صحابہ سے بھی ماخوذ ہے۔ نبی رحمت ﷺ پر جب اس آیت مقدسہ کا نزول ہوا: ﴿ٱلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ --- ﴾ [3] (آج کے دن میں نے آپ پر اپنا دین مکمل کر دیا۔۔۔) تو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ رونے لگ گئے تو نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

1۔ ابن تیمیہ، احمد ، **مجموع الفتاویٰ** (مجمع الملك المدينه المنوره 2004ء) 265/ 13

2۔ الذہبی ،**التفسیر والمفسرون** ،309/2

3۔ المائدہ :3

" مایبکیک؟ قال یارسول اللہ ابکانی ان کنا فی زیادۃ من دیننا فاما اذا کمل فانہ لم یکمل قط شیء الانقص ، قال صدقت" 1

(اے عمر تمہیں کس چیز نے رلا دیا تو سیدنا عمر فاروق عرض کرنے لگے ہم ابھی دین میں اور کمال چاہتے تھے کیونکہ جب بھی کوئی چیز مکمل ہو جاتی ہے تو اس کا نقصان شروع ہو جاتا ہے۔ تو نبی رحمت ﷺ نے فرمایا تم نے سچ کہا)

اس امر کی وضاحت میں امام آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فہم عمر لما سمع الآیۃ نعی رسول اللہ ﷺ [2]

(اس (تکمیل دین) کی آیت سن کر فاروق اعظم جان گئے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کے وصال کی خبر ہے)

ایسی تصریحات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ تفسیر اشاری کا آغاز زمانہ رسالت سے ہی ہو گیا تھا۔ مگر آغاز میں یہ روایت، منتخب آیات کی اشاری توضیحات تک ہی محدود تھی۔ تفسیر بالماثور ہی مروجہ تفسیر تھی جس کو اصول روایت اور درایت کے تحت مکمل کیا جارہا تھا مگر کہیں کہیں کچھ آیات کی اشاری تعبیرات بھی کی جاتی تھیں۔

تاہم، مکمل تفسیر اشاری کی امثلہ ہمیں دور تابعین میں ملتی ہیں اور یہیں سے ہی تفسیر اشاری کا آغاز ہوا۔ ایک تفسیر جو مکمل اشاری تعبیرات پر مشتمل ہو اس کا آغاز تیسری صدی ہجری میں حضرت سہل بن عبد اللہ تستری سے ہوا[3]۔

جید تابعین، جو تفسیر اشاری میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ان میں بڑے نام، امام ذہبی نے نقل کئے ہیں اور وہ یہ ہیں:

"حضرت امام حسن بصری المتوفیٰ 110ھ، امام جعفر الصادق، حضرت سفیان ثوری المتوفیٰ 161ھ، حضرت ذوالنون مصری، حضرت سہل بن عبد اللہ تستری، شیخ ابو السعید الخراز اور حضرت جنید بغدادی ہیں"۔[4]

کتابی صورت میں تصنیفات کا آغاز تفسیر تستری سے ہوا۔ حضرت سہل بن عبد اللہ تستری کے بارے میں ان کی تفسیر کے آغاز میں لکھا گیا ہے:

"من کبار التابعین لم یکن لہ فی الورع نظیر وکان صاحب الکرامات ولقی شیخ ذوالنون المصری رحمۃ اللہ علیہ وکان لہ اجتہاد وافر و ریاضۃ عظیمۃ وقام فی البصرۃ زمناً طویلاً وتوفی فی سنۃ 283 ھ" [5]

1۔ ابو بکر بن ابی شیبہ، **مصنف ابن ابی شیبہ**، کتاب الزھد، باب الذکر عن نبینا ﷺ فی الزھد (موسسۃ العالمیہ العربیہ 1983ء) 88/7، ح 34408

2۔ الآلوسی۔ شہاب الدین، محمود بن عبداللہ الحسینی، **روح المعانی** (دار الکتب العلمیہ، لبنان 1993ء)، 234/2

3۔ الذہبی، **التفسیر والمفسرون**، 333/2

4۔ غلام شمس الرحمٰن، **تفسیر اشاری کی روایت کا منہج**، جلد 12 شمارہ 32 (2018ء) 10

5۔ التستری، سہل بن عبداللہ، **تفسیر القرآن العظیم، تستری** (دار الحرم للتراث 2004ء) 68

(آپ کبار تابعین سے تھے زہد وورع میں آپ کی کوئی مثال نہیں تھی آپ صاحب کرامات تھے اور آپ کی ملاقات حضرت ذوالنون مصری سے بھی ہوئی آپ اجتہاد میں مہارت رکھتے تھے۔بہت ریاضت میں مصروف رہتے آپ بصرہ میں کافی عرصہ تک مقیم رہے اور 283ھ میں آپ کا وصال ہوا۔)

آپ اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"ما من آية القرآن الا ولها ظاہر وبطن حد ومطلع فا لظاہر تلاوة القرآن والباطن فہم والحد حلالہا وحرامہا ومطلع اشراف القلب على المراد بہا فقہا من الله عزوجل "[1]

(قرآن مجید کی ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ایک حد ہے اور ایک مطلع پس اس کا ظاہر تلاوت قرآن ہے باطن اس کا فہم ہے اس کی حد حلال اور حرام ہے اس کا مطلع اسکی مراد اور منشاء سے شرف پانا ہے جس کی سمجھ اور علم اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کیا جاتا ہے)

قرآن میں ارشاد ہے:

﴿أَفَلا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلى قُلُوبٍ أَقْفالُها﴾[2]

(یہ لوگ قرآن مجید میں غور کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں کو تالے لگے ہوئے ہیں)

اس آیہ مقدسہ کی وضاحت حضرت تستری ایک مختلف انداز میں فرماتے ہیں:

" إن الله تعالى خلق القلوب وأقفل عليها بأقفال، وجعل مفاتيحها حقائق الإيمان، فلم يفتح بتلك المفاتيح على التحقيق إلا قلوب أوليائه والمرسلين صلوات الله عليهم أجمعين والصديقين وسائر الناس يخرجون من الدنيا، ولم تفتح أقفال قلوبهم، والزهاد والعباد والعلماء خرجوا منها وقلوبهم مقفل"[3]

(اللہ تعالیٰ نے دلوں کو پیدا کیا اور ان کو تالے لگا دیئے اور ان کی چابیاں ایمان کی حقیقتوں کو بنا دیا اور یہ چابیاں دلوں کو نہیں کھولتیں مگر انبیاء، اولیاء اور صدیقین کے دلوں کو اور سب لوگ اس طرح دنیا سے نکلتے ہیں کہ ان کے دل مقفل ہوتے ہیں بہت سے زاہد عالم اور عابد دنیا سے اس حال میں نکلتے ہیں کہ ان کے دل مقفل ہوتے ہیں)

تستری کے مطابق، انسان کو قرآن مجید کے معرفت سے متعلق مفاہیم اس وقت تک معلوم نہیں ہوتے جب تک اسے حقیقت ایمان سے واقفیت حاصل نہیں ہوتی یہی حقائق انسان پر قرآن کی حقیقت کو آشکار کرتے ہیں اگر یہاں تک انسان کی رسائی نہ ہو تو انسان اس دنیا سے اس حال میں رخصت ہوتا ہے کہ اس کا دل مقفل ہی ہوتا ہے اور اس کو شرح صدر کی دولت نہیں ملتی اور اس پر علوم کی حقیقتیں منکشف نہیں ہوتیں۔

1۔ تستری، **تفسیر تستری** 76

2۔ محمد: 24

3۔ تستری، **تفسیر تستری** ۔ 145

تفسیر تستری کے بعد حقائق التفسیر، تفسیر اشاری فیضی ہے اس کے مصنف عبد الرحمٰن السلمی جو 330ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ تصوف میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ چالیس سال قراءت حدیث اور کتابت حدیث میں مصروف رہے۔ امام حاکم المستدرک والے اور امام ابو القاسم قشیری، رسالہ قشیریہ والے، ان کے شاگرد ہیں۔ انہوں ایک سو سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی تفسیر، تستری سے مختلف ہے۔ یہ زیادہ تر دیگر مفسرین کی تفسیر نقل کرتے ہیں۔ جن مفسرین کے اقوال انہوں نے زیادہ ذکر کیئے ہیں ان میں

"، امام جعفر الصادق، ابن عطاء سکندری، جنید بغدادی، فضیل بن عیاض اور خود سہل بن عبد اللہ تستری شامل ہیں"[1]

تفسیر سلمی کے انداز کو دیکھنے کے لئے ذیل کی آیت قرآنی کی وضاحت دیکھیئے:

﴿أَلَمۡ تَرَ أَنَّ ٱللَّهَ أَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآء فَتُصۡبِحُ ٱلۡأَرۡضُ مُخۡضَرَّةًۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَطِيفٌ خَبِير ﴾[2]

(کیا تو نے نہین دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اتارا آسمان سے پانی تو ہو جاتی ہے خشک زمین سرسبز و شاداب بے شک اللہ تعالیٰ ہمیشہ لطف فرمانے والا ہر چیز سے باخبر ہے)

علامہ سلمی فرماتے ہیں:

"انزل میاہ الرحمۃ من سحاب القربۃ وفتح الیٰ قلوب عبادہ عیونا من ما ء الرحمۃ فانبتت فاخضرت بزینۃ المعرفۃ او اثمرت الایمان اینعت التوحید واضاءت بالمحبۃ فصارت الیٰ سیدہا واستقامت الیٰ ربہا فطارت بہمتہا واناخت بین یدیہ عکفت فاقبلت علیہ وانقطعت عن الاکوان اجمع ذاک آواہا الحق الیہ وفتح لہا خزائن انوارہ اطلق لہا الخیرۃ فی البساتین الانس ورياض [3]

(اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا پانی نازل کیا قربت کے بادل سے اور اس سے دلوں کی جانب چشمے کھول دیئے۔ پس اس سے معرفت کی زینت کا سبزہ اگ آیا، اور ایمان کے پھل اور توحید کی انتہا اور ان کے لئے اس محبت سے اپنے سردار کی جانب جانے والی روشنی پیدا ہو گئی اور وہ اپنے رب کی جانب استقامت کے ساتھ اپنی ہمت سے اڑتا ہے اور اپنے رب کے سامنے صاحب فراش ہوتا ہے اور ٹک کے بیٹھ جاتا ہے اور قبولیت پاتا ہے اور باقی دنیا سے منقطع ہو جاتا ہے اور اللہ کی بارگاہ میں جگہ پاتا ہے اور اس کے لئے انوار کے خزانے کھول دیئے جاتے ہیں اور اسے دو بھلائی کے باغوں انس اور ریاض کا مالک بنا دیا جاتا ہے)

1۔ الذہبی **التفسیر والمفسرون**، 336/2

2۔ الحج: 63

3۔ السلمی، ابی عبدالرحمٰن محمد بن حسین، حقائق التفسیر تفسیر القرآن العزیز، (دار الکتب العلمیہ بیروت 2001ء) 49/1

یہ تفصیل منفرد ہے۔ ظاہری سبزہ اور باغات کو تہذیب نفس کی جانب منسوب کیا گیا ہے اس سے مراد انسان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملنے والی اطمینان کی دولت ہے۔ یہ سب ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ہی نزول ہی ہوتا ہے اور اللہ انہیں استقامت سے عظمت کی بلندیوں کی جانب عروج دیتا ہے۔

اشاری سلسلے کی ایک تفسیر ساتویں صدی ہجری میں ابو محمد روزبہان بن ابو النصر البقلی الشیرازی نے عرائس القرآن فی حقائق القرآن کے نام سے پوری تفسیر اشاری لکھی۔ یہ جامعۃ الازہر کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ظاہر سے بالکل تعرض نہیں برتا گیا بلکہ ساری تفسیر ظاہر سے مطابقت کی آئینہ دار ہے۔ علامہ سلمی فرماتے ہیں:

وجدت ان کلامہ الازلی لا نہایۃ لہ فی الظاہر والباطن لم یبلغ احد الی کمالہ وغایتہ ومعانیہ [1]"

(میں نے اس بات کو پالیا کہ یہ ازلی کلام ہے اس کے ظاہر اور باطن میں اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اور نہ ہی کوئی اس کے کمال کو اور اس کے معانی کی انتہا کو پہنچ سکتا ہے)

گویا، اس کے ہر لفظ کے نیچے معانی کے سمندر ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے اس کی کوئی انتہا نہیں اسی کی وضاحت قرآن مجید کی اس آیت مقدسہ میں ہے۔

﴿ وَلَوۡ أَنَّمَا فِي ٱلۡأَرۡضِ مِن شَجَرَةٍ أَقۡلَٰمٞ وَٱلۡبَحۡرُ يَمُدُّهُۥ مِنۢ بَعۡدِهِۦ سَبۡعَةُ أَبۡحُرٖ مَّا نَفِدَتۡ كَلِمَٰتُ ٱللَّهِۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٞ﴾ [2]

(اگر زمین پر موجود تمام درخت قلم بن جائیں اور سارے سمندر سیاہی بن جائیں اور اس کے بعد مزید سات سمندر بھی شامل ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کے کلمات کی کبھی وضاحت نہیں ہو پاتی بے شک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے)

یہ سمندر ازلی احکامات کے اور ابدی اشارات ہیں۔ جن کو علماء سمجھنے سے قاصر ہیں حکماء کی عقلیں اولیاء کی اقتداء خلفاء کا اسوہ اصفیاء کی سنت یہ سب رحمٰن کے قرآن میں اشارات ہیں۔ لطیف عبارات اور اشارات ہیں مصنف کہتا ہے کہ میں نے اپنی تصنیف میں سب کو بیان نہیں کیا کہیں کتاب بوجھل نہ ہو جائے۔ [3]

ایک اور مثال، ذیل کی آیت کی تفسیر:

---

1 السلمی، **تفسیرسلمی**، 341/2

2۔لقمان: 27

3۔الذہبی، **التفسیر والمفسرون**، 344/2

﴿لَّيۡسَ عَلَى ٱلضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى ٱلۡمَرۡضَىٰ وَلَا عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُواْ لِلَّهِ وَرَسُولِهِۦۚ مَا عَلَى ٱلۡمُحۡسِنِينَ مِن سَبِيلٖۚ وَٱللَّهُ غَفُورٞ رَّحِيمٞ﴾[1]

(نہیں ہے کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر نہ ان پر جو نہیں پاتے وہ مال جسے خرچ کریں (اگر پیچھے رہ جائیں) کوئی حرج جبکہ وہ مخلص ہوں اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے رسول کے لئے انہیں ہے نیکو کاروں پر الزام کی کوئی وجہ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے)

اللہ تعالیٰ جو اہل مراقبات ہیں اور حضوری کی مجلسوں میں رہتے ہیں اور مشاہدات میں گم رہتے ہیں اور ازلی سمندروں میں غرق رہتے ہیں جن کے اجسام مجاہدات سے مضمحل رہتے ہیں اور ان کے نفوس مجاہدات سے بیمار رہتے ہیں ان کے دل ہمیشہ ذکر اور فکر میں غوطہ زن رہتے ہیں اور وہ اس فانی دنیا سے ہمیشہ صاف عقائد اور مشاہدات کے ساتھ نکلتے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ مجالس یقین اور انس میں رہتے ہیں۔

صوفیاء کا موقف یہ رہا ہے کہ اگر انسان بیمار ہے کمزور ہے غریب ہے ایسی صورتوں میں بھی وہ خدا کا محبوب ہے اس کی وجہ بیان کی جارہی ہے اس بیماری کا سبب نفس کی مشقت جو وہ دنیا کے حصول میں اٹھاتا ہے وہ نہیں بلکہ وہ ہے وہ جو قرب الٰہی کے لئے اٹھاتا ہے۔ مجاہدات اور ریاضات، باعث ضعف ہیں۔ ایسی حالت میں اگرچہ ظاہری جسمانی کمزوری ہوتی ہے مگر مقاصد کے حصول میں ناکامی نہیں ہوتی، اور یہی منزل مراد ہے۔

سلسلہ اشاری کی ایک تفسیر التاویلات نجمیہ ہے، جس کا آغاز نجم الدین دایہ نے کیا مگر اسے مکمل کرنے سے قبل ہی فوت ہوگئے جسے بعد میں علاؤالدین سمنانی نے مکمل کیا۔ امام نجم الدین دایہ، المتوفی 654ھ یہ نامور صوفیاء میں سے تھے۔ آغاز میں خوارزم میں رہے پھر چنگیز خاں کے دور میں روم میں گئے جہاں صدرالدین قنوی سے ملے ان سے طلب علم کیا۔ جہاد میں شہادت کے بعد، بغداد میں جنید بغدادی اور سری سقطی کے پڑوس میں دفن ہوئے۔ تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ ہر آیت کے سات باطن ہوتے ہیں اور ہر باطن ظاہر کا مخالف ہوتا ہے۔[2]

قرآن حکیم میں یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے سلسلہ میں مذکور ہے:

﴿وَقَالَ نِسۡوَةٞ فِي ٱلۡمَدِينَةِ ٱمۡرَأَتُ ٱلۡعَزِيزِ تُرَٰوِدُ فَتَىٰهَا عَن نَّفۡسِهِۦۖ قَدۡ شَغَفَهَا حُبًّاۖ إِنَّا لَنَرَىٰهَا فِي ضَلَٰلٖ مُّبِينٖ﴾[3]

1۔ التوبہ:91

2۔ ملخص، الذہبی، **التفسیر والمفسرون**، 346،345/3452/2

3۔ الیوسف:30

(اور شہر کی خواتین نے عزیز مصر کی بیوی سے کہا کہ اپنے غلام کی محبت میں گرفتار ہو ہم تمہیں کھلی گمراہی میں پاتی ہیں۔)

اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہاں محبت اس سے مراد دنیا سے لگاؤ ہے۔دل ابتدا میں غلام ہوتا ہے اسے تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، جب دل مکمل ہو جاتا ہے اور بشری اثرات سے پاک ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا اہل ہو جاتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ اپنی تجلی عطا فرماتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے جمال اور جلال سے چمک اٹھتا ہے۔ اب ہر چیز اس کی محتاج ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ساری دنیا اس کی محتاج ہو جاتی ہے۔ جمال یوسف حقیقت میں قلب ہی تھا اور زلیخا دنیا تھی۔ [1]

علماء کی نظر میں تفسیر اشاری کا مقام و مرتبہ:

تفسیر اشاری کے جواز اور عدم جواز میں مختلف آراء ہیں مگر اکثر علمائے کرام تفسیر کے عدم جواز کے قائل ہیں۔ جواز کے اقوال کچھ شرائط کے ساتھ قابل قبول مانے گئے ہیں مگر اس تفسیر کو مطلق قبولیت عامہ حاصل نہیں ہوئی۔

علامہ طاہر محمود یعقوب لکھتے ہیں:

" عدم جوازہ :ذالک خشیۃ التقول علیٰ اللہ تعالیٰ فی تفسیرہ کلامہ المجید من غیر علم ولاھدیً "[2]

(عدم جواز :اس لیے کہ خدشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں بغیر علم اور ہدایت کے کوئی بات نہ کہ دے)

دوسرا قول اس کے جواز کا ہے مگر مطلق جواز نہیں بلکہ اصول وضوابط کی روشنی میں مشروط قبولیت کا ہے:

"القول بالجواز :واصحاب ہذالقول لم یذہبو االی الجواز علی الاطلاق بل وضعوالقبولہ شروطاً"[3]

(جہاں تک اس قول کے جواز کی بات ہے اس قول کے قائل مطلق جواز کی جانب نہیں گئے بلکہ اس کی قبولیت کے لئے کچھ شرائط وضع کی ہیں)

ایک طبقہ متوسط بھی ہے جو اس کو نہ تو مطلق ناجائز کہتا ہے اور نہ اسے لازم قرار دیتا ہے بلکہ اسے اصول وضوابط سے قبول یا رد کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ڈاکٹر عبد الرحیم لکھتے ہیں:

"تباینت فیہ آراؤھم منھم من اجازۃ ومنھم من عدۃ من کمال الایمان ومحض عرفان [4]

1۔ الذہبی، **التفسیر والمفسرون**، ملخص 347/2

2۔ طاہر محمود یعقوب، **اسباب الخطاء فی التفسیر**، 742/1

3۔ ایضاً

4۔ الدکتور عبدالرحیم، السید مقیل حسین، **التفسیر الاشاری**، واہم کتبہ، (س ن) 10

(اس میں لوگوں کی مختلف آراء ہیں بعض نے اسے جائز قرار دیا ہے اور بعض اس کو کمال ایمان شمار کرتے ہیں اور بعض اسے محض عرفان سمجھتے ہیں)

ہر دور میں صوفیاء سے مروی معانی پر علماء میں بحث و تمحیص جاری رہی ہے اور صوفیاء کی تعبیرات کو تفسیر میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ تاہم علماء کے مطابق تفسیر اشاری کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کے ظاہری مفہوم سے ٹکراتی نہ ہو۔ علامہ ابن صلاح اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

"سَأَلَ سَائل فِي كَلَام الصُّوفِيَّة فِي الْقُرْآن قَالَ كالمستحسن لكَلَام الصُّوفِيَّة وَقَالَ أَيْضا حهم لَا يُرِيدُونَ بِهِ تَفْسِير الْقُرْآن وَإِنَّمَا هِيَ مَعَاني يجدونها عِنْد التِّلَاوَة[1]

(ایک سوال کرنے والے نے سوال کیا صوفیاء کے قرآن مجید کے بارے میں کیے گئے کلام کے بارے میں تو انہوں نے کہا یہ مستحسن ہے۔ اور اس کی وضاحت میں انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر کے بجائے ایسے معانی کا نام دیا جو دوران تلاوت ان پر منکشف ہوتے ہیں۔)

علماء یہ بھی فرماتے ہیں آیات میں ہی ایسے خفی اشارات ہوتے ہیں جو ارباب سلوک پر منکشف ہوتے ہیں اور یہ آیت کے ظاہر کے خلاف بھی نہیں ہوتے اس کی وضاحت میں امام سیوطی فرماتے ہیں:

"أَنَّ النُّصُوصَ عَلَى ظَوَاهِرِهَا وَمَعَ ذَلِكَ فِيهَا إِشَارَاتٌ خَفِيَّةٌ إِلَى دَقَائِقَ تَنْكَشِفُ عَلَى أَرْبَابِ السُّلُوكِ يُمْكِنُ التَّطْبِيقُ بَيْنَهَا وَبَيْنَ الظَّوَاهِرِ الْمُرَادَةِ فَهُوَ مِنْ كَمَالِ الْإِيمَانِ وَمَحْضِ الْعِرْفَانِ"[2]

(اور جس جانب نصوص اپنے ظاہر کے ساتھ اپنے باطن میں کچھ ایسے معانی لئے ہوئے ہوتی ہیں جو ظاہر سے خلاف بھی نہیں ہوتے یہ راز صرف ارباب سلوک پر ہی کھلتے ہیں۔ اس کے ظاہر اور باطن میں تطبیق بھی ممکن ہوتی ہے۔ یہ کمال ایمان اور محض عرفان سے ہی ممکن ہے۔)

گویا، امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ قرآن کے مفاہیم ان کا تعلق ظاہر سے ہو یا باطن سے وہ کبھی بھی باہم متضاد نہیں ہوتے بلکہ باہم متصل اور منسلک ہوتے ہیں ان میں تطبیق ممکن ہوتی ہے۔ مگر ایک بات جس کی وضاحت کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ معانی ایمان، ایقان اور تکمیل عرفان کے بغیر ممکن نہیں کہ ان تک رسائی حاصل ہو۔

علامہ زرکشی فرماتے ہیں:

"وَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: من أراد علم الأولين والآخرين فليثور القرآن قَالَ ابْنُ سَبْعٍ فِي كِتَابِ شِفَاءِ الصَّدْرِ: هَذَا الَّذِي قَالَ أَبُو الدَّرْدَاءِ وَابْنُ مَسْعُودٍ لَا يَحْصُلُ بِمُجَرَّدِ تَفْسِيرِهِ الظَّاهِرِ وَقَدْ قَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ لِكُلِّ آيَةٍ سِتُّونَ أَلْفَ فَهْمٍ وَمَا بَقِيَ مِنْ فَهْمِهِ أَكْثَرُ وَقَالَ آخَرُونَ الْقُرْآنُ يَحْتَوِي عَلَى سَبْعَةٍ

1۔ ابن الصلاح، عثمان بن عبدالله، **فتاویٰ لابن صلاح**، (مکتبہ العلوم والحکم عالم الکتب بیروت 1985ء) 196/1

2۔ السیوطی، **الاتقان** 224/4

وَسَبْعِينَ أَلْفَ عِلْمٍ إِذْ لِكُلِّ كَلِمَةٍ عِلْمٌ ثُمَّ يَتَضَاعَفُ ذَلِكَ أَرْبَعًا إِذْ لِكُلِّ كَلِمَةٍ ظَاهِرٌ وَبَاطِنٌ وَحَدٌّ وَمَطْلَعٌ"[1]

(حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو چاہتا ہے کہ اسے اولین وآخرین کا علم ملے تو قرآن مجید سے خیرات لے۔ ابن سبع کتاب شفاء الصدر میں فرماتے ہیں کہ جو حضرت ابو درداء اور ابن مسعود نے فرمایا یہ محض قرآن مجید کی ظاہر تفسیر سے حاصل نہیں ہوتا اور بعض علماء کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے ساٹھ ہزار مفاہیم ہیں اور اکثر مفہوم باقی رہ جاتے ہیں اور بعض نے تو 77 ہزار بیان کیے ہیں پھر ہر ایک کے چار ہوتے ہیں اور ہر کلمہ کا ایک ظاہر ہے ایک باطن ایک حد اور ایک مطلع)

ان کے بقول گویا کہ قرآن مجید میں اتنی وسعتیں ہیں جتنی اس کائنات میں کیونکہ اس میں اولین وآخرین کے علوم اور خبریں ہیں قرآن مجید کے ظاہری مفہوم سے واقفیت یہ قرآن مجید کا صرف ایک علم ہے جبکہ اس کی تفصیل میں بعض لوگوں نے کہا ہے اس میں ساٹھ ہزار علوم ہیں اور بعض نے 77 ہزار بیان کئے ہیں اور ان میں سے ہر کلمہ کے مزید چار مفہوم ہیں ایک ظاہر ایک باطن، ایک حد ایک مطلع۔ اس اعتبار سے قرآن مجید علوم کا بحر ذخار ہے اور اس کی وسعتوں کو پانا اور اس کی تفہیم کا حق ادا کرنا ناممکن ہے جو جس قدر اس میں گہرائی حاصل کرے گا اسی قدر اس پر علوم کا انکشاف ہو گا:

"انہا اشارات خفیۃ ومعان الہامیۃ تنہل علیٰ قلوب العارفین [2]

(یہ الہامی خفیف اشارات ہوتے ہیں جو عارفین کے قلوب پر نازل ہوتے ہیں)۔

جہاں تک عدم جواز کی بات ہے تو وہ صرف باطنی تفسیر کی بارے زیادہ درست ہے۔ علامہ تفتازانی فرماتے ہیں کہ بعض ملحدین ور فرقہ باطنیہ کے لوگوں کا خیال ہے کہ نصوص کا صرف باطنی معنیٰ ہی درست ہے۔ یہ شریعت کی نفی کے مترادف ہے:

"أَنَّ النُّصُوصَ لَيْسَتْ عَلَى ظَاهِرِهَا بَلْ لَهَا مَعَانٍ بَاطِنِيَّةٌ لَا يَعْرِفُهَا إِلَّا الْمُعَلِّمُ وَقَصْدُهُمْ بِذَلِكَ نَفْيُ الشَّرِيعَةِ بِالْكُلِيَّةِ"[3]

(نصوص سے ان کا ظاہری معنیٰ مراد نہیں بلکہ اس کا باطنی معنیٰ مراد ہے۔ اسے سب نہیں جانتے مگر جاننے والے اور اس سے ان کی مراد شریعت کی مکمل نفی ہے)

1۔ الزرکشی، بدر الدین محمد بن عبداللہ بن بہادر، **البرہان فی علوم القرآن**، (دار المعرفۃ البیروت، لبنان 1957ء)، 454/1

2۔ الذہبی، **التفسیر والمفسرون**، 324/2

3 ابن الصلاح، **مقدمہ ابن الصلاح**، 324/4

گویا تفسیر اشاری میں جس تفسیر کو ناجائز قرار دیا گیا ہے وہ باطنیہ کی تفسیر ہے جو ظاہر نصوص کے بالکل مخالف اور فرقہ باطنیہ کے من گھڑت عقائد کے مطابق ہو ایسی تفسیر کو گمراہی شمار کیا گیا ہے۔ جہاں تک تفسیر اشاری صوفی اور فیضی کی بات ہے، اس کی قبولیت کی شرط یہ ہے کہ اگر یہ نظم قرآنی کے مطابق اور تفسیری اصول وضوابط کے مطابق ہے تو یہ صحیح، بصورت دیگر قابل قبول نہیں۔

تفسیر اشاری کی قبولیت کی شرائط:

تفسیر اشاری ، تفسیر باالراءی کی ایک قسم ہے جب کہ تفسیر بالرائے کی بنیاد مفسر کے اجتہاد، قیاس اور تعقل پر ہے۔ تاہم اہل علم کے مطابق ، اس تفسیر کا قرآن وسنت سے استناد ضروری ہے تاکہ امت اسے قبول کر سکے۔ لہٰذا، علامہ فہد بن عبد الرحمٰن لکھتے ہیں:

" ہو التفسیر المستند من ا لقرآن من سنۃ الرسول ﷺ وکان صاحبہ عالماً بلغۃ العربیۃ خبیراً باسالیبہا عالماً بقواعد الشریعۃ واصولہا "[1]

(ایسی تفسیر جو قرآن وسنت سے مستند ہو اور مفسر لغت عربی سے باخبر اور قواعد شریعہ اور اصول واسالیب سے بھی باخبر ہو)

والمفسر ہنا یبذل جہدہ ووسعہ فی فہم نص القرآنی وادراک معناہ مستند الی اللغۃ العربیہ والنصوص والادلۃ الشرعیۃ [2]

(مفسر یہاں اپنی پوری توجہ اور کوشش وسعت نص قرآنی اور اس کے معنیٰ کے ادراک کے لیے لگا دیتا ہے اور اسے لغت عربیہ اور نصوص اور ادلہ شریعہ سے مستند بناتا ہے)

اسی بنا پر، ایسی تفسیر کے لیے، مفسرین نے چند شرائط لکھی ہیں جو درج ذیل ہیں:

1۔ مفسر کی صحت اعتقاد:

سب سے پہلی شرط، مفسر کی صحت اعتقاد ہے، جیسا کہ علامہ سیوطی نے لکھا:

"صِحَّةُ الِاعْتِقَادِ أَوَّلًا وَلُزُومُ سُنَّةِ الدِّينِ فَإِنَّ مَنْ كَانَ مَغْمُوصًا عَلَيْهِ فِي دِينِهِ لَا يُؤْتَمَنُ عَلَى الدُّنْيَا فَكَيْفَ عَلَى الدِّينِ ثُمَّ لَا يُؤْتَمَنُ مِنَ الدِّينِ عَلَى الْإِخْبَارِ عَنْ عَالِمٍ فَكَيْفَ يُؤْتَمَنُ فِي الْإِخْبَارِ عَنْ أَسْرَارِ اللَّهِ تَعَالَى"[3]

1۔ فہد بن عبدالرحمٰن ، **البحوث فی اصول التفسیر ومناہجہ** ،79

2۔ ایضاً

3۔ السیوطی ، **الاتقان** 200/4

(سب سے پہلی شرط عقائد کا ٹھیک ہونا ہے اور دین کے طریقہ کو لازم پکڑنا ہے جو شخص دینی لحاظ سے مکذوب اور معیوب ہوتا ہے اس پر دنیاوی اعتبار سے بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا چہ جائے کہ دینی امور میں مزید برآں اگر ایسا شخص کسی عالم کے حوالہ سے خبر دے تو وہ قابل اعتبار نہیں تو خبر الٰہی میں اس پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے)

2۔ منقول تفسیر پر اعتماد:

علامہ سیوطی مزید لکھتے ہیں:

"يَجِبُ أَنْ يَكُونَ اعْتِمَادُهُ عَلَى النَّقْلِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَنْ أَصْحَابِهِ وَمَنْ عَاصَرَهُمْ وَيَتَجَنَّبُ الْمُحْدَثَاتِ"[1]

(ضروری ہے کہ کہ نقل پر جو نبی رحمت ﷺ صحابہ کرام علیہم الرضوان اور ان کے معاصرین سے مروی پر پورا اعتماد ہو اور بدعت سے اجتناب کیا جائے۔)

3۔ صحت مقصد اور اخلاص نیت:

علامہ زرکشی کا کہنا ہے کہ:

"وَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا يَحْصُلُ لِلنَّاظِرِ فَهْمُ مَعَانِي الْوَحْيِ حَقِيقَةً وَلَا يَظْهَرُ لَهُ أَسْرَارُ الْعِلْمِ مِنْ غَيْبِ الْمَعْرِفَةِ وَفِي قَلْبِهِ بِدْعَةٌ أَوْ إِصْرَارٌ عَلَى ذَنْبٍ أَوْ فِي قَلْبِهِ كِبْرٌ أَوْ هَوَى أَوْ حُبُّ الدُّنْيَا أَوْ يَكُونُ غَيْرَ مُتَحَقِّقِ الْإِيمَانِأَوْ ضَعِيفَ التَّحْقِيقِ أَوْ مُعْتَمِدًا عَلَى قَوْلِ مُفَسِّرٍ لَيْسَ عِنْدَهُ إِلَّا عِلْمٌ بِظَاهِرٍ أَوْ يَكُونُ رَاجِعًا إِلَى مَعْقُولِهِ وَهَذِهِ كُلُّهَا حُجُبٌ وموانع وبعضها آكد من بعض"[2]

(جان لیں جس شخص کے دل میں بدعت تکبر خواہش نفس حب دنیا سمائی ہو یا وہ گناہ پر مصر ہو یا اس کا ایمان مشکوک یا تحقیق میں کمزور ہو یا کسی بے علم مفسر کے قول پر اعتماد کرنے والا ہو یا محض اپنی عقل کو سب کچھ سمجھتا ہو تو یہ سب ایسی رکاوٹیں اور موانع ہیں کہ ان سے متصف شخص کو نہ تو مفاہیم وحی کا علم حاصل ہو سکتا ہے نہ اس پر وحی کے اسرار اور موز ہی منکشف ہوتے ہیں)

یہ تین ایسی شرائط ہیں جو تفسیر بالرائے کی بنیاد ہیں کیونکہ علمی پختگی سے قبل فکر اور عقائد کی پختگی کی زیادہ ضرورت ہے اس کے ساتھ اخلاص نیت کو ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد وہ ضروری علوم ہیں جن کا جاننا ضروری ہے۔

1۔ السیوطی، **الاتقان** 2001/4

2۔ الزرکشی، **البرہان** 180/2۔181

4۔ مفسر کے لیے ضروری علوم:

مفسر کے لیے جو تفسیر ابالرائے کرنا چاہتا ہے ایسے پندرہ علوم ہیں جن میں مہارت ہونا ضروری ہے۔ جو درج ذیل ہیں۔

"لغت، نحو، اشتقاق، بلاغت، معانی، بیان، بدیع، قراءت، عقائد، اصول فقہ، اسباب نزول، ناسخ منسوخ، علم السنن اور علم الموہبہ۔ اب ان میں سے ہر ایک کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔ 1

قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا اور جس قوم میں نازل ہوا فصاحت و بلاغت ان کی گھٹی میں ملی ہوئی تھی جو الفاظ کے اسرار و رموز اور گہرائی سے بخوبی واقف تھے۔ قرآن مجید کی تفسیر میں لغت کا کتنا حصہ ہے اس کا اندازہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ کے اس قول سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے آپ فرماتے ہیں:

" لا یحل لاحد یومن باللہ والیوم الآخر ان یتکلم فی کتاب اللہ اذ لم یکن عالماً بلغات العرب"[2]

(کسی بھی شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتا ہے۔ یہ جائز نہیں کہ وہ قرآن کے متعلق کوئی بات کرے جب تک وہ لغت عرب کو نہیں جانتا)

جب قرآن مجید کا نزول ہو رہا تھا تو سب سے پہلے مخاطب صحابہ ہی تھے اور وہ عرب ہونے کی وجہ سے لغت عربی اور زبان کے پیچ و تاب سے بخوبی واقف تھے اس وجہ سے ان کی توجیہات کو معاجم قوامیس اور آئمہ لغت پر ترجیح دی جائے گی اور باقی لغات اور اقوال آئمہ کو دوسرے درجہ میں رکھا جائے گا۔

مثال کے طور پر ذیل کی آیت مبارکہ:

﴿ إِذۡ يُغَشِّيكُمُ ٱلنُّعَاسَ أَمَنَةٗ مِّنۡهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيۡكُم مِّنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءٗ لِّيُطَهِّرَكُم بِهِۦ وَيُذۡهِبَ عَنكُمۡ رِجۡزَ ٱلشَّيۡطَٰنِ وَلِيَرۡبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمۡ وَيُثَبِّتَ بِهِ ٱلۡأَقۡدَامَ﴾ [3]

1۔ الذہبی، **التفسیر والمفسرون** 1/229۔232

2۔ الزرکشی ابو عبداللہ بدرالدین بن محمد، **البرہان فی علوم القرآن**، (دار الاحیاء الکتب العربیہ البابی الحلبی 1957ء 1/292)

3۔ الانفال: 11

(اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے ڈھانپ دیا تم کو غنودگی سے تا کہ باعث تسکین ہو اس کی طرف سے اور اتارا تم پر آسمان سے پانی تا کہ پاک کر دے تمہیں اس سے اور دور کر دے تم سے شیطان کی نجاست اور مضبوط کر دے تمہارے دلوں کو اور جما دے اس سے تمہارے قدموں کو)

اس کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں:

"وقد زعم بعض اہل العلم بالغریب من اہل البصرۃ ان مجاز قولہ یثبت بہ الاقدام یفرغ علیہم الصبر فیثبتو ن لعدوہم "[1]

(بعض اہل علم جو بصرہ سے ہیں ان کا اس کے بارے میں ایک غریب قول ہے۔ کہ ثابت قدمی صبر سے اور ڈٹ جانے سے مجاز ہے صبر سے مراد ثابت قدمی ہے جو ان کو دشمن کے مقابلہ میں ملی)

جب کہ تمام صحابہ اور تابعین کے اقوال اس کے خلاف ہیں اور اس کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

" ویثبت بہ الاقدام بتلبید المطر الرمل حتی ' لا تستوخ فیہ اقدامہم وحوافر دواتہم "[2]

(اور وہ بارش اور ریت کو بکھیر کر ان کے پاؤں کو مضبوط کیا تا کہ ان کے پاؤں اور آلات اس میں نہ دھنس جائیں۔)

علامہ ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہ اپنے ظاہری معنیٰ پے ہی ہے۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ بارش کی وجہ سے ریت بیٹھ گئی اور ان کی سواریوں کو چلنے میں آسانی ہو گئی۔ یہی معنیٰ صحابہ نے بھی مراد لیا ہے۔ علم بلاغت کا تفسیر قرآن میں کلیدی کردار ہے قرآن مجید کیونکہ عربی زبان میں نازل ہوا تو اس زبان کے تمام اصول و ضوابط کا جاننا بھی لازم ہے اس لیے اصول بلاغت کو مفسر کے لیے ضروری قرار دیا گیا۔ اسی طرح علم قرآت کا معاملہ ہے:

"اذبمعرفۃ القرات یمکن ترجیح بعض الوجوہ المحملۃ علیٰ بعض "[3]

(علم قرات کے باعث بعض وجوہ کو بعض پر ترجیح ممکن ہوتی ہے)

ھی الاحکا م الکلیہ المنضبطہ التی یتوصل بہا الیٰ ترجیح احد الاقوال فی تفسیر آیۃ[4]

(یہ ایسے مکمل اور باضابطہ احکام ہوتے ہیں۔ جو مختلف اقوال میں سے کسی ایک قول کو ترجیح دینے تک پہنچاتے ہیں)

1۔ الطبری، **جامع البیان**، 68/11

2۔ ایضاً 68/11

3۔ ایضاً

4۔ فہد بن عبدالرحمٰن، **اصول التفسیر ومنابجہ**، 160

اس طرح، اصول فقہ کی روشنی میں قران مجید کی تفسیر کی جاتی ہے۔قرآن مجید میں مطلق، مقید، عام، خاص ، مشکل اور مجمل وغیرہ استعمال ہوئے اصول فقہ کی روشنی میں ان کی تعیین کی جاتی ہے۔اسی طرح، اسباب النزول کا علم ضروری ہے:

" ما نزلت آية والآيات متحدثة عنه ان مبينة لحكمه ايام وقوعه والمعنىٰ انه حادثة وقعت فى زمن النبى ﷺ "[1]

(کوئی بھی آیت یا آیات جو کسی واقعہ سے متعلق نازل ہوئیں یہ واقعہ یا حکم نبی ﷺ کے زمانہ میں ہوا)

جس واقعہ کے ایام میں آیت یا آیات نازل ہوئی ہوں ان میں اس واقعہ کا حکم بیان ہوا ہو جو نبی رحمت ﷺ کے زمانہ میں پیش آیا ہو اسے زیر بحث لایا گیا ہو اسے سبب نزول کہتے ہیں۔

تفسیر القرآن میں ناسخ اور منسوخ کی پہچان بھی بہت اہم ہے اس کا تعلق بھی تفسیر القرآن بالقرآن سے ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ایک حکم دیتا ہے۔ اور حکمت کے تحت اسے منسوخ کرکے اس کی جگہ نیا حکم آجاتا ہے مثلاً زانی مرد یا عورت کی آغاز میں سزا قرآن نے بیان کی:

﴿ٱلَّٰتِي يَأۡتِينَ ٱلۡفَٰحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمۡ فَٱسۡتَشۡهِدُواْ عَلَيۡهِنَّ أَرۡبَعَةٗ مِّنكُمۡۖ فَإِن شَهِدُواْ فَأَمۡسِكُوهُنَّ فِي ٱلۡبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّىٰهُنَّ ٱلۡمَوۡتُ﴾[2]

(اگر تمہاری عورتیں کوئی بے حیائی کا کام کریں پس اس پر تم چار گواہ لاؤ پس اگر وہ گواہی دیں تو ان کو اپنے گھروں میں روک لو یہاں تک کہ ان کو موت آئے)

یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی ناسخ آیت ہے

: ﴿ٱلزَّانِيَةُ وَٱلزَّانِي فَٱجۡلِدُواْ كُلَّ وَٰحِدٖ مِّنۡهُمَا مِاْئَةَ جَلۡدَةٖ﴾[3]

(اگر زانی مرد یا عورت بے حیائی کا ارتکاب کرے تو اسے سو کوڑے مارے جائیں)

علاوہ ازیں، علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ:

هو علم يورثه الله تعالىٰ لمن عمل بماعلم واليه اشارة بقوله تعالىٰ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَۖ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱللَّهُۗ وَٱللَّهُ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمٞ وبقوله ﷺمن عمل بما علم ورثه الله علم مالم يعلم قال السيوطى بعد ان عدعلماً الموهبة من العلوم التى لابدلهٰنا[4]

1۔ الزرقانی، محمد عبدالعظیم ، **مناہل العرفان فی علوم القرآن** (مطبع عیسیٰ البابی الحلبی (س۔ن) 126/1

2۔ النساء:15

3۔ النور :2

4۔ الذہبی ، **التفسیر والمفسرون** 231/1

(یہ ایسا علم ہے جس کا وارث اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بناتا ہے جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں (اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا اللہ سے ڈرو اللہ تعالیٰ تمہیں سکھائے گا اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے) اور نبی رحمت ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اس علم پر عمل کیا جس کا اللہ تعالیٰ نے اس کو وارث بنایا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ علم بھی عطا فرما دیتا ہے جو وہ نہیں جانتا امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں اس سے علماء نے وہ خاص علم مراد لیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطا ہے وہی یہاں مراد ہے۔)

تفسیر اشاری کے لیے اضافی اصول :

تفسیر اشاری کو اگرچہ جوڑا تو دور صحابہ سے جاتا ہے مگر اس روایت میں ، جوں جوں ارتقاء ہوا، غلو اور افراط و تفریط در آیا۔ لہٰذا، مفسرین نے کچھ مزید اصول بنائے جو تفسیر اشاری کی قبولیت کے لیے ضروری قرار دیئے گئے ہیں۔ علماء کی طرف سے واضح کیا گیا ہے کہ تفسیر اشاری اس وقت قابل قبول ہو گی جب وہ متذکرہ شرائط پر پوری اترے گی۔ ان شرائط کو بہت سے مفسرین نے اپنی کتب اصول تفسیر میں لکھا ہے البتہ اس کی ترتیب اور توضیح سب سے بہتر انداز میں علامہ زرقانی نے نے، مناہل العرفان میں کی ہے، وہ فرماتے ہیں :

"تفسیر الاشاری لا یکون مقبولاً الا بشروط خمسة"[1]

(تفسیر اشاری اسی وقت تک قبول نہ ہو گی جب تک وہ ان پانچ شرائط پر پوری نہ اترے)

ا۔ سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ آیت کی تفسیر میں آیات کے سیاق و سباق اور نظم قرآنی کا خیال رکھا جائے کہ قرآن مجید میں آیت کے مفہوم کا تسلسل برقرار رہے:

"الا یتنافی ما یظہر من معنیٰ نظم القرآن الکریم" [2]

(یہ معنیٰ نظم قرآن کے مرادی معنیٰ کے خلاف نہ ہو)

مراد یہ ہے کہ جو معنیٰ نظم قرآنی سے ثابت ہو رہا ہے آیت کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے گا اور قرآن مجید کے نظم اور تسلسل کو برقرار رکھا جائے گا اور الگ سے ایسا مفہوم نکالنے کی کوشش نہیں کی جائے گی جو ربط میں بے ضبط ہو اور آیت کے مفہوم کو ہی بدل دے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تفسیر اشاری میں ایسے مفاہیم پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو سابق کلام سے ربط اور تعلق نہیں رکھتے۔ مثلاً:

1۔ الزرقانی ، **مناہل العرفان فی علوم القرآن** ،81/2.

2۔ ایضاً ،81/2.

﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ ٱللَّهَ يَدُ ٱللَّهِ فَوۡقَ أَيۡدِيهِمۡ﴾[1]

(بے شک وہ لوگ جنہوں آپ کے ہاتھ پر بیعت کی بے شک انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پے بیعت کی ان کے ہاتھوں پے خدا کا ہاتھ تھا)

بعض اشاری مفسرین نے ایسا مفہوم بھی مراد لیا ہے جو کسی بھی اعتبار سے نظم قرآنی سے تعلق نہیں رکھتا اور اصول تفسیر کے کسی قاعدہ کی روشنی سے صحیح نہیں ہے۔ مثلاً عبد الغنی نابلسی نے لکھا ہے:

"وقد اخبر الله تعالیٰ ان نبیہ ﷺ وبوالله تعالیٰ وتقدس بیعتہ بیعت الله ویدہ التی مدت للبیعتہ بی یدالله کما سمعت من آیۃ الشریفۃ"[2]

(اس میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اس کا نبی ﷺ بھی خدا ہی ہے اس کی بیعت کی تقدیس ایسے ہی ہے جیسے اللہ کی بیعت ہے اور اس مدت کے درمیان ان کا ہاتھ خدا کا ہاتھ تھا جیسا کہ اس آیہ مقدسہ میں ہے)

یہ ظاہر نص کے خلاف ہے اس کے قبل بالکل متصل واقعہ صلح حدیبیہ کا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں:

" فکانت بیعت النبیﷺ التی بایع علیہا الناس البیعۃ لله والطاعۃ للحق وَأخرج عبد بن حمید عَن الحکم بن الْأَعْرَج رَضِي الله عَنهُ {یَد الله فَوق أَیْدهم} قَالَ: أَن لَا یفروا"[3]

(پس یہ نبی ﷺ سے بیعت تھی جو لوگوں نے کی یہ اللہ کے لیے اور حق کی اطاعت کے لیے تھی۔ عبد بن حمید سے روایت ہے وہ حکم بن اعرج سے روایت کرتے ہیں: (ید اللہ فوق ایدیہم) سے مراد تاکید ہے کہ اس عہد سے فرار کا راستہ اختیار نہ کیا جائے)

گویا، سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے استعارہ مراد لیا ہے۔ یعنی اس بیعت میں ہاتھ اللہ تعالیٰ کا نہیں تھا ہاتھ تو رسول اللہ ﷺ کا ہی تھا مگر اس وعدہ کی حیثیت منفرد اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بہت تھی اس لیے اس عہد کی حیثیت واضح کرنے کے لئے اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب کر لیا حقیقت میں اس سے مراد اللہ کا ہاتھ لینا نظم قرآنی کے خلاف ہے۔

ب۔ بعض اہل باطن تفسیر اشاری میں ایسی تاویلات کرتے ہیں جو حقائق اور قرائن کے مطابق نہیں ہوتی اور اس پر مزید یہ شرط بھی عائد کر دیتے ہیں کہ اس کے علاوہ، اس آیت کا مفہوم نہیں ہو سکتا۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ بھی ضروری ہے کہ

1۔ الفتح: 10

2۔ طاہر محمود یعقوب، **اسباب الخطا فی التفسیر** 1/ 753

3۔ السیوطی ، **الدر المنثور** ، 517/7

کسی اشاری تعبیر پر یہ شرط عائد نہ کی جائے کہ صرف یہ ہی صحیح ہے:"الا یدعیٰ انه المراد وحده"[1] (اس میں یہ دعویٰ نہ کیا جائے کہ اس سے مراد صرف یہی ہے)۔

مثلاً آیت الکرسی کا حصہ:"من ذالذی یشفع عنده الا باذنه"[2] (کون ہے جو اس کی بارگاہ سفارش کرے مگر اس کی اجازت سے) کی تفسیر اشاری یوں کی گئی ہے:

" ان ہٰہنا من ذل ای من الذل ذی اشارة الیٰ النفس یشف من الشفا جواب من "ع"اثر من الوعی--"[3]

(یہاں ذل، ذلت سے ہے۔ ذی اسم اشارہ ہے جو نفس کی جانب ہے۔ یشف شفا سے ہے، جواب "ع" سے ہے۔ یہ اثر گناہوں کا ہے۔)

یہ تفسیر بعید از حقائق ہے۔ اسم موصول الذی کو تبدیل کر کے فعل بنا دیا اور لفظ یشفع کو توڑ دیا گیا ہے۔

مذکورہ آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں:

" مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ لَمَمَالِيكِهِ إِنْ أَرَادَ عُقُوبَتَهُمْ إِلَّا أَنْ يَخْلِيَهُ، وَيَأْذَنَ لَهُ بِالشَّفَاعَةِ لَهُمْ، وَإِنَّمَا قَالَ ذَلِكَ تَعَالَى ذِكْرُهُ لِأَنَّ الْمُشْرِكِينَ قَالُوا: مَا نَعْبُدُ أَوْثَانَنَا هَذِهِ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى، فَقَالَ اللَّهُ تَعَالَى ذِكْرُهُ لَهُمْ: لِي مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ، مَعَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مُلْكٌ، فَلَا تَنْبَغِي الْعِبَادَةُ لِغَيْرِي، فَلَا تَعْبُدُوا الْأَوْثَانَ الَّتِي تَزْعُمُونَ أَنَّهَا تُقَرِّبُكُمْ مِنِّي زُلْفَى، فَإِنَّهَا لَا تَنْفَعُكُمْ عِنْدِي وَلَا تُغْنِي عَنْكُمْ شَيْئًا، وَلَا يَشْفَعُ عِنْدِي أَحَدٌ لِأَحَدٍ إِلَّا بِتَخْلِيَتِي إِيَّاهُ وَالشَّفَاعَةِ لِمَنْ يَشْفَعُ لَهُ مِنْ رُسُلِي وَأَوْلِيَائِي وَأَهْلِ طَاعَتِي"[4]

(اس کی بادشاہی میں کون سفارش کر سکتا ہے اگر وہ سزا کا ارادہ کر لے مگر جس کو وہ اجازت عطا فرمائے اس سے مشرکین کو یاد دلانا مقصود ہے جو کہتے تھے کہ ہم بتوں کی عبادت اس وجہ سے کرتے ہیں تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کے قریب ہوں اور ہمیں کامیابی ملے اس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ زمین و آسمان کی کل بادشاہی میرے لئے ہے پس میرے علاوہ کسی کی جانب متوجہ نہ ہوں پس بتوں کی عبادت نہ کرو اس بنا پر کہ یہ تمہیں میرے قریب کرتے ہیں نہ تو یہ تمہیں کوئی نفع دیتے ہیں اور نہ ہی مجھ سے نقصان سے بچا سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی میری بارگاہ میں کسی کی سفارش کر سکے گا مگر جو میرے خلیل ہوں گے میری بارگاہ میں سفارش صرف میرے رسولوں، اہل طاعت اور اولیاء کی ہو گی۔)

1۔ الزرقانی **مناہل العرفان**، 81/2

2۔ البقرۃ:255

3۔ السیوطی، **الاتقان**، 224/4

4۔ الطبری، **جامع البیان** 535/4

ج: اشاری تفسیر اس وقت تک معیاری اور صائب شمار نہیں کی جاسکتی جب تک اس کی تائید کسی شرعی اور عقلی دلیل سے نہ ہو " الا یکون لہ معارض شرعی وعقلی "[1] (یہ کہ اس پر کوئی عقلی اور شرعی اعتراض موجود نہ ہو) اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کی ایسی تعبیر کی جائے جو تفسیر بالماثور کے خلاف نہ ہو عقلی اور نقلی دونوں اعتبار سے قابل قبول ہو۔

مثلاً سورۃ الفاتحہ کے الفاظ: ایاک نعبد [2] (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔) کی تفسیر میں یوں کہا گیا:

"ای نخضع و نذل ونعترف بربوبیتک ونوحدک ونخدمک ومنہ مشتق اسم العبد"[3]

(ہم عاجزی اور تذلل کا اظہار کرتے ہیں ہم معترف ہیں تیری ربوبیت کے تیری توحید کے اور اسی سے لفظ عبد مشتق ہے)

اسی آیہ مقدسہ کی تشریح تفسیر بالماثور سے لیتے ہیں، علامہ ابن جریر فرماتے ہیں:

"عن عبد الله بن عباس، قال: قال جبريلُ لمحمد ﷺ: قل يا مُحَمَّد: (إِيَّاكَ نَعْبُدُ) ، إياكَ نُوحِّد ونخاف ونرجو يا ربَّنا لا غيرك"[4]

(حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے کہ اے محمد ﷺ فرمادیں ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں یعنی تمہیں واحد مانتے ہیں تم سے ڈرتے ہیں اور ہمارے رب ہم تجھ سے امید رکھتے ہیں تیرے علاوہ کسی سے نہیں)

گویا ان الفاظ سے مراد ہے کہ: معبود بھی وہی ذات ہے اور اور ہر مصیبت میں امید بھی اسی ذات سے ہے ایک طرف عبادت کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کیا گیا ہے تو دوسری جانب عبادت میں اخلاص اور تذلل کا ذکر کیا گیا ہے۔

د: کوئی بھی تفسیر اس انداز میں نہ کی جائے کہ مفاہیم، تاویل بعید میں تبدیل ہو جائے " ان لایکون تاویلاً بعیداً سخیفاً " [5] (یہ کہ تاویل بعید اور کمزور نہ ہو الفاظ کو توڑ مروڑ کر عجیب مفہوم پیدا نہ کیا گیا)۔ مثال کے طور پر دیکھیں سورۃ العنکبوت کی آیت کا آخری حصہ: ﴿ وَإِنَّ ٱللَّهَ لَمَعَ ٱلۡمُحۡسِنِينَ﴾[6] (بے شک اللہ تعالیٰ محسنین کے ساتھ ہے)۔

1۔ الزرقانی، **مناہل العرفان** 81/2

2۔ الفاتحہ: 4

3۔ التستری، **تفسیر تستری**، 86

4۔ الطبری **جامع البیان**، 157/1

5۔ الزرقانی **مناہل العرفان**، 81/2

6۔ العنکبوت: 69

تفسیر اشاری میں یوں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ:"كلمة "لمع "ماضياً وكلمة المحسنين مفعولاً "[1] (اس میں لمع فعل ماضی اور المحسنین مفعول ہے)۔

آیت مقدسہ میں ہے:

"والذين جاہدوا فينا لنہدينہم سبلنا ان الله لمع المحسنين"[2]

(وہ لوگ جو ہمارے راستہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو اپنی جانب راستہ دکھاتے ہیں، بے شک اللہ احسان کا رویہ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

علامہ ابن جریر طبری، اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

والذين قاتلوا هؤلاء المفترين على الله كذبا من كفار قريش، المكذّبين بالحقّ لما جاءهم فينا، مُبتغين بقتالهم علوّ كلمتنا، ونُصرة ديننا (لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنا) يقول: لنوفقنهم لإصابة الطريق المستقيمة، وذلك إصابة دين الله الذي هو الإسلام الذي بعث الله به مُحَمَّدا ﷺ (وَإِنَّ اللهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ) يقول: وإن الله لمع من أحسن من خلقه، فجاهد فيه أهل الشرك، مُصَدّقا رسوله فيما جاء به من عند الله بالعون له، والنصرة على من جاهد من أعدائه 3

(وہ لوگ جنہوں نے مسلمانوں سے جنگ کی یہ سب اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنے والے قریشی کافر ہیں جو حق کو جھٹلانے والے ہیں جب ان کے پاس آیا ہمارا ان کے ساتھ جہاد کا مقصد کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو اور ہمارے دین کی مدد ہو (تو ضرور ضرور ہم ان کو سیدھی راہ دکھائیں گے۔) یعنی ہم ان کو صراط مستقیم کی جانب ہدایت دیں گے اس دین پہنچانے سے یہی مراد ہے۔ اور وہ اسلام جس کو محمد ﷺ لے کر تشریف لائے اور ان اللہ مع المحسنین سے مراد جس کا اخلاق اچھا ہو اور اہل شرک کے ساتھ جہاد کرتا ہو اس رسول ﷺ کی تصدیق کرتا ہو اس کی جو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے اس کی مدد سے اور نصرت سے س ان پر جنہوں نے دشمنوں سے جہاد کیا۔)

گویا، محسنین سے مراد وہ افراد ہیں جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے مشرکین سے جہاد کرتے ہیں اور اپنی عادات اور فکر کو دین کے تابع کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت ان کے ساتھ ہوتی ہے۔

1۔ الزرقانی **مناہل العرفان**، 81/2

2۔ العنکبوت: 69

3۔ الطبری، **جامع البیان** 63/20

ر: پانچویں شرط یہ ہے کہ اشاری تعبیر کی کوئی تائید شرعی موجود ہو۔"ان یکو ن لہ شاہد شرعی یوئیدہ" [1](اس پر کوئی دلیل موجود ہو جس کی شریعت تائید کرتی ہو)۔مثال کے طور پر سورۃ النمل کی وہ آیت ملاحظہ ہو جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام، ایک پرندے ہدہد کو اپنے سامنے حاضر نہ پانے پر سوال کرتے ہیں کہ وہ کہاں اور کیوں غائب ہے:

﴿وَتَفَقَّدَ ٱلطَّيۡرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ أَرَى ٱلۡهُدۡهُدَ أَمۡ كَانَ مِنَ ٱلۡغَآئِبِينَ﴾[2]

(انہوں نے پرندے کو غائب پایا اور فرمایا کیا وجہ ہے کہ مجھے ہدہد نظر نہیں آرہا وہ کیوں غائب ہے)

اس آیت مقدسہ کی تعبیر میں، تفسیر اشاری میں کہا گیا:

"ان الطیر الحقیقۃ لسلیمان طیر قلبہ فتفقدہ ساعۃًوکان قلبہ غائباً فی غیب الحقیقۃ مشغولاً بالمذکور عن الذکر"[3]

(اس پرندے کی مثال سلیمان علیہ السلام کے دل کی ہے جو ایک لمحہ کے لیے گم گیا اور آپ کا دل غیب کی حقیقت سے غائب ہو گیا اللہ کے ذکر سے مذکور میں مشغول ہو گیا۔)

یہ ایسی تاویل ہے، جس کی کوئی تائید شرعی نہیں ہے۔یہ تاویل سوائے ابو محمد شیرازی کے اور کسی نے نہیں کی ہے۔

علامہ ابن جریر طبری، اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"قُولُ تَعَالَى مُخْبِرًا عَنْ قِيلِ الْهُدْهُدِ لِسُلَيْمَانَ مُخْبِرًا بِعُذْرِهِ فِي مَغِيبِهِ عَنْهُ: {إِنِّي وَجَدْتُ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ} [النمل: ٢٣] يَعْنِي تَمْلِكُ سَبَأً، وَإِنَّمَا صَارَ هَذَا الْخَبَرُ لِلْهُدْهُدِ عُذْرًا وَحُجَّةً عِنْدَ سُلَيْمَانَ دَرَأَ بِهِ عَنْهُ مَا كَانَ أَوْعَدَ بِهِ، لِأَنَّ سُلَيْمَانَ كَانَ لَا يَرَى أَنَّ فِي الْأَرْضِ أَحَدًا لَهُ مَمْلَكَةٌ مَعَهُ "[4]

(ہدہد نے سلیمان علیہ السلام کو اپنے غائب ہونے کی خبر دی اور معذرت پیش کی اور سلیمان علیہ لسلام کے پاس دلیل پیش کی اور اس چیز سے محفوظ ہوا جس کا سلیمان علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا۔ کیونکہ سلیمان علیہ السلام نہیں جانتے تھے کہ ان کے علاوہ بھی یہاں کسی کی حکومت ہے۔)

الغرض، خلاصہ بحث کے مطابق دیکھیں تو تفسیر اشاری کی علماء کے ہاں قبولیت کی شرائط وہ ہیں، جن پر انحصار تفسیر بالرائے محمود میں کیا جاتا ہے۔ تفسیر بالرائے کا ایک اصول منقول پر اعتماد ہے۔ اس سے مراد ہے کہ جو تفسیر قرآن

1۔ الزرقانی، **مناہل العرفان**، 81/2

2۔النمل: 40

3۔الذہبی التفسیر والمفسرون343/2

4 ۔ الطبری، **جامع البیان**39/18

وسنت اور اقوال صحابہ و تابعین سے منقول ہے۔اسی طرح تفسیر بالرائے کے لیئے صحت اعتقاد بھی شرط ہے، جس سے مفسر اپنی حدود اور احکامات کی تعیین میں غلطی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ تفسیر بالماثور تاریخی تناظر میں لکھی جاتی ہے جب کہ تفسیر بالرائے عقلی دلائل کی روشنی میں، لہٰذا صحت اعتقاد، اخلاص نیت اور صحت مقصد سے انسان اپنی منزل اور مقصد کی تعیین میں غلطی سے بچ جاتا ہے۔

فصل سوم:

تفسیر ابن عربی کے تفردات:

تفسیر ابن عربی کے تفصیلی مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ تفسیر نہ صرف کئی مقامات پر تفسیر بالماثور سے مختلف ہے بلکہ یہ تفسیر اشاری کی روایت میں بھی انفرادیت کی حامل ہے۔ اس تجزیے کو ذیلی نکات کی صورت میں واضح کرنا ضروری ہے۔

حروف مقطعات کی وضاحت میں تفسیری روایت:

حروف مقطعات کی تعبیر و تشریح میں بالعموم مفسرین نے خاموشی اختیار کی ہے۔ بعض نے ان حروف کے معانی متعین کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ اکثریت نے انہیں ایسے راز سے تعبیر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان ہے۔

علامہ قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کا راز ہیں اور اس کہ وضاحت میں فرماتے ہیں:

"فَقَالَ عَامِرٌ الشَّعْبِيُّ وَسُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ وَجَمَاعَةٌ مِنَ الْمُحَدِّثِينَ: هِيَ سِرُّ اللَّهِ فِي الْقُرْآنِ، وَلِلَّهِ فِي كُلِّ كِتَابٍ مِنْ كُتُبِهِ سِرٌّ. فَهِيَ مِنَ الْمُتَشَابِهِ الَّذِي انْفَرَدَ اللَّهُ تَعَالَى بِعِلْمِهِ، وَلَا يَجِبُ أَنْ يُتَكَلَّمَ فِيهَا، وَلَكِنْ نُؤْمِنُ بِهَا وَنَقْرَأُ كَمَا جَاءَتْ. وَرُوِيَ هَذَا الْقَوْلُ عَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا"[1]

(عامر شعبی، سفیان ثوری اور محدثین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ: یہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا راز ہیں اور ہر کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ راز ہیں۔ پس یہ متشابہات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے منفرد کر لیا ہے اور ان میں لازم ہے کہ کلام نہ کیا جائے مگر ان پر ایمان رکھا جائے اور ہم اس کو پڑھیں جیسے یہ (قرآن میں) آئے ہیں اور سیدنا ابو بکر صدیق اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما سے بھی یہی (مؤقف) مروی ہے۔)

اسی طرح علامہ سمرقندی، بحر العلوم میں کچھ صحابہ کے اقوال نقل کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

روي عن عمر وعثمان وابن مسعود- ﷺ- أنهم قالوا: الحروف المقطعة من المكتوم الذي لا يفسر[2]

(حضرت عمر، عثمان اور ابن مسعود سے مروی ہے وہ کہتے ہیں حروف مقطعات راز ہیں ان کی تفسیر نہیں ہے)

1۔ القرطبی ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری۔ **الجامع لاحکام القرآن** (دار الکتب مصریہ قاہرہ، 1964ء) 154/1

2۔ السمرقندی، ابو اللیث نصر بن محمد بن احمد، **بحر العلوم** (مکتبہ شاملہ 1991ء) 21/1

تاہم، تفسیر ابن عباس میں حروف مقطعات کی تشریحات آئی ہیں، جیسے ال م کی تعبیر:

"{الم} يَقُول ألف الله لَام جِبْرِيل مِيم مُحَمَّد وَيُقَال ألف آلاؤه لَام لطفه مِيم ملكه وَيُقَال ألف ابْتِدَاء اسْمه الله لَام ابْتِدَاء اسْمه لطيف مِيم ابْتِدَاء اسْمه مجيد وَيُقَال أَنا الله أعلم وَيُقَال قسم أقسم بِهِ"[1]

(الف سے مراد اللہ لام سے مراد جبرائیل م سے مراد محمد ﷺ اور یہ بھی کہا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے الف سے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں لام سے اس کا لطف میم سے اس کی ملک اور بادشاہی اور یہ بھی کہا گیا ہے الف اس کے نام اللہ کی ابتدا ہے لام اس کے نام لطیف کی ابتدا ہے اور میم اس کے نام مجید کی ابتدا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے میں ہی سب سے زیادہ جانتا ہوں اور یہ بھی کہا گیا ہے قسم ہے اور اس سے قسم کھائی گئی ہے)

الغرض، تفسیر ماثور کی روایت میں ، مرویات صحابہ کی اکثریت سے یہ تعبیر ہی اخذ کی گئی کہ حروف مقطعات آیات متشابہات میں سے ہیں اور یہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان ایک راز کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کی تعبیر و تشریح میں توانائی لگانے سے گریز کرنا چاہیے۔

حروف مقطعات سے متعلق ابن عربی کا نقطہ نظر:

تاہم اشاری تعبیرات ، میں مقطعات کی وضاحت کرنے کی روایت عام ہے۔ سہل بن عبد اللہ تستری نے سورۃ الاعراف کے شروع میں آنے والے مقطعات "المص" کی وضاحت یوں کی ہے :

"المص" يعني أنا الله أقضي بين الخلق بالحق ومن هذه الحروف اسم الله تعالى وهو الصمد" [2]

(المص سے مراد ہے میں ہی اللہ ہوں جو مخلوق میں حق کے ساتھ فیصلہ کرنے والا ہوں اور ان حروف سے مراد اللہ تعالیٰ کا نام الصمد ہے)

گویا، حضرت سہل بن عبد اللہ تستری کی رائے میں ، اللہ تعالیٰ نے ان حروف میں اپنی بے نیازی کا ذکر کیا ہے اور اپنی عظمت بیان کی ہے کہ وہ اپنی مخلوق میں حق کے ساتھ فیصلہ کرنے والا ہے جبکہ ابن عربی کی ان الفاظ (ا،ل،م،ص) سے متعلق لکھتے ہیں:

"ا،اشارة الى احدية و "ل "الى الذات مع صفت العلم كما مرو"م" الى التمية الجادلة التى هى معنى مُحَمَّد: اى نفسه و حقيقته ،و"ص "الى صورة المحمديه التى هى جسده و ظاهره "[3]

1۔ابن عباس، **تنویر المقیاس**،(دارالکتب العلمیہ لبنان2010ء)3

2التستری ، **تفسیر تستری** ،65

3۔ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 251/1

(الف سے اشارہ ذات احدیت کی طرف ہے ل سے اشارہ ذات کے ساتھ صفت علم کی جانب ہے اور م سے اشارہ تمیمیت جامعہ کی جانب ہے یعنی کامل تر جامعیت نور محمدی ﷺ ہے (یعنی آپ ﷺ کی ذات اور آپ ﷺ کی حقیقت) اور ص سے مراد آپ ﷺ کی ظاہری صورت اور جسم مبارک ہے۔)

گویا ابن عربی کی رائے میں الف سے اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے اور ل سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفت علم ہے م سے مراد نبی رحمت ﷺ کی جامعیت ہے اور ص سے مراد آپ ﷺ کا ظاہری جسد اطہر مراد ہے۔ الغرض المص کی اس توجیہ کو حضرت سہل بن عبد اللہ تستری کی توجیہ کے تقابل میں دیکھیں تو انہوں نے المص سے مطقاً اللہ تعالیٰ کی ذات مراد لی ہے اور اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام صمد مراد لیا ہے جبکہ ابن عربی نے اس سے اللہ تعالیٰ کی واحدانیت اللہ تعالیٰ کی صفت علم، حضور ﷺ کی ذات اور ظاہری صورت مراد لی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس تشریح کی دلیل شرعی، کسی کے پاس نہیں ہے۔ لہٰذا، ابن عربی نے اس کی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔

معجزہ موسوی کی وضاحت میں ابن عربی کا تصور محل نظر ہے:

ابن عربی کی انفرادیت کا ایک رخ یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہ اپنی تفسیر میں، انبیائے کرام کے معجزات کو ان کی تہذیب نفس کے کمالات سے منسوب کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ معجزہ ہے جس میں عصائے مقدسہ کے ذریعے بارہ چشمے پھوٹے تھے۔

آیہ مقدسہ میں ہے:

﴿وَإِذِ ٱسۡتَسۡقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوۡمِهِۦ فَقُلۡنَا ٱضۡرِب بِّعَصَاكَ ٱلۡحَجَرَۖ فَٱنفَجَرَتۡ مِنۡهُ ٱثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡنٗاۖ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٖ مَّشۡرَبَهُمۡۖ كُلُواْ وَٱشۡرَبُواْ مِن رِّزۡقِ ٱللَّهِ وَلَا تَعۡثَوۡاْ فِي ٱلۡأَرۡضِ مُفۡسِدِينَ﴾[1]

(اور یاد کرو جب پانی کی دعا مانگی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے تو ہم نے فرمایا تم مارو اپنا عصا فلاں چٹان پر تو فوراً اس سے بہہ نکلے بارہ چشمے پہچان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ کھاؤ اپیؤ اللہ کے دیئے گئے رزق سے اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے)

ابن عربی نے اس کی تفسیر اپنے حساب سے کی ہے، جو تفسیر کی ساری روایت کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ اصول تفسیر سے بھی مطابقت نہیں رکھتی۔ اس تعبیر کی کوئی شرعی اور عقلی دلیل دیئے بغیر وہ لکھتے ہیں:

1۔ البقرۃ:60

"من مياه العلوم على عدد المشاعرالانسانية التى ہى الحواس الخمس الظاہرة والخمس الباطنة ، والعاقلة النظرية والعلميہ ولہذا قال علیہ الصلوٰة ولسلام ((من فقد حسا فقد فقد علما))[1]

(پانی سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے انہیں اعصاء نفس کی ضرب لگانے کا حکم دیا جو دماغ کے پتھر پر پڑتا ہے جو عقل کا تقاضا ہے (اس سے) انسانی مشاعر کی تعداد کے مطابق علوم کے پانیوں کے بارہ چشمے جاری ہوگئے جو پانچ حواس ظاہرہ اور پانچ حواس باطنہ ، ایک قوت عاقلہ نظریہ اور ایک قوت علمیہ ہے۔ اس لئے نبی رحمت ﷺ نے فرمایا جس کی حس گم ہو گئی اس کا علم گم ہو گیا)

گویا ابن عربی کے ہاں ، بارہ چشموں سے مراد پانچ ظاہری حواس قوت سامعہ، قوت باصرہ، قوت شامہ، قوت ذائقہ اور قوت لامسہ اور پانچ باطنی حواس قلب، روح، سر، خفی اور اخفیٰ اور دو قوت نظریہ اور قوت علمیہ ہے۔ یہ کل بارہ مشاعر مراد ہیں جو انسان میں اس کے حواس کو برقرار رکھتے ہیں ظاہری حواس ظاہر کو اور باطنی باطن کو اور قوت نظریہ فکر کو اور علمیہ فیصلہ کی قوت کو برقرار رکھتی ہے۔

مذکورہ بالا آیہ مقدسہ کی تفسیر میں دیگر اشاری مفسرین نے کلام نہیں کیا۔ جب کہ دوسری طرف، جمہور مفسرین کرام کے نزدیک یہ معجزہ حقیقی دنیا میں واقع ہوا، اور پتھر سے حقیقی طور پر پانی کے بارہ چشمے جاری ہوئے تھے، جس سے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی سیرابی کا اہتمام ہوا۔ مفسرین نے اس پتھر کی اور بارہ چشموں کی پوری تفصیل بیان کی ہے اور اس سے نکلنے والے چشموں اور قبائل کی تعداد اور تفصیل تک بیان کی ہے۔

مثال کے طور پر، علامہ آلوسی نے روح المعانی لکھا ہے:

"وهو حجر معين حمله معه من الطور مكعب له أربعة أوجه ينبع من كل وجه ثلاثة أعين، لكل سبط عين تسيل في جدول إلى السبط الذي أمرت أن تسقيهم، وكانوا ستمائة ألف ما عدا دوابهم، وسعة المعسكر اثنا عشر ميلا، وقيل: حجر كان عند آدم وصل مع العصا إلى شعيب فدفع إلى موسى"[2]

(یہ خاص پتھر تھا جو آپ طور سے لائے تھے مکعب نما اس کی چار سمتیں تھیں ہر جانب سے چشمے ابلتے تھے اس کی ہر جانب سے تین چشمے جاری ہوتے ہر قبیلہ کی جانب یہ چشمے بہتے جن کو پانی پلانے کا حکم دیا گیا تھا یہ چھ لاکھ افراد تھے اس کے علاوہ ان کے جانور بھی تھے اور ان کا یہ لشکر بارہ میل تک پھیلا ہوا تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ پتھر آدم علیہ السلام کے پاس تھا جو عصا سمیت شعیب علیہ السلام کے پاس آیا اور ان سے موسیٰ علیہ السلام تک پہنچا)

1۔ ابن عربي، **تفسیر ابن عربي** 56/1

2۔ الآلوسی ، **روح المعانی** 271/1

ایک اور محل نظر پہلو:

ابن عربی کے منفرد انداز کی ایک جہت، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور فرعون کے تذکرے میں ملتی ہے، جہاں وہ کہتے ہیں موسیٰ قلب ہے، ہارون عقل ہے اور فرعون نفس امارہ ہے۔ یہ تعبیر تفسیری روایت اور حقیقت حال سے برعکس ہے۔ قرآن میں آیا کہ :

ٱذۡهَبۡ أَنتَ وَأَخُوكَ بِـَٔايَٰتِي [1](اب جایئے آپ اور آپ کا بھائی ہماری نشانیاں لے کر)

ابن عربی نے لکھا ہے:

" اذهب یا موسیٰ القلب انت واخوک العقل بأیتی ای حجتی وبیناتی لاتفتروا فی ذکری الیٰ فرعون النفس الامارة الطاغیة المجازة حدہا باالاستعلاء الاستیلاء علیٰ جمیع القوی الروحانیة "[2]

(تم اے موسیٰ یعنی قلب اور تمہارا بھائی ہارون یعنی عقل میری واضح نشانیوں کے ساتھ فرعون یعنی نفس امارہ کی طرف جاو جو جمیع قوائے روحانیہ پر استعلاء اور غلبہ کے ساتھ اپنی حدود سے سرکشی اور تجاوز کر گیا ہے)

جب کہ قرآن کے بیان اور تاریخی حقائق سے واضح ہے کہ یہ تینوں مستقل بالذات، شخصیات تھیں، اور ان سے متعلق واقعات، حقیقی دنیا کے امر واقعی کا حصہ ہیں۔

مقام مذکور پر تفسیر ابن عباس میں یوں ہے:

"{اذْهَبْ أَنتَ وَأَخُوكَ} هَارُون {بِآيَاتِي} بِالْيَدِ والعصا {وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي} لَا تضعفا وَلَا تعجزا وَلَا تفترا فِي تَبْلِيغ رسالتي إِلَى فِرْعَوْن"[3]

(اے موسیٰ آپ جائیں اور آپ کے بھائی ہارون میری آیات کے (ید او بیضاء اور عصا) کے ساتھ اور میری یاد کو نہ بھولو اور نہ ہی کمزوری اور عجز کا اظہار نہ کرنا اور نہ ہی کمی دکھانا تبلیغ رسالت میں فرعون کی جانب)

علامہ طبری لکھتے ہیں:

(اذْهَبْ أَنْتَ وَأَخُوكَ) هارون (بآياتي) يقول: بأدلتي وحججي، اذهبا إلى فرعون بها إنه تمرّد في ضلاله وغيه، فأبلغاه رسالاتي (وَلا تَنِيَا فِي ذِكْرِي) يقول: ولا تضعفا في أن تذكراني فيما أمرتكما ونهيتكما"[4]

---

1 - طه: 42

2۔ ابن عربي، **تفسیرابن عربي** ، 21/2

3۔ ابن عباس ، **تنویر المقیاس،**262

4۔الطبری ،**جامع البیان** 312/18

(اے موسیٰ آپ جائیں اور آپ کا بھائی ہارون میری آیات کے ساتھ اور دلائل اور براہین کے ساتھ تم دونوں فرعون کی جانب کہ وہ گمراہی میں سرکش اور باغی ہو گیا ہے اس تک میرا پیغام پہنچاؤ اور میرا ذکر مت بھولنا اور نہ کمزور پڑنا میری نصیحتوں کو پہنچانے میں جو تم کو حکم دیا جارہا یا منع کیا جارہا ہے)

مذکورہ واقعہ کی ایک پوری تاریخ ہے جس کو بالماثور اور بالرائے المحمود سب تفاسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ موسیٰ ،ہارون یہ انسانی اعضاء نہیں اور نا ہی انسانی نفس کی کیفیات ہیں۔ ہارون و موسیٰ علیہم السلام حقیقت میں انسان اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور فرعون حقیقت میں ایک سرکش شخص اور مصر کا حکمران تھا۔ تو ابن عربی کی یہ توجیہ بھی بغیر کسی عقلی اور نقلی دلیل کے ہے۔

قلب انسانی کی ماہیت کے بارے ابن عربی کی توضیحات:

قرآن مجید کی تفسیر میں، ایسے مقامات جہاں انسانی قلب کی ماہیت یا صدر انسانی کے انشراح اور تنگ ہونے کا ذکر ہے، ابن عربی کی تشریحات قابل غور ہیں۔ مثلاً آیت مبارکہ:

﴿فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهدِيَهُۥ يَشرَح صَدرَهُۥ لِلإِسلَٰمِ﴾ [1]

(جس کے لئے ارادہ فرمالیتا ہے اللہ کہ ہدایت دے اسے تو کشادہ کر دیتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے)

یہاں شرح صدر سے متعلق ابن عربی نے لکھا ہے کہ یہ ایک قوت عقلی ہے:

"من هذه القوى للانقياد للعقل يشرح صدره اى يسهل عليه ويجعل وجهه الذى يلى القلب ذانتوء وسعة لقبول نوره وممكنا من استسلامه له"[2]

(اس قوت سے عقل پرکھنے کا کام کرتی ہے اور شرح صدر سے مراد اس کا سینہ اس نور کی قبولیت کے لئے کھول دیا جاتا ہے اور اس کے سینہ کے منہ کو قلب سے ملا دیتا ہے اور اس کی روشنی قبول کرنے کی صلاحیت کو بڑھا دیا جاتا ہے اس کے لئے اس کا خدا کے حضور جھکنا ممکن ہو جاتا ہے)

دوسری طرف، اگر انسان میں اچھائی کو قبول کرنے کی صلاحیت ماند پڑ جائے اور اچھائی دل قبول نہ کرے تو یہ ضیق صدر ہوتا ہے مگر جب دل میں نور پیدا ہوتا ہے تو اس سے ہدایت کو قبول کرنے کی صلاحیت بڑھا دی جاتی ہے اور دل جلدی ہدایت قبول کر لیتا ہے اور دوسری جانب جب انسان گمراہی کا شکار ہوتا ہے تو اس کے اثرات مختلف ہو جاتے ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرنا چاہے اس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے اور اس کے لئے یہ امر مشکل کر دیتا ہے، اس لیے فرمایا:

﴿وَمَن يُرِدۡ أَن يُضِلَّهُۥ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجاً-------﴾ [1]

1۔ الانعام:126

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 241/1

(اور جس بدنصیب کے لئے ارادہ فرمالیتا ہے کہ اسے گمراہ کردے تو بنادیتا ہے اس کے سینہ کو تنگ بہت تنگ)

بقول ابن عربی، اس لئے کہ ظلمت، روشنی کو قبول کرنے کی صلاحیت کم کردیتی ہے گویا اس کے سینہ کو اضطراب اور پریشانی سے بھر دیا جاتا ہے:

"ذاظلمۃ وقصور استعداد عن قبول النور کانما یزاول امراً ممتنعاً فی الاستنارۃ بنورالقلب وطلب الفیض منہ" [2]

(اس ظلمت کی وجہ سے نور کو قبول کرنے کی صلاحیت ختم کردی جاتی ہے اور گویا اس نور سے استفادہ کرنے کے امر کو ممتنع اور زائل کردیا جاتا ہے اور دل پھر اسی سے فیض طلب کرتا ہے (جو منفی ہوتا ہے)

گویا روشنی پر اندھیرا غالب آجاتا ہے دل نور سے فائدہ حاصل کرنے کی بجائے اسی اندھیرے سے راہنمائی حاصل کرتا ہے جس کے نتیجہ میں دل کی ظلمت اور اندھیرے میں اضافہ ہوتا ہے جس سے سینہ تنگ ہوجاتا ہے اوراس کے سینہ کو اللہ تعالیٰ حق کے لئے بند کردیتا ہے تو اسے گمراہی اور تاریکی کی سنگت مل جاتی ہے اس کے سینہ میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے اور دوسری جانب جس کو ہدایت کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ کھول دیتا ہے:

"فمن یرداللہ ان یہدیہ للتوحید یشرح صدرہ بقبول نو ر الحق اسلام الوجود الی اللہ لکشف حجب صفات نفسہ عن وجہ قلبہ الذی یلی النفس فیفسح لقبول نور الحق" [3]

(جس کو اللہ تعالیٰ نور کی جانب ہدایت دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے سینہ کو نور حق اور اللہ تعالیٰ کی جانب اسلام کے قبول کے لئے کھول دیتا ہے جس کے ساتھ نفس کے ساتھ ملے ہوئے اس قلب کے منہ سے اس کے نفس کی صفات کا حجاب کھل جاتا ہے (قلب نفس کی ریشہ دوانیوں سے واقف ہوجاتا ہے) تو وہ حق کی روشنی کو قبول کرنے کے لئے کشادہ ہوجاتا ہے)

نفس اپنی برائیوں اور حجابات کی وجہ سے قلب پر غالب آجاتا ہے ان حجابات کی وجہ سے حق دل میں داخل نہیں ہوتا اس کے خلاف جب اللہ تعالیٰ کسی کو شرح صدر عطا فرماتا ہے تو ان ظلمانی حجابات کو ختم فرماتا ہے اور توحید اور حق کو قبول کرنے کے لئے کھل جاتا ہے اور انسان کی طبیعت کو وسعت خاطر مل جاتی ہے۔ اور دل نہ صرف حق کو قبول کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے بلکہ مزید کشادہ ہوجاتا ہے۔

1۔ الانعام:125

2۔ ابن عربی، **تفسیرابن عربی** 241/1

3۔ ایضاً 241/1

ابن عربی کے بقول ہمار اوجود بھی ایک سلطنت ہے اس میں منفی اور مثبت قوتیں بر سر پیکار ہیں۔اسی سے طبیعت کا اطمینان اور اضطراب منسلک ہے اگر اضطراب ہو تو نفس بے قابو ہو جاتا ہے اور اس کی حیثیت فرعون کی ہے۔ لیکن اگر قلب صالح ہو تو وہ نفس کی بری خواہشات اور کیفیات کی اصلاح کرتا ہے۔ مگر اس کی اصلاح کے لئے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔جو نفس کو ایک نظم سے اصلاح کی جانب لاتی ہے مگر یہ کام سختی سے نہیں بلکہ نرمی سے ہی ممکن ہے نفس کی اصلاح سے دل روشن ہوتا ہے اور نفس کے اثرات سے انسان آزاد ہوتا ہے اور انسان حق اور خلق کو پہچاننے کے قابل ہوتا ہے اور مطیع اور فرمانبر دار ہو جاتا ہے۔

ابن عربی کہتے ہیں انسان اپنے نفس کو اپنے دل اور عقل کے ذریعے ہی راہ راست پر لاتا ہے اس لئے کہ نفس کی برائی دل پر ظاہر ہوتی ہے۔ جس سے اضطراب اور پریشانی بڑھتی ہے مگر عقل کے استعمال سے اسے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ اور نفس کی سرکشی ختم ہو سکتی ہے مگر کہتے ہیں نفس کو سختی سے نہیں بلکہ نرمی سے ہدایت کی جانب لاؤ:

"فقولا له قولاً لينا بالرفق والمدارة فی دعوتها ا لیٰ لاستسلام لامرالحق والانقياد لحكم الشرع لعلها تلين فتتعظ وتنقاد"[1]

(نفس امارہ کو امر حق اور شرع کے پابندی کے لیے قبولیت کی طرف نرمی اور مرافقت سے دعوت دو شائد کہ وہ نصیحت سے نرم، پابند اور مطیع ہو جائے)

محل نظر پہلو:

ابن عربی نے، اپنے تصور کے مطابق، قلب کی کئی صورتیں بیان کی ہیں ان میں ایک "قلب حقانی" ہے۔ آیت کریمہ: ﴿ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَواْ وَّٱلَّذِينَ هُم مُّحۡسِنُونَ﴾[2] (بے شک اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو اس سے ڈرتے ہیں اور جو احسان کرنے والے ہیں) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ انسان اپنی ذات سے رزائل ختم کر دیتا ہے اور عین الجمع میں فنا ہو جاتا ہے۔ وہ اگرچہ رہتا اس دنیا میں ہے مگر حقیقت میں اپنے خالق سے بہت قرہب ہوتا ہے:

"والذين ہم محسنون بشہودة الوحدة عين الكثرة والطاعة فی عين المعصية والقيام بالامر والنہی فی مقام استقامة والبقاء حقوق التفصيل فی عين الجمع"[3]

1۔ ابن عربي، **تفسیر ابن عربي**، 21/2

2۔ النحل: 128

3۔ ابن عربي، **تفسیر ابن عربي** 1/ 396

(وہ کثرت میں ہوتے ہوئے بھی وحدت میں ہوتے ہیں عین معصیت میں ہوتے ہوئے بھی طاعت میں ہوتے ہیں۔
امر اور نہی کی رعایت کے ساتھ عین الجمع میں استقامت کے ساتھ احکامات پر قائم رہتے ہیں)

1۔ابن عربی کے خیال میں، ان کے وجود سے ان کی اپنی مرضیاں ختم ہو جاتی ہیں اعضاء سے اللہ تعالیٰ کے احکام نظر آتے ہیں اور اپنی ساری مصروفیات میں سے معصیت اور گناہ کو ختم کر دیتے ہیں ہمیشہ نیکی کے حکم اور برائی سے روکنے میں مصروف رہتے ہیں کسی بھی صورت اپنے مقاصد سے دور نہیں ہوتے یہی افراد ہیں جن کا قلب قلب حقانی ہے جو حق اور خلق دونوں کی جانب متوجہ رہتا ہے۔

"ویسعہم مراعات الحق والخلق للرجوع الی الکثرۃ لوجود القلب الحقانی"[1]

(یہ لوگ قلب حقانی کے وجود کے ساتھ کثرت کی جانب رجوع کے لئے حق اور خلق دونوں کی وسعت رکھتے ہیں)

قلب حقانی کے نام سے ، اس انداز میں وضاحت کسی اور مفسر کے ہاں نہیں ملتی کہ قلب حقانی جب انسان کو نصیب ہو جاتا ہے تو وہ مخلوق میں بھی مشغول ہوتا ہے اور خالق کی جانب بھی متوجہ رہتا ہے یعنی غفلت اس سے دور ہو جاتی ہے اور کثرت میں ہوتے ہوئے بھی وحدت میں گم رہتا ہے۔

تفسیر ابن عباس میں ہے:

"{إِنَّ اللهَ مَعَ الَّذين اتَّقوا} الْكفْر والشرك وَالْفَوَاحِش {وَالَّذين هُم مُّحْسِنُونَ} بالْقَوْل وَالْفِعْل موحدون"[2]

(اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے جو کفر شرک اور فواحش سے بچتے ہیں وہی محسن ہیں اپنے قول میں اور فعل میں اور وہ موحد ہیں)

جب کہ علامہ طبری اس آیہ مقدسہ کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

"(إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ) قال: اتقوا الله فيما حرّم عليهم، وأحسنوا فيما افترض عليهم"[3]

(بے شک اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو محسن ہیں فرمایا اللہ سے ڈرو اس چیز میں جو ان پر حرام کیا گیا ہے اور فرائض کو احسن انداز میں پورا کرنے کی کوشش کرو)

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 1/ 396

2۔ ابن عباس ، **تنویر المقیاس** 233

3۔ الطبری ، **جامع البیان** 17/ 327

ان عبارات کی روشنی میں واضح ہوا کہ انسان تقویٰ میں اس وقت بلند مقام حاصل کر سکتا ہے جب وہ فرائض کو احسن انداز میں ادا کرتا ہے اور ان کی پوری رعایت کرتا ہے۔ گویا انسان کو ضرورت اصلاح عقائد اور آبرو کی حفاظت کی ہے۔

ابن عربی اسے قلب حقانی کی عجیب کیفیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس حال میں انسان، اللہ تعالیٰ کی جانب قلبی طور پر متوجہ ہوتا ہے اور عملی طور پر کمزور ہوتا ہے۔ اگر خلاف شریعت کام میں بھی مشغول ہو تو وہ عذر پیش کر سکتا ہے کہ میری توجہ اللہ کی جانب ہے۔

2۔ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب شعیب علیہ السلام کے پاس گئے تو شعیب علیہ السلام کی بیٹی نے اپنے والد سے کہا:

﴿قَالَتۡ إِحۡدَىٰهُمَا يَٰٓأَبَتِ ٱسۡتَـٔۡجِرۡهُ﴾[1]

(ان میں سے ایک خاتون نے کہا ابا جان اس کو اجرت (مزدوری) پر رکھ لیجئے)

یہاں اجرت یا مزدوری کی وضاحت ابن عربی نے اپنے انداز میں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں اس مزدوری سے مراد تزکیہ، مجاہدہ اور علمی مکاشفات تھا:

"ای استعملہ بالمجاہدۃ فی اللہ و مراقبۃ لحالہ فی رعایۃ اغنام القویٰ حتیٰ لا تنتشر فتفسدو ا جمیعتنا وتشوش فرقتنا بالذکر القلبی فی مقام تجلیات الصفات السیر فیہا باجرہٖ ثواب التجلیات وعلوم المکاشفات"[2]

(یعنی اسے قویٰ کی بکریوں کی رعایت میں اور اس کے حال کی وجہ سے مراقبہ اور مجاہدہ فی اللہ کے ساتھ عمل کروائیں یہاں تک کہ ہم دونوں کو نہ تو اپنی جمعیت میں لوٹنے کی خبر ہو اور نہ ہی ہمیں الگ ہو جانے کی تشویش ہو اور انہیں مقام تجلیات میں اور علوم مکاشفات کے ساتھ اجرت دیں)

اس آیہ مقدسہ کی وضاحت میں ابن عربی فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی اصلاح اور تربیت کے لئے انہیں مجاہدات اور مراقبات میں مصروف کریں تاکہ ان کی طبیعت فساد سے محفوظ رہے اور ہم بھی اس کی جانب متوجہ نہ ہوں اور ہمارے ساتھ رہنے سے انہیں تجلیات اور مکاشفات کا حصول ہو اور جو ہمارے کاموں میں مصروف رہیں انہیں اس کی اجرت ملے۔

1۔ القصص:26

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 114/2

اسی طرح آیت: ﴿ إِنَّ خَيْرَ مَنِ ٱسْتَـْٔجَرْتَ ٱلْقَوِيُّ ٱلْأَمِينُ﴾[1] (بے شک بہتر آدمی جس کو آپ نوکر رکھیں وہ ہے جو طاقتور بھی ہو اور امانت دار بھی ہو) کی وضاحت میں ابن عربی فرماتے ہیں بے شک بہترین اجر کا حق دار وہ ہوتا ہے جو قوی اور امین ہوتا ہے:

"الذی لا یخون عہداللہ بالوفا ء بابرازھا فی الاستعداد من ودیعۃ اولا یخون الروح بالمیل الیٰ بناتہ فیحتجب بالمعقول"[2]

(جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کرے جو طاقت اس کی ذات میں ودیعت کی گئی ہے اس سے اور نہ اپنی روح سے ان کی بیٹیوں کی جانب مائل ہو کر خیانت کرے اور نہ ہی معقول کے ساتھ پردہ کرے)

اس بحث میں ابن عربی واضح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سعادت کی علامات عطا فرمائی تھیں اور ان کو چمکایا شعیب علیہ السلام نے تھا۔ وفا کرنا شعیب علیہ السلام کی طبیعت میں شامل تھا۔ دیگر مفسرین، اس مقام پر اجرت کے صرف حقیقی معانی کی جانب گئے ہیں جو شعیب علیہ السلام کی بیٹی کے ساتھ شادی کی صورت میں ادا ہوئی تھی، جب کہ ابن عربی نے اجرت سے مراد مکاشفات اور تجلیات لیا ہے۔

تفسیر ابن عباس میں ہے:

{قَالَت إِحْدَاهمَا} وهى الصُّغْرَى {يَا أَبَت اسْتَأْجرهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرت} من الأجراء هُوَ "{الْقوي} على الْحمل الثقيل {الْأمين} على الْأَمَانَة ثمَّ{قَالَ} يثرون لموسَى {إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ} أزوجك يَا مُوسَى {إِحْدَى ابْنَتَيّ هَاتَيْنِ على أَن تَأْجُرَنِي} تعْمل لي فِي غنمي {ثَمَانِيَ حِجَجٍ} ثَمَان سِنِين {فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْراً} عشر سِنِين {فَمِنْ عِندِكَ} الزِّيَادَة {وَمَآ أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ}"[3]

(ان میں سے ایک نے کہا یہ چھوٹی تھی اے باباجان اس کو اجرت دیں سب سے بہتر اجرت کا حق دار وہ مضبوط جو وزن اٹھا سکے اور امین یعنی امانتدار ہو اور موسیٰ علیہ السلام سے اس نے معاہدہ کیا کہ اگر تو چاہے تو میں تمہارا نکاح اپنی ان بیٹیوں میں سے ایک سے کر دوں گا ار تو میری بکریاں آٹھ سال چرائے گا اگر تو دس سال پورے کرے گا تو تمہاری مرضی اور میں تم پر مشقت کا ارادہ نہیں رکھتا)

علامہ سیوطی، در منثور میں فرماتے ہیں:

1۔ القصص:24

2۔ القصص: 24

3۔ ابن عباس، **تنویر المقیاس** 325

"قَالَت إِحْدَاهمَا يَا أَبَت اسْتَأْجرهُ إِن خير من اسْتَأْجَرت الْقوي الْأمين قَالَ إِنِّي أُرِيد أَن أنكحك إِحْدَى ابْنَتي هَاتين على أَن تَأْجُرني ثَمَانِي حجج فَإِن أتممت عشرا"[1]

(ان میں اے ایک نے کہا اباجان اس کو اجرت دیں سب سے زیادہ اجرت کا حق دار مضبوط اور امانت دار شخص ہوتا ہے تو شعیب علیہ السلام نے کہا میں تمہارا نکاح اپنی ایک بیٹی سے کر دوں گا اگر تو آٹھ سال یا دس سال میری بکریوں کو چرائے)

ابن عربی کے ہاں علم کشفی کا تصور:

سورہ قصص میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مدین پہنچے تو، ایک کنویں پر لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے ہیں، ان میں دو جوان خواتین بھی تھیں (بعد میں واضح ہوا کہ وہ حضرت شعیب کی بیٹیاں تھیں)، انہوں نے بتایا کہ وہ الگ اس لیے کھڑی ہیں کہ جب دیگر مرد اپنے مویشی ہٹالیں گے تو وہ اپنے مویشیوں کو سیراب کریں گی۔ اس موقع پر حضرت موسیٰ پیچھے سائے کی طرف ہٹتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی طرف دست بدعا ہوئے اور کہا کہ:

﴿رَبِّ إِنِّي لِمَآ أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ﴾[2]

(پروردگار، واقعی میں اس خیر وبرکت کا جو تو نے میری جانب اتاری، محتاج ہوں)

اس آیت مقدسہ میں خیر فقیر کے لفظ کو سب مفسرین نے اپنی ضروریات کی دستیابی سے منسلک کیا ہے۔ جب کہ ابن عربی نے اس خیر سے مراد علم کشفی لیا ہے جو ان کی نظر میں خیر عظیم ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ای محتاج سائل لما انزلت الی من الخیرا لعظیم الذی ہو العلم الکشفی ہوالمقام الوحدۃ والشوق ای حال السریع الزوال و طلبہ حتیٰ تصیر ملکاً ''[3]

(یعنی (میں موسیٰ) محتاج سائل، جس کی جانب تو نے خیر عظیم اتاری ہے، جو کہ خاص علم کشفی ہے۔ یہ مقام وحدت وشوق، تیزی سے زائل ہونے والا حال ہے اور اس کی طلب یہاں تک کہ مالک ہو جائے)

گویا، ابن عربی کے ہاں العلم الکشفی ایک خیر عظیم ہے، جو ایک حالت ہے جو وقتی طور پر ظاہر ہوتی ہے، اس میں دوام و استمرار نہیں۔ آپؑ دعا کرتے ہیں یا اللہ یہ جو تو نے میری جانب علم نازل کیا ہے میں اس کا بہت ضرورت مند ہوں اور عرض کرتے ہیں یا اللہ یہ کیفیت میری ملکیت میں دے دے کہ کبھی بھی زائل نہ ہو۔

1۔ السیوطی، **الدرالمنثور** 404/6

2۔ القصص: 24

3۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 113/2

محل نظر پہلو:

مذکورہ آیت میں لفظ خیر سے یہ مفہوم ، سوائے ابن عربی کے کسی نے اخذ نہیں کیا۔ وہ اس سلسلہ میں منفرد ہیں کہ ایک نبی مقرر ہونے والی شخصیت کی طرف نازل ہونے والے خیر کو، ایک صوفی کے کشف کے ساتھ متوازی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی طرح کی ایک اور تشریح، ابن عربی نے سورۃ الانبیاء کی آیت کے سلسلہ میں کی ہے۔

قرآنی آیت ہے:

﴿ وَلَقَدۡ ءَاتَيۡنَا مُوسَىٰ وَهَٰرُونَ ٱلۡفُرۡقَانَ وَضِيَآءٗ وَذِكۡرٗا لِّلۡمُتَّقِينَ ﴾[1]

(اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو فرقان اور روشنی اور ذکر پرہیز گاروں کے لئے)

اس آیت کی تشریح میں جمہور مفسرین نے فرقان، ضیاء اور ذکر سے مراد بالترتیب: الہامی کتاب یعنی تورات، نبی کی دعوت اور حضرات موسیٰ وہارون کے کار نبوت، لیا ہے، جب کہ ابن عربی مذکورہ تینوں تصورات کو صوفیانہ اصطلاحات کی روشنی میں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ابن عربی کہتے ہیں:

"اٰتینا موسیٰ وھارون العقل علیٰ ظاہربا بما الفرقان ای العلم التفصیلی والکشفی المسمیٰ بعقل الفرقانی وضیاءً ای نوراً تاماً من المشاہدات الروحانیۃ وذکریٰ ای تذکیراً وموعظۃ للمتقین تزکت نفوسہم من الرزائل والصفات الحاجبۃ فاشرقت انوار الطیبات العظمۃ من قلوبہم علیٰ نفوسہم لصفائہا وزکائہا "[2]

(ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو قلب اور ہارون علیہ السلام کو عقل عطا کی اور دونوں پر فرقان ظاہر فرمایا یعنی تفصیلی کشفی علم جس کا نام عقل فرقانی ہے یا ضیاء یعنی مشاہدات روحانیہ سے نور کامل عطا فرمایا اور ذکراً للمتقین اور اسے متقین کے تذکیر وموعظت بنا دیا جنہوں نے صفات حاجبہ اور رزائل سے اپنے نفوس کو پاک کر لیا تو ان کے نفوس پر طیبات عظمت کے انوار طلوع ہوتے ہیں اس لئے ان نفوس کا تزکیہ اور تصفیہ ہو جاتا ہے تو مقام حضور قلبی کی طرف وصول سے قبل حال غیبت میں خشیت کی وراثت حاصل ہو جاتی ہے)

ابن عربی کے خیال میں عقل فرقانی، تسلسل سے تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ جب اپنی ذات کو رزائل سے صاف کر لیا اور خاطر قلبی نصیب ہو گئی اور باطن میں خشیت ربانی نے گھر کر لیا تو عقل کو حق اور باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت مل گئی تو اس کے بعد ان کے وجود پر ایسی چیزوں کا ظہور ہوا جس سے عقل انسانی کو کشف اور حق وباطل میں فرق کی دولت مل جاتی ہے۔

علامہ ابن جریر، اس آیت کی توضیح یوں کرتے ہیں:

1۔ الانبیاء: 48

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 2/ 38

"عن قتادة، قوله (وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ) الفرقان: التوراة حلالها وحرامها، وما فرق الله به بين الحق والباطل"[1]

(حضرت قتادہ سے روایت ہے ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ھارون علیہ السلام کو فرقان یعنی تورات اس کے حلال اور حرام اور جس کے ذریعے وہ حق اور باطل میں فرق کرتے تھے یہ قوت عطا فرمائی)

علامہ سمرقندی بحر العلوم میں فرماتے ہیں کہ یہاں اللہ کی نصرت اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی نجات بھی مراد ہے:

"النصرة والنجاة، فنصر موسى وهارون عليهما السلام، وأهلك عدوهما فرعون. وَضِياءً، يعني: الذي أنزل عليهما من الحلال والحرام في الكتاب"[2]

(نصرت اور نجات۔ پس موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کی مدد کی اور ان کے دشمن فرعون کو ہلاک کیا اور ان پر حلال اور حرام کو کتاب میں نازل کیا)

گویا محل نظر پہلو ہے کہ ابن عربی نے فرقان سے مراد کتاب تورات نہیں لیا بلکہ وہ فرقان وضیاء سے مراد علم کشف اور مشاہدات قلبی لیتے ہیں، جس کا کوئی قرینا اور دلیل نہ مذکورہ الفاظ میں موجود ہے نا ہی آیت کے سیاق وسباق میں واضح ہے۔

خبیث اور طیب کی وضاحت میں ابن عربی کی عمدہ توضیح:

قرآن مجید کی اصطلاحات میں طیب اور خبیث کا تصور بہت اہم ہے۔ قرآن کے مطابق خبیث اور طیب برابر نہیں ہو سکتے:

﴿قُل لَّا يَسۡتَوِي ٱلۡخَبِيثُ وَٱلطَّيِّبُ﴾[3]

(آپ فرما دیجئے نہیں برابر ہو سکتا ناپاک اور پاک)

ابن عربی تفسیر کرتے ہیں کہ خبیث ہر وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ سے دور کرتی ہے اور طیب ہر وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے قریب کرتی ہے کیونکہ طیب شئے ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت اور شرف پاتی ہے اور خبیث اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے رد کی جاتی ہے۔ خبیث اور طیب نفوس بھی ہوتے ہیں، اعمال انسانی، اخلاق اور مال بھی :

"قل لا يستوى الخبيث من النفوس والاعمال والاموال والطيب منها عندالله تعالى، فان الطيب مقبول موجب للقرب والوصول ،والخبيث منها مردود موجب للبعد الطرد والحرمان"[4]

1۔ الطبری ،**جامع البیان** 453/18

2۔ السمرقندی ،**بحرالعلوم** 4428/2

3۔ المائدہ: 100

4۔ ابن عربی ،**تفسیر ابن عربی** 212/1

(نفوس، اعمال، مال اور اخلاق میں سے کبھی خبیث طیب کے برابر نہیں ہو سکتا پاکیزہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول اور اور باعث قرب ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور خبیث مردود، محرومی، بعد اور اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث ہے)

شیخ اکبر فرماتے ہیں قرب الٰہی اور اللہ تعالیٰ کا وصال حاصل ہوتا ہے تو انسان جہاں حرام اشیاء کھانے سے محتاط رہتا ہے۔ اسی طرح اس کے لئے ایسی چیزوں سے بچنا بھی ضروری ہے جو اس کے اخلاق کے لئے نقصان دہ ہیں کیونکہ جہاں بری غذا اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث ہے، وہیں برے اخلاق بھی اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خبث کی کثرت انسان کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے ﴿لَوۡ أَعۡجَبَكَ كَثۡرَةُ ٱلۡخَبِيثِۚ﴾ [1] (اگرچہ خبیث کی کثرت تم کو بھلی ہی کیوں نہ لگے) مگر یہ کبھی بھی باعث اطمنان نہیں ہو سکتی کیونکہ خبث یہ سب نفس کی چالوں کا نتیجہ ہوتا ہے اور رروح کا اطمنان یہ انسان کی ذات میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی فرمانبرداری اور طاعت کا نتیجہ ہوتا ہے:

" الخبث بكثرته ووفوره لمناسبة للنفس ولملاءمته لصفاتها فاجعلوالله وقاية لكم فى ا لاجتناب عن الخبيث واختيار الطيب ياكل من لہ لب اى عقل خالص يشوب الوہم ومزج ہوى الفس" [2]

(اگرچہ تمہیں خبث نفس کی مناسبت کی وجہ سے اور اپنی صفات اور ملائمت کی وجہ سے اپنی کثرت اور زیادتی کی وجہ سے اچھا لگے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے خبیث سے اجتناب اور طیب کو اختیار کرنے میں تمہارے لئے وقایت مقرر کر دی ہے پس تو وہ کھا جس کے لیے عقل ہے یعنی وہم کی آمیزش اور خواہش نفس کے امتزاج سے خالص ہو تا کہ تم اپنے نفس اور صفات کے خبث سے نجات حاصل کر لو)

محل نظر پہلو:

محولہ بالا بحث میں شیخ اکبر نے ایک خاص بات کا ذکر کیا ہے کہ نفس کی خواہشات کی طلب کا نتیجہ خبث ہے اور جس چیز میں وہم ہو جاتا ہے اس سے بچنا بھی ضروری ہے جیسے جیسے انسان اپنی بری صفات سے مبرا ہوتا چلا جاتا ہے وہاں وہاں فنا فی اللہ کے ساتھ بقاء باللہ بھی ہوتا جاتا ہے۔ اور وصال الٰہی بھی نصیب ہوتا جاتا ہے:

" باالخلاص عن نفوسكم وصفاتها وخبائثها والوصول الى الله بالفناء فيه"[3]

1۔ المائدہ، 100

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 212/1

3۔ ایضاً 212/1

(تم اپنے نفوس سے خلاصی حاصل کر لو اللہ تعالی کے قرب میں فنا کے ساتھ ساتھ واصل بھی ہو جاؤ)

اس ایت کی وضاحت، علامہ ابن جریر فرماتے ہیں:

"قل يا مُحَمَّد: لا يعتدل الرديء والجيد، والصالح والطالح، والمطيع والعاصي (2) = ولو أعجبك كثرة الخبيث"، يقول: لا يعتدل العاصي والمطيع لله عند الله، ولو كثر أهل المعاصى فعجبت من كثرتهم، لأن أهل طاعة الله هم المفلحون الفائزون بثواب الله يوم القيامة وإن قلُّوا، دون أهل معصيته= وإن أهل معاصيه هم الأخسرون الخائبون وإن كثروا"[1]

(اے محمد ﷺ فرمادیں کبھی بھی ردی اور جید مال برابر نہیں ہوتا اچھا اور برا اور نہ ہی فرمانبر داری اور گناہ اگرچہ خبیث کی کثرت بھلی لگتی ہو اور نہ ہی گنہگار اور فرمانبر دار برابر ہیں اللہ کے نزدیک اگرچہ گنہگار زیادہ ہوں اوران کی کثرت بھلی لگتی ہو برابر نہیں ہوتے کیونکہ اہل طاعت ہی کامیاب ہونے والے اور فلاح پانے والے ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ثواب پانے پر قیامت کے دن، اگرچہ کم ہوں بجائے اہل معصیت کے اوراہل معصیت خسارہ پانے والے اور ذلیل ہونے والے ہیں اگرچہ زیادہ ہوں)

جمہور مفسرین نے یہاں نیکی اور برائی کو نافرمانی اور فرمانبر داری سے واضح کیا ہے اور اور ان کا اجر قیامت میں ثواب کی صورت میں بیان کیا ہے اور سزا کو ذلت اور رسوائی کی صورت میں بیان کیا ہے جبکہ ابن عربی نے اپنی فکر سے فنا اور بقا کا تصور دیا ہے کہ انسان نیکی سے فنا ہوتا اور اچھی صفات سے بقا باللہ ہو جاتا ہے یہ بھی ابن عربی اک اپنا فسلفہ ہے۔

واقعہ سلیمان اور تخت بلقیس:

سورۃ النمل کے اس مقام پر جہاں عفریت (جن) کی طرف سے یہ دعویٰ مذکور ہے کہ وہ تخت بلقیس کو آپؑ کی مجلس برخاست ہونے سے قبل لے آئے گا، وہ آیت درج ذیل ہے:

﴿ قَالَ عِفْرِيت مِّنَ ٱلْجِنِّ أَنَا۠ ءَاتِيكَ بِهِۦ قَبْلَ أَن تَقُومَ مِن مَّقَامِكَ ۖ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِين ﴾[2]

(جنات میں سے ایک عفریت نے کہا کہ (حکم ہو تو) میں لے آتا ہوں آپ کے پاس اس (تخت) کو، پیش ازیں کہ آپ کھڑے ہوں اپنے مقام سے بے شک میں اس کو اٹھانے کی طاقت بھی رکھتا ہوں (اور) امین بھی ہوں)

بالعموم، مفسرین نے ایک حقیقی واقعہ کے طور پر، اس امر کو بیان کیا ہے کہ ایک قوی ہیکل جن کی طرف سے دعویٰ اور اس کا ثبوت ظاہر ہوا۔

1۔ الطبری **جامع البیان** 96/11

2۔ النمل:39

علامہ سمرقندی بحر العلوم میں فرماتے ہیں:

"قالَ عِفْرِيتٌ مِنَ الْجِنِّ يعني: ماردا من الجن، والعفريت: هو الشديد القوي، ويقال: العفريت من كل شيء المبالغ والحاذق في أمره"[1]

(جنوں میں سے ایک عفریت جنوں میں سرکش اور عفریت سخت مضبوط اور کہا جاتا ہے عفریت ہر چیز پر غالب آنے والا اور نہائی تیز)

ابن عربی کی منفرد تشریح:

1۔ عفریت کی وضاحت میں اشاری مفسرین نے بالعموم خاموشی اختیار کی ہے جبکہ ابن عربی کی وضاحت درج ذیل ہے:

"والعفريت هوالوهم لانه يسخرها بالخوف والرجاء يبعثها على الاعمال بالدواعى الوهميه والامانى الموافقه "[2]

(عفریت ایک وہم تھا کیونکہ وہم میں خوف اور امید دونوں غالب ہوتے ہیں جو اعمال پر وہم کے دواعی اور اس سے موافق امیدیں بھیجتے ہیں)

گویا عفریت جنات میں سے کوئی حقیقی وجود نہیں تھا بلکہ یہ ایک وہم تھا جو خوف اور امید سے پیدا ہوتا ہے جب یہ ہمارے گمان اور دعووں سے موافق ہوتا ہے تو شدت اختیار کرتا ہے۔ اس تشریح کے ساتھ ساتھ، ابن عربی نے اس سارے واقعے کی حقیقت سے انکار کیا ہے جس طرح اس وقوع کے پذیر ہونے کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔

2۔ ابن عربی، مذکورہ بالا آیت میں، لفظ "مقام" سے "مقام السر" مراد لے کر بیان کیا ہے۔ اور قَبْلَ أَن تَقُومَ مِن مَّقَامِكَ کی وضاحت میں لکھا:

"ای ما دمت فی مقام الصدر قبل الترقی الیٰ مقام السر فان الوهم حينئذينعزل عن فعله بالهدايه"[3]

(جب تک وہم مقام صدر پر رہتا ہے مقام سر کی جانب ترقی کرنے سے قبل تو وہم اس وقت تک ہدایت کے عمل سے الگ رہتا ہے)

ابن عربی کہتے ہیں جب تک انسان مقام صدر پر ہو تو وہم غالب رہتا ہے اور کامیابی کی امید اور ناکامی کا خوف مسلسل چھایا رہتا ہے اور جب انسان کی اللہ تعالیٰ ہدایت اور مقام سر کی جانب راہنمائی فرما دیتا ہے تو یہ خوف اتر جاتا ہے۔

1۔ السمرقندی، **بحرالعلوم** 582/2

2۔ ابن عربی، **تفسیرابن عربی** 103/2

3۔ ایضا

مزید وضاحت میں وہ لکھتے ہیں:

''ای نظرک الیٰ ذاتک ما ینبغی لہا من الترقی الیٰ عالمک فی عالم القدس لادراک الحقائق والمعارف الکلیۃ والمشاہدات الحقۃ العینیۃ فان الکمال العلمی مقدم علی الکمالات الذوقی والکشفی[1]

(یعنی تیری ذات کی جانب نظر اٹھنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ تیرے عالم کے حقائق، معارف کلیہ اور مشاہدات حقہ عینیہ کا ادراک ہو کیونکہ کمال علمی کمال ذوقی اور کشفی پر مقدم ہے۔)

اللہ تعالیٰ کی ذات کی جانب بڑھنے سے پہلے تمام معارف، مشاہدات اور حقائق کا جاننا ضروری ہے کیونکہ جب تک علمی کمال نہ ہو ذوق اور کشف کی جانب بڑھنا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ یہ علوم درجہ بدرجہ ہیں کہ انسان مسلسل ترقی کی منازل طے کرتا ہے اور حقائق عینیہ اور معارف کلیہ تک رسائی حاصل کرتا ہے اس کو مقام کشف بھی حاصل ہوتا ہے مگر اس سے بھی قبل ایک کمال کی ضرورت ہوتی ہے جسے بہر صورت اس کشف پر تقدیم ہوتی ہے وہ فضیلت علمیہ ہے جس سے احتراز کسی صورت بھی ممکن نہیں اور اس کے بغیر کشفی اور ذوقی علوم محض خام خیالی ہے۔

آیت مذکورہ میں لفظ مقام کی یہ وضاحت، کسی اور مفسر کے ہاں نہیں ملتی۔ جمہور مفسرین نے یہاں حضرت سلیمان کے جسمانی طور پر موجودگی کا مقام ہی مراد لیا ہے۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

إن إحضار العرش في تلك الساعة اللطيفة درجة عالية فلو حصلت لأحد من أمته دونه لاقتضى تفضيل ذلك عليه السلام[2]

(یہ تخت اسی لطیف ساعت میں حاضر کر دیا گیا یہ بلند مرتبہ سوائے اس ایک فرد کے اور کسی کو حاصل نہیں تھا اگر یہ فضیلت کسی اور کو حاصل ہوتی تو وہ بھی اس کا تقاضا کرتا جو آصف بن برخیا نے کی)

واقعہ ابراہیم کی توضیح:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کا واقعہ قرآن مجید کی سورۃ صافات میں بیان کیا گیا ہے:

﴿قَالُواْ ٱبۡنُواْ لَهُۥ بُنۡيَٰنا فَأَلۡقُوهُ فِي ٱلۡجَحِيمِ﴾[3]

انہوں نے (فیصلہ کن انداز میں) کہا کہ بناؤ اس کے لئے ایک وسیع آتش کدہ پھر پھینک دو اسے بھڑکتی آگ میں)

1۔ ایضاً

2۔ الآلوسی، **روح المعانی** 198/10

3۔ الصافات: 97

اس آیہ مقدسہ کے تحت جمہور مفسرین نے مفصل بحث کی اس کے تحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالے جانے اور آگ کے ٹھنڈا ہونے کا واقعہ تفصیل سے لکھا ہے اور قرآن مجید کی اس آیہ مقدسہ سے استدلال کیا ہے:

﴿قُلۡنَا يَٰنَارُ كُونِي بَرۡدٗا وَسَلَٰمًا عَلَىٰٓ إِبۡرَٰهِيمَ﴾ [1]

(ہم نے کہا اے آگ ابراہیم علیہ السلام پر سلامتی والی ہو جا)

تفسیر اشاری میں ان آیات پر سوائے ابن عربی کے کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا مگر ابن عربی کا انداز یہاں بھی بالکل مختلف ہے وہ آگ کے سلامتی میں تبدیل ہونے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"فی نار حرارة الرحم فجعلها الله علیه بردا وسلاما ای روحاوسلامة من الآفات لبقاء صفاء استعداده وتقاء فطرته وبنیٰ علیه بنیان الجسد وجعل الله اعداء ه من النفس الامارة والقویٰ البدنیة الملقیة ایاه فی النار من الاسفلین لتکامل الاستعداده فتوجه الیٰ ربه بالسلو ک "[2]

(انہیں حرارت رحم کی آگ میں ڈال دو تو اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ کو سلامتی والا کر دیا یعنی آپ کے فطری اتقاء اور آپ کی استعداد کے صفاء کی وجہ سے آپ کو سلامتی اور راحت میں رکھا اور آپ کے جسد کی عمارت کی بنیاد رکھی اور اللہ تعالیٰ نے نفس امارہ اور قوائے بدنیہ کو اس کا دشمن بنا دیا تو انہوں نے اسے پستی کی آگ میں ڈال دیا تاکہ سلوک کے ساتھ رہے اور اپنے رب کی جانب توجہ کرنے سے اس کی استعداد کی تکمیل ہو جائے۔)

ابن عربی نے کسی حقیقی آگ کی نفی کی ہے اور اس سے مراد لیا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ان کی ماں کے بطن میں رکھا اور اسے حرارت رحم کا نام دیا مگر جب اس پر اللہ تعالیٰ نے روح کو نازل کیا تو وہ بدن صاف تھا تو اپنے صفا اور زکی کی وجہ سے روح جسم پر سلامتی والی ہو گئی یعنی ان کو مستقبل میں آنے والے خطرات سے محفوظ کر لیا گیا۔ اب اس پر جسم انسانی کی بنیاد رکھی نفس امارہ اور اعضاء انسانی کو اس کا دشمن کہا گیا ہے۔ تو ان دونوں نے اسے پستی کی آگ کی جانب دھکیل دیا کہ راہ سلوک پر چلنے کی وجہ سے اس کی توجہ اپنے رب کی جانب رہے اور اس کی استعداد کامل ہو جائے یعنی اس میں آگ سے مراد یہ حقیقی آگ نہیں بلکہ نفس امارہ کے اثرات ہیں اور ٹھنڈک سے مراد وہ سلوک کے راستے ہیں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی جانب لے کر جاتے ہیں اور انسان کی تکمیل کا باعث بنتے ہیں۔

مگر اس تصوراتی آگ کے برعکس، یہاں جمہور مفسرین نے نار سے مراد حقیقی آگ لی ہے جو نمرود نے جلائی تھی اور یہی سیاق وسباق اور مذکور الفاظ کے حقیقی مفاہیم کا تقاضا ہے۔ جیسا کہ علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

1۔ الانبیاء:69

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 172/2

" فجمعوا له صلاب الحطب من أصناف الخشب مدة أربعين يوما فأوقدوا نارا عظيمة لا يكاد يمر عليها طائر في أقصى الجو لشدة وهجها"[1]

(اس کے لیے ایک عمارت بناؤ پھر اسے آگ میں ڈال دو اور اس مقصد کے لیے موٹی قسم کی لکڑیاں اکٹھی کرو چالیس دن پھر انہوں اس سے بڑی آگ جلائی اس کے شعلوں کی تیزی کی وجہ سے کوئی پرندہ اس کے پاس سے نہیں گذر سکتا تھا)

آگ کی وضاحت حقیقی معنوں کی گئی ہے جس کے لیے لکڑیوں کو اکٹھا کرنے کا ایک مخصوص دررانیہ رکھا۔ آتشکدہ جلایا گیا اور وہ آگ ایک مثال بن گئی اور جب ابراہیم علیہ السلام کو آتش نمرود میں ڈالا گیا تو اس وقت کی کیفیت کو مفسرین نے بیان کیا ہے:

"قُلْنا يا نارُ كُونِي بَرْداً وَسَلاماً عَلى إِبْراهِيمَ أي كوني ذات برد وسلام أي ابردي بردا غير ضار، ولذا قال علي كرّم الله تعالى وجهه فيما أخرجه عند أحمد وغيره: لو لم يقل سبحانه وَسَلاماً لقتله لى بردها "[2]

(ہم نے کہا اے آگ ابراہیم علیہ السلام پر سلامتی والی ہو جا یعنی سلامتی والی اور ٹھنڈی بے ضرر اس لیے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس کو احمد نے روایت کیا اگر اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا کہ سلامتی والی ہو جا تو سردی سے ان کی جان چلی جاتی)

واضح طور پر، اس مقام پر ابن عربی کی توجیہ دوسرے مفسرین سے مختلف ہے وہ اسے وجود اور رحم مادر کی آگ سے تعبیر کرتے ہیں، جو نہ تو واقعاتی حقائق کے مطابق ہے اور نہ ہی آیت کے سیاق وسباق سے کوئی واسطہ رکھتی ہے۔

باطنی ہجرت کا تصور :

قرآن مجید میں مہاجرین سے مراد خاص صحابہ ہیں جنہوں نے نبی رحمت ﷺ کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کی۔ جمہور مفسرین کا مؤقف، اس سلسلہ میں یہ ہے کہ صحابہ کرام کی، مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کرنے کا عمل یہ تھا کہ انہوں نے اللہ کی رضا کی خاطر، نبی کریم کی معیت اور نصرت دین کے لیئے، اپنے مال اسباب، رشتے دار قبیلے اور وطن، سب کچھ چھوڑا اور سکونت ترک کر کے، نیا وطن اور مقام سکونت اختیار کیا۔ لہٰذا، قرآن حکیم ہر وہ آیت جہاں صحابہ کو مہاجرین کہا گیا ہے، اسی مادی اور جسمانی ہجرت کی بنیاد پر کہا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ حشر کی آیت ذیل میں:

1۔ الآلوسی، **روح المعانی** 65/9

2۔ ایضاً 66/9

﴿--- لِلۡفُقَرَآءِ ٱلۡمُهَٰجِرِينَ ٱلَّذِينَ أُخۡرِجُواْ مِن دِيَٰرِهِمۡ وَأَمۡوَٰلِهِمۡ يَبۡتَغُونَ فَضۡلٗا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضۡوَٰنٗا ﴾[1]

(۔۔۔ان فقرا اور مہاجرین کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکالے گئے اپنے گھروں اور مالوں سے، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضا کی تلاش کے سبب)

علامہ طبری فرماتے ہیں:

"قال: هؤلاء المهاجرون تركوا الديار والأموال والأهلين والعشائر، خرجوا حبًا لله ولرسوله، واختاروا الإسلام على ما فيه من الشدّة، حتى لقد ذكر لنا أن الرجل كان يعصب الحجر على بطنه ليقيم به صلبه من الجوع، وكان الرجل يتخذ الحفيرة في الشتاء ماله دثار غيرها"[2]

(کہا یہ سب مہاجرین ہیں جنہوں اپنے مال اہل گھر اور قبیلے چھوڑے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں نکلے اور سختیوں اور اسلام کو اختیار کیا یہاں تک کہ ایک ایسے آدمی کا بھی ذکر ہے جو اپنے پیٹ پر پتھر باندھتا تھا تاکہ اپنی پیٹھ کو سیدھا کر سکے بھوک کی وجہ سے اور سردی میں گڑھے میں گزارہ کرتے اور ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہوتی تھی)

ابن عربی کہتے ہیں یہ ہجرت مہاجرین کی اپنے نفس کی چاہتوں سے اپنے رب کی جانب تھی اگر وہ اپنے نفوس کی صفات سے ہجرت نہ کرتے تو یقیناً ان کے نفوس غرور کا شکار ہو جاتے تو ان کو اللہ تعالیٰ نے نفس کی الفتوں اور محبتوں سے ہجرت کا حکم دیا یہ اثرات گناہوں سے بھی شدید ہوتے ہیں جب ایسی جگہ کو ہی چھوڑ دیتے ہیں جو گناہوں کا مسکن ہے۔ تو یقیناً ان کے اثرات سے بھی تحفظ ملتا ہے تو انہیں صرف چھوڑتے ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل ان کے شامل حال ہو جاتا ہے جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالب ہوتے ہیں یہ ہجرت حقیقت میں نفس کی لذتوں سے اللہ تعالیٰ کی رضا کی جانب تھی۔ سوہ لکھتے ہیں:

"من مواطنہم ومالوفاتہم ای صفات نفوسہم ومعلوماتہم یبتغون فضلا من اللہ من العلوم والفضائل الخلقیۃ ورضوانا من الاحوال والمواہب السنیۃ من انوار التجلیات الصفات "[3]

(جو اپنے مواطن و مالوفات یعنی صفات نفوس اور ان کی معلومات سے نکالے گئے اور علوم و فضائل خلیفۃ اللہ کا فضل اور انوار تجلیات صفات سے روشن احوال و مواہب سے اس کی رضا چاہتے ہیں)

1۔ الحشر:8

2۔الطبری، **جامع البیان**23/ 281

3۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی**310/2

گویا، ابن عربی ہجرت سے مراد انفس سے روح کی جانب اور گناہ سے نیکی کی جانب ہجرت مراد لی ہے جو سوائے ابن عربی کے اور کسی نے نہیں لکھا ہے۔ جمہور مفسرین نے صحابہ کرام کی اس پریشانی کے عالم میں مدینہ سے اسلام پیغمبر اسلام کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مکہ کی اپنی آبائی سرزمین چھوڑ کر مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی۔

تصوف کے حق میں تفسیر قرآن سے استنباط :

بعض مقامات پر، ابن عربی، قرآنی آیات کی تفسیر، تصوف کی اصطلاحات اور تصورات کی روشنی میں واضح کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ خصوصیت، صوفیاء کی اشاری تفاسیر اور باطنیہ کے ہاں عام ہے، تاہم تفسیر ابن عربی کی بھی یہ نمایاں صفت نظر آتی ہے۔ تزکیہ نفس، اخلاقیات اور روحانیت سے متعلق آیات میں تو شائد اس کی گنجائش بنتی بھی ہو مگر ابن عربی تو اکثر مقامات پر بے جوڑ قسم کی توجیحات کی طرف گئے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے ذیل کی آیت:

﴿وَلَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَآ إِبۡرَٰهِيمَ بِٱلۡبُشۡرَىٰ قَالُواْ سَلَٰمٗاۖ قَالَ سَلَٰمٞ فَمَا لَبِثَ أَن جَآءَ بِعِجۡلٍ حَنِيذٖ﴾[1]

(بلاشبہ آئے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوش خبری لے کر انہوں نے کہا (اے خلیل) آپ پر سلام ہو پھر آپ جلدی لے آئے (انکی ضیافت کے لیے) ایک بھنا ہوا بچھڑا)

ابن عربی اس آیت مقدسہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں انسان کو اعلیٰ مقامات ملیں گے مگر اس کے لئے علم اور عمل شرط ہیں۔ انسان کے عمل کو قیامت کے دن گواہوں کے ساتھ لایا جائے گا اسی آیت مقدسہ کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"ان للنفوس الشريفة الانسانية اتصالات بالمبادى المجردة العالية والارواح المقدسة الفلكية من الانوار القابرة العقلية والنفوس المدبرة السماوية واختلاط بالملاء الاعلىٰ من اہل الجبروت وانخراطات فى سلک الملكوت تستمد من الاول فيض العلم والنور ومن الثانى مدد القوة والعمل "[2]

(مبادی مجردہ عالیہ کے نفس شریفہ انسانیہ سے اتصالات اور انوار قاہرہ عقلیہ سے ارواح مقدسہ فلکیہ اور نفوس مدبرہ سماویہ کے لئے اور اہل جبروت سے ملاء اعلیٰ سے اختلاطات اور ملکوت کی لڑی میں پروئے جانے کی وجہ سے اور ہر نفس کے لئے اس کی فطرت کے مطابق عالم جبروت سے اس کے مناسب مبداء ہے اور مدبر عالم ملکوت سے اس کی تربیت کرتا ہے اور فیض علم ونور سے اس کی تربیت کی جاتی ہے دوم عمل سے اس کی مدد کی جاتی ہے)

1۔ ھود: 69

2۔ ابن عربي، **تفسير ابن عربي** 1/ 328

اس مقام پر تفسیر میں ابن عربی نے دو مقامات کا ذکر کیاہے ملکوت اور جبروت ملکوت یہ عالم ملائکہ ہے انسان عبادت ریاضت فرمانبرداری اور اطاعت میں مصروف رہتاہے یہ ملائکہ کی صفات کا حامل ہوتاہے کیونکہ ملائکہ کا مقام عملی ہے اور اس سے بلند مقام مقام جبروت ہے جو مقام معرفت ہے اس کا فعل صفات حمیدہ ہیں اس مقام پر انسان تسلیم ورضا کا رویہ اختیار کرتاہے۔

ابن عربی کے بقول،جب انسان کا نفس شریف ہوتاہے اور اس کا عمل بدل جاتاہے تو وہ ملکوتی ہوتاہے مگر اس کی تعلیمات عالم جبروت سے آتی ہیں جس طرح ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتے تو آئے مگر وہ جو پیغام لائے تو وہ ملکوتی نہیں بلکہ جبروتی تھا فیض ان کے پاس جبروتی آتاہے اور عمل ملکوتی تھا۔اس تشریح کی تائید میں ابن عربی قرآن مجید کی اس آیت مقدسہ سے کرتے ہیں۔ ﴿ وَجَآءَتۡ كُلُّ نَفۡسٖ مَّعَهَا سَآئِقٞ وَشَهِيدٞ﴾[1](اور حاضر ہو گا ہر شخص اس طرح ہمراہ ایک (اسے) ہانکنے والا اور ایک گواہ ہو گا)

اسی طرح وہ لکھتے ہیں:

> مقراصلی تاوی الیہ من جانب اللاہوت ان تجردت کما قال النبی ﷺ "ارواح الشہداء تاوی الی قنادیل من نور معلقۃ تحت العرش"[2]
>
> (اصلی مستقر جس کی طرف جناب لاہوت سے پناہ لی جاتی ہے تجرد ہے جسے نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:یعنی شہدا کی ارواح عرش کے نیچے معلق نور کی قندیلوں میں ٹھکانہ بناتی ہیں)

ابن عربی کے مطابق،عالم لاہوت دن رات اور حدود سے منزہ ہے یہی وہ مقام ہے جہاں جبرائیل کے پر جل جاتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں شہداء کی روحیں عروج کرتی ہیں۔ اس کی تفصیل میں ابن عربی انسان کی روحانی ترقی عالم ناسوت سے ملکوت اور ملکوت سے جبروت اکی جانب تدبیر سے عروج کا ذکر کرتے ہیں اور ان کا ملاپ ملاء اعلیٰ سے ہوتاہے نفس جب ایک ترتیب سے عروج کی جانب بڑھنے میں پروئے جاتے ہیں تو عالم ناسوت کی تربیت عالم ملکوت کرتاہے مگر اس کا یہ فیض عالم جبروت سے آتاہے جو بغیر علم کے ممکن نہیں اور قوت عمل سے اس کی مدد ہوتی ہے۔اور مدبر عالم ملکوت سے اس کی تربیت کرتاہے اور عالم جبروت سے اس کی مزید بلندی کی ابتدا ہوتی ہے مگر اس کا یہ فیض بغیر علم کے ممکن نہیں اور قوت عمل سے اس کی مدد ہوتی ہے اور انسان کی روح عرش تک عروج کرتی ہے جو عالم لاہوت ہے یہ ایسی منفرد توضیح ہے جو ابن عربی کا خاصہ ہے۔

1۔ق: 21

2۔ ابن عربي، **تفسیرابن عربي** 328/1

جب کہ جمہور مفسرین نے ایسی کوئی تفصیل نہیں لکھی، بلکہ سادہ حقیقی مفاہیم پر اکتفاء کیا ہے، علامہ طبری لکھتے ہیں:

" (ولقد جاءت رسلنا) ، من الملائكة وهم فيما ذكر، كانوا جبريل وملكين آخرين. وقيل: إن الملكين الآخرين كان ميكائيل وإسرافيل معه[1]"

(بے شک ہمارا پیغام لائے فرشتے اور جن کا ذکر ہے وہ جبرائیل میکائیل اور دو مزید فرشتے میکائیل اور اسرافیل تھے)

یہاں فرشتے اللہ تعالیٰ کی جانب سے قوم لوط کی بد کرداریوں پر عذاب لے کے آئے تھے جن کی مہمان نوازی میں ابراہیم علیہ السلام نے بچھڑا پیش کیا جس پر فرشتوں نے انکار کیا تو ابراہیم علیہ السلام نے وجہ دریافت کی تو انہوں نے ساری بات عرض کی علامہ سمرقندی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

فَلَمَّا رَأى أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً قالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أُرْسِلْنا إِلى قَوْمِ لُوطٍ[2]

(جب انہوں نے دیکھا کہ وہ اس کی جانب ہاتھ نہیں بڑھا رہے تو آپ ان سے خوف محسوس کرنے لگے تو انہوں نے کہا کہ خوف نہ کرو ہمیں قوم لوط کی جانب بھیجا گیا ہے)

گویا، یہ ایک خاص واقعہ جو قوم لوط کے ساتھ پیش آیا اور فرشتے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب لے کے آئے اس کی ایک تاریخی حقیقت ہے جبکہ ابن عربی کی ملکوت، جبروت اور لاہوت کی وضاحتیں سوائے ابن عربی کے کسی نے نہیں کی ہیں آپ اپنی ان وضاحتوں میں منفرد ہیں۔

اسی طرح، قرآن مجید کی آیت مقدسہ:﴿وَقَالُواْ ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ ٱلَّذِيٓ أَذۡهَبَ عَنَّا ٱلۡحَزَنَۖ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُور شَكُورٌ﴾[3](شکر نعمت کے طور پر)(کہیں گے سب ستائشیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے دور کر دیا ہم سے (غم واندوہ)یقیناً ہمارے رب بخشنے والا بڑا قدر دان ہے) کی وضاحت میں ابن عربی نے صوفیانہ تصور فنا اور بقا سے کرتے ہیں:

"بالسنة احوالهم وباقوالهم عند اتصالهم بجمع الصفات الحميده حالةالبقاءبعدالفناء"[4]

(اپنی زبان حال اور قال سے، کل صفات حمیدہ سے اتصال ہو کے وقت حالت بقاء، بعد الفنا میں کہتے ہیں)

ابن عربی کے خیال ایسی صورت حال میں انسان کی طبیعت کی تازگی اور سکون کا تعلق اعمال حسنہ سے ہوتا ہے اور غم اور حزن کا تعلق گناہ اور برائی سے ہوتا ہے:

1۔ الطبری، **جامع البیان** 15/ 381۔382

2۔ السمرقندی، **بحرالعلوم** 160/2

3۔ فاطر:34

4۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 161/2

" اللازم الفوات الکمالات الممکنۃ بحسب الاستعدادات بھیتہ لنا ایاہا فی ہذا الوجود الحقانی جزاونا منہ اوفیٰ وابقیٰ مما نستحقہ بسعینا"[1]

(تمام تعریفیں اس ذات کے لیے ہیں جس نے ہمارے وجود حقانی کو طاقت عطا فرمائی ہے اور ہم کو پوری جزا عطا فرمائی اس کو باقی رکھا ہماری کوشش کے بدلہ میں جس کے ہم مستحق تھے)

اللہ تعالیٰ انسانی وجود کو بہت سے استعدادات عطا فرمائی ہیں، اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں مگر اس میں کچھ ایسے کمالات ہیں جن کو مثبت طرز پر استعمال کرنا ضروری ہے۔ یہ جہاں اللہ تعالیٰ کی عطا ہے وہیں یہ انسان کو اس کی محنت کا صلہ بھی ہے۔

دوسری جانب، تفسیر ابن عباس میں اس آیہ مقدسہ کی تفسیر اس طرح ہے:

"الْحمد لِلَّهِ} الشُّكْر والْمنَّة لله {الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحزن} حزن الْمَوْت والزوال وأهوال يَوْم الْقِيَامَة وَيُقَال حزن مخاطرة الدُّنْيَا {إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ} للذنوب الْعَظِيمَة {شَكُورٌ} للأعمال الْيَسِيرَة"[2]

(تمام تعریفیں یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر اور اللہ تعالیٰ کا احسان جو ہم سے غم لے گیا اور غم موت کا اور زوال کا اور قیامت کی تباہ کاریوں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غم دنیا کے خطرات کا بے شک ہمارا رب مغفرت فرمانے والا ہے ہمارے بڑے گناہوں کی اور شکور ہے ہماری آسان نیکیوں پر)

اللہ تعالیٰ نے سورہ مریم میں فرمایا:﴿وَٱذۡكُرۡ فِي ٱلۡكِتَٰبِ مُوسَىٰٓۚ إِنَّهُۥ كَانَ مُخۡلَصا وَكَانَ رَسُولا نَّبِيّا﴾[3] (اور ذکر فرمایئے کتاب میں موسیٰ علیہ السلام کا بیشک وہ (اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے) تھے اور رسول اور نبی تھے)

اس آیہ مقدسہ کی وضاحت میں ابن عربی لکھتے ہیں:

"مخلصا بالکسر ، ای: مجردا ذاتہ وعلمہ فی السلوک لوجہ اللہ لم یلتفت الیٰ ماسواہ من جہۃ حتیٰ صفاتہ تعالیٰ بل نفاہا عن ذاتہ وہو مازاغ البصرو ماطغیٰ بقولہ ارنی انظر الیک ومخلصا باالفتح ای اخلصہ اللہ عن انانیۃ وافنیٰ البقیتہ منہ مخلص من الطغیان المذکور باالتجلی الذاتی التام واستقام بتمکین اللہ ایاہ[4]"

(موسیٰ علیہ السلام اپنی ذات سے مجرد تھے اور سلوک میں ان کا علم لوجہ اللہ تھا اور وہ کسی بھی طرح غیر اللہ کی جانب التفات نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی جانب بھی نہیں بلکہ صفات الٰہیہ کی ذات الٰہیہ سے نفی کرتے تھے۔ یہی مازاغ البصر وما طغیٰ اور رب ارنی انظر الیک ہے اور یہ معنیٰ مخلص کی لام کے کسرہ کے ساتھ ہے اگر

---

1 ۔ ابن عربی ، **تفسیر ابن عربی161/2**

2۔ابن عباس ، **تنویر المقیاس**۔367

3۔مریم:51

4ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 8/2

مخلص کی لام کی زبر ہو تو معنیٰ یہ ہو گا اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی ذات کی انانیت سے خلاصی عطا فرمائی اور ان سے بقیت کو فنا کر دیا تو کامل ذات تجلی کے ساتھ طغیان مذکور سے خلاصی دے دی اور انہیں خالص فرما دیا اور انہیں تمکین الٰہی سے استقامت دی جیسا کہ فرمایا)

اس ساری بحث میں یہ واضح کیا گیا کہ انسان جب تک انسان کو اپنی توجہ اللہ تعالیٰ کی جانب کرنے میں کوشش کرنا پڑتی ہے اور اپنی سوچ کو ایک سمت میں مرتکز کرنا ہوتا ہے تب تک انسان صاحب تلوین ہے کیونکہ اس کے اخلاص کو ابھی مزید خلوص کی ضرورت ہے مگر جب اس کی فکر کو استقامت مل جاتی ہے تو اب یہ انسان صاحب تمکین ہو جاتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے استقامت مل جاتی ہے۔

اس حالت میں وہ ذات الٰہی کی جانب اس طرح متوجہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ اس کا کسی کی جانب التفات نہیں ہوتا ہے حتیٰ کہ صفات ذات کی جانب بھی نہیں یعنی اپنی منزل اور مقصد میں اس قدر مخلص ہوتا ہے کہ تذبذب کا شکار نہیں ہوتا جب اس مقام پر پہنچتا ہے تو مخلص ہو جاتا ہے جب اس منزل پر پہنچتا ہے تو اسے اپنا کمال نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا انعام خیال کرتا ہے اور اپنے ذاتی کمال کی نفی کر دیتا ہے اور اپنی ذات کو انا کے خیال سے نکال لیتا ہے تو یہ مخلص ہو جاتا ہے لام کی زبر کے ساتھ اور مقام تمکین پر استقامت اختیار کر لیتا ہے۔

اسی آیت مقدسہ کیو ضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں:

"إِنَّهُ كانَ مُخْلِصًا) بكسر اللام من المخْلِص، بمعنى: إنه كان يخلص لله العبادة، ويفرده بالألوهية، من غير أن يجعل له فيها شريكا"[1]

(بے شک وہ مخلص تھے لام کے کسرہ کے ساتھ اس کا معنیٰ ہے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مخلص اور اس کی الوہیت میں اس کو اکیلا جاننے والے اس کے علاوہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے)

1۔ الطبری، جامع البیان 209/18

باب دوم:

باب دوم: عقیدہ توحید اور رسالت سے متعلق ابن عربی کی اشاری توضیحات کا جائزہ

فصل اول: عقیدہ توحید اور وحدۃ الوجود

فصل دوم: علم وحی اور تصور رسالت

فصل اول:

عقیدہ توحید اور وحدۃ الوجود

عقیدہ توحید اسلام کا بنیادی اور منفرد عقیدہ ہے باقی سب عقائد اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس کی تفصیلی وضاحت فرمائی گئی ہے۔ سورہ اخلاص ﴿قُلۡ --- ٱللَّهُ ٱلصَّمَدُ --- ﴾[1] اس سلسلہ میں قرآن حکیم کے بیان کا خلاصہ ہے۔ سورہ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَإِلَٰهُكُمۡ إِلَٰهٞ وَٰحِدٞ لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا﴾[2] (اور تمہارا خدا ایک خدا ہے نہیں کوئی اور خدا بجز اس کے) تمہارا معبود واحد ہے۔ سورہ اخلاص میں "احد" سے مثلیت کی نفی کی ہے اور اس آیہ مقدسہ میں عقیدہ بیان فرما کر عملی اقدام کا حکم دیا کہ تمہارا رب ہم مثل ہونے سے پاک ہے تو مستحق عبادت بھی وہی ہے۔

لہٰذا، علامہ زمخشری لکھتے ہیں ہیں" ان الله واحد لا ثانی له "[3](اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا کوئی ثانی نہیں) اسی طرح، علامہ بغوی لکھتے ہیں۔ "لانظیر له ولا شریک له" (اس کا شریک بھی کوئی نہیں اور اس کا ہم مثل بھی کوئی نہیں)

قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر یہ حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ عقیدہ کیوں ضروری ہے اور اس پر کیا دلائل ہیں؟ مثال کے طور پر سورۃ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دوران قید اپنے ساتھی قیدیوں کو مخاطب کے کر کے کہا:

﴿يَٰصَٰحِبَيِ ٱلسِّجۡنِ ءَأَرۡبَابٞ مُّتَفَرِّقُونَ خَيۡرٌ أَمِ ٱللَّهُ ٱلۡوَٰحِدُ ٱلۡقَهَّارُ﴾[4]

(اے قید خانہ کے میرے دو رفیقو (یہ تو بتاؤ) بہت سے جدا جدا خدا بہتر ہیں یا ایک جو سب پر غالب ہے)

یعنی فرمایا کہ خدائی صفات کا، کئی ہستیوں میں اجزاء میں ہونے سے بہتر ہے کہ ایک غالب و طاقتور ہستی ہو جو سب پر حاوی ہو۔

1۔ الاخلاص 1۔4

2۔ البقرۃ:163

3۔ الزمخشری ، ابو القاسم محمود بن عمر ، **الکشاف حقائق غوامض التنزیل** (دار الکتب العربی بیروت 1985ء) 4/ 817

4۔ یوسف:39

امام ابوالحسن ماتریدی فرماتے ہیں

"لانه اذاعبد بعضاًواجتهد فی رضائهم اسخط باقیین "[1]

(اگر انسان کئی خداؤں کی عبادت کرے اور انہیں راضی کرنے کی کوشش کرے تو(باقی ناراض ہو جائیں گے)

گویا یہ ممکن ہی نہیں کہ سب کی جانب برابر توجہ دے سکے یا ایک دن ایک کی عبادت کرے اور دوسرے دن دوسرے کی تو یہ ممکن نہیں کہ انہیں مطمئن کر سکے کیونکہ انسان اپنے ارتکاز میں صدا ایک جیسا نہیں ہوتا۔ جب معبود ایک ہی ہو گا تو ساری توجہ اسی کی جانب ہو گی۔

قرآن میں ایک دوسرے مقام پر یہ حقیقت اگر اس کائنات میں کئی خدا ہوں تو کائنات میں فساد ہی فساد ہو:

﴿لَوۡ كَانَ فِيهِمَآ ءَالِهَةٌ إِلَّا ٱللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾[2] (اگر ہوتے زمین و آسمان میں کوئی دو خدا سوائے اللہ تعالیٰ کے تو یہ دونون برباد ہو جاتے)

اس کی وضاحت میں علامہ سمرقندی فرماتے ہیں:

"لوكان فی السماء والارض اٰلهة غيرالله لفسدتا يعنی خربت السمٰوت والارض ولهلک يعنی ان التدبير لم يكن مستوياً "[3]

(اگر زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور خدا بھی ہوتا تو زمین و آسمان کا سارا سلسلہ خراب ہو جاتا اور سب کچھ ہلاک ہو جاتا یعنی کوئی بھی تدبیر ایک جیسی نہیں ہو سکتی)

تفسیر بالماثور میں عقیدہ توحید:

تفسیر بالماثور میں عقیدہ توحید کو شرک کے مقابلہ میں لا کر واضح کیا گیا ہے اور خالق کو ہر اعتبار سے ، اعلیٰ ترین صفات کی بنیاد پر، برتر ثابت کیا گیا ہے۔ اسی بنیاد پر مستحق عبادت صرف ایک خدا کی ذات ہے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ علامہ ابن جریر طبری ﴿وَإِلَٰهُكُمۡ إِلَٰهٞ وَٰحِدٞۖ لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلرَّحۡمَٰنُ ٱلرَّحِيمُ﴾[4] (ہمارا اور تمہارا معبود واحد ہے ہم اسی کے سامنے جھکتے ہیں) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

1۔ الماتریدی ، ابو المنصور ، محمد بن محمد ، **تفسیر ماتریدی تاویلات اهل السنة** (دارلکتب العلمیه بیروت 2005ء)، 241/6

2۔ الانبیاء: 22

3۔ السمرقندی ، **بحرالعلوم** 423/22

4۔ البقرہ: 163

"والذی یستحق علیکم ایہاالناس الطاعۃ لہ ویستوجب منکم العبادۃ معبود واحدورب واحد فلانعبدوا غیرہ ولاتشرکو امعہ"[1]

(وہ ذات جو مستحق عبادت ہے اور جس کی عبادت اور طاعت تم پر لازم ہے وہ معبود واحد اوررب العالمین ہے۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراو)

چونکہ انسان کو ضرورت کی تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں وہی ذات واحد لائق عبادت ہے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ:

"فان من تشرکو ا معہ فی عبادتکم ایاہ ہوخلق من خلق الٰہکم مثلکم والٰہکم الٰہ واحد لا مثل لہ ولا نظیر" [2]

(پس جس کو تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں شریک کرتے ہو وہ دوسری مخلوقات کی طرح مخلوق ہی ہے جیسے باقی سب معبود تم نے بنا رکھے ہیں اسی طرح یہ بھی ہیں۔ تمہارا حقیقی معبود وہی ذات ہے جس کی کوئی مثل اور نظیر نہیں)

اللہ تعالیٰ ہر مثل اور نظیر سے مبرا ہے سب کائنات کا خالق ہے مالک ہے پالنے والا ہے اس کا کوئی ہم سر نہیں نہ ذات میں نہ صفات میں وہ لاشریک ہے واحد ہے۔ واحدانیت کا معنیٰ جو اپنی مشابہت اور مثل سے بالاتر ہو جو اپنے شریک سے بے نیاز ہو جس جیسا کائنات میں دوسرا کوئی نہ ہو فرمایا:

"معنیٰ واحدانیۃ اللہ معنیٰ فی نفی الاشتباہ والامثال عنہ کما یقال فلا ن واحد الناس وہو واحدہ قومہ یعنی بذالک لیس لہ فی الناس مثلہ ولا لہ فی قومہ شبیہ ولا نظیر"[3]

(جس کی مثل اور شبیہ نہ ہو جیسے کہا جاتا ہے فلاں شخص اپنے قبیلے میں واحد ہے نہ تو اس کی اپنی قوم میں اس کا ہم مثل ہے اور نہ ہی انسانوں میں کوئی اس جیسا ہے)

یہ ایسا عقیدہ ہے جو کسی پیغمبر کی دعوت میں تبدیل نہیں ہوا بلکہ ہر زمانہ میں شعائر دین میں اس عقیدہ کو مرکزی حیثیت رہی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا

:﴿ثُمَّ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ أَنِ ٱتَّبِعۡ مِلَّةَ إِبۡرَٰهِيمَ حَنِيفا وَمَا كَانَ مِنَ ٱلۡمُشۡرِكِينَ﴾[4]

(پھر ہم نے وحی فرمائی اے (حبیب ﷺ) آپ کی طرف پیروی کرو ملت ابراہیم کی جو یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھا اور مشرکوں سے نہیں تھا)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عقیدہ توحید کی تشریح میں علامہ ابن کثیر لفظ حنیفاً کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

1۔ الطبری، **جامع البیان**، 2/ 745

2۔ الطبری، **جامع البیان** 2/ 745

3۔ ایضاً

4۔ النحل: 123

" الحنیف ہو المائل عن الشرک قصداً ای تارکاً عن بصیرۃ مقبل علیٰ الحق لکلیۃ لا یصدہ عنہ الصاد لا یروہ عنہ الراد"[1]

(حنیف سے مراد ایسی ذات ہے جس کی طبیعت میں توحید کی محبت ڈال دی گئی ہو اور شرک سے نفرت اپنی بصیرت کی وجہ سے کرے یعنی وہ موحد خالص ہو نہ اس کو کوئی طاقت سے روک سکے اور نہ ہی کوئی اسے مجبور کر سکے اور نہ ہی کوئی دلائل سے اس کا رد کر سکے جس کی قوت کے سامنے سب زیر ہو جائیں)

کائنات جو نعمتوں سے لبریز ہے یہ اپنے خالق و مالک واحد کا پتہ دیتی ہے ۔ انسان کی اپنی زندگی بھی اس کی ضروریات بھی نعمتوں پر مشتمل ہیں اور ان ساری نعمتوں میں اضافہ کی بھی اللہ تعالیٰ نے خبر دی:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعۡبُدُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُمۡ وَٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ ٱلَّذِي جَعَلَ لَكُمُ ٱلۡأَرۡضَ فِرَٰشا وَٱلسَّمَآءَ بِنَآء وَأَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآء فَأَخۡرَجَ بِهِۦ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزۡقا لَّكُمۡۖ فَلَا تَجۡعَلُواْ لِلَّهِ أَندَادا وَأَنتُمۡ تَعۡلَمُونَ﴾ [2]

(اے لوگو عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے کچھ پھل تمہارے کھانے کے لئے پس نہ ٹھہراؤ اللہ تعالیٰ کے مد مقابل اور تم جانتے ہو)

توحید کی عملی صورت خود کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھکانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتیں معرفت توحید کی دعوت دیتی ہیں انسان جہاں تصور توحید میں پختگی حاصل کرتا ہے وہیں اس ذات کے احکامات بجالانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ تا کہ اسے اللہ تعالیٰ کا قرب ملے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کی غرض سے اپنی راتوں کی نیندیں بھی قربان کرتا ہے اور اسے لذت کی دولت ملنے لگتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمایا ﴿تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمۡ عَنِ ٱلۡمَضَاجِعِ يَدۡعُونَ رَبَّهُمۡ خَوۡفا وَطَمَعا﴾[3](جو اپنے پہلوؤں کو بستروں سے الگ رکھتے ہیں امید اور خوف کی ملی جلی کیفیت سے اور اپنے رب کو یاد کرتے ہیں) اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کو کس قدر پسند کیا کہ اس کی وضاحت خود فرما دی یہ افراد اپنے رب کی جانب توجہ کے طالب ہیں اپنی سب خواہشوں کو اپنے رب کی محبت پے قربان کرتے ہیں۔)

اگر انسان ایمان کے بعد اپنے رب کی بندگی کا اہتمام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسے ایسی نعمتیں ملتی ہیں جن کو دنیا کی نعمتوں کی صورت میں سمجھنا بہت مشکل ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔لَهُمۡ غُرَف مِّن فَوۡقِهَا غُرَف[4](ان

1۔ ابن کثیر ابو الفداء اسماعیل بن عمر ، **تفسیر القرآن العظیم** (دار الکتب العلمیہ بیروت2009ء) ، 2/ 373

2۔ البقرۃ:21

3۔ السجدہ : 16

4۔ الزمر: 20

کے لئے جنت کے بالا خانے ہیں) علامہ سمرقندی فرماتے ہیں یہ جنت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے انعام ملے گا اس لیے کہ انہوں نے دنیا میں رہ کر مشکلات کو صبر سے برداشت کیا اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو بجالائے تو اجر میں ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بلند مقامات ملیں گے۔

عقیدہ توحید سے متعلق ابن عربی کی تعبیرات:

علامہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اپنی تفسیر میں سب سے پہلے جس آیہ مقدسہ کے تحت عقیدہ توحید کی وضاحت کی ہے۔ وہ یہ آیت ہے ﴿وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰه وَٰحِد لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلرَّحْمَٰنُ ٱلرَّحِيمُ﴾[1] (اور تمہارا خدا ایک خدا ہے نہیں کوئی اور خدا بجز اس کے جو بڑا مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے)

اس آیہ مقدسہ کے تحت ابن عربی لکھتے ہیں:

" معبودکم الذی خصصتموہ بالعبادۃ ایہاالمومنون معبود واحد بالذات واحد لا شی فی الوجود غیرہ لاوجود سواہ فیعبدو ا فکیف علیکم الشرک بہ و غیرہ العدم البحث فلاشرک الا للجہل بہ [2]

(تمہارا وہ معبود جس کو تم نے عبادت کے لے خاص کیا ہے ،اے موحدین وہ بالذات مطلق اور واحد ہے اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ پس تم اسی کی عبادت کرو تم اس کے ساتھ کیسے شریک ٹھہرا سکتے ہو جبکہ اس کے علاوہ باقی سب عدم بحث ہے اور شرک اس ذات سے لاعلمی اور جہالت ہے اور کچھ نہیں)

1۔ علامہ ابن عربی کے مطابق بہت سے ایسے اصول دین ہیں جو فروعی ہیں حالات زمانہ بدلنے سے ان میں تبدیلی آجاتی ہے۔ مگر توحید ایسا اصول دینی ہے جو تغیر و تبدل سے مبرا ہے:

"فی التوحید و اصول الدین التی لا تتغیر فی الشرائع کامر المبداء والمعاد والحشر والجزاء وامثالہا لا فروع الشریعۃ و اوضاعوہا واحکامہا فانہا تتغیر بحسب المصالح واختلاف الازمنۃ والطبائع وماعلیہ احوال الناس من العادات والخلائق [3]

(عقیدہ توحید اور اصول دین کسی بھی شریعت میں تبدیلی نہیں ہوئے جیسے مبداء اور معاد حشر اجزا اس کی امثلہ ہیں جب کہ شریعت کی فروع اور عوضاع میں تبدیلی ہوتی ہے یہ مصالح کے بدلنے سے اور طبیعت اور زمانہ کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں)

1۔ البقرۃ:163

2۔ ابن اعربی، **تفسیر بن عربی** ، 84/1

3۔ ایضاً

2۔ علامہ ابن عربی، توحید بالذات کو مقدم اور توحید افعال کو دوسرے درجہ میں رکھتے ہیں ان کے خیال میں ایک جہت توحید جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانوں کو تعلیم دی جاتی ہے اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنی ذات کے بارے میں باخبر کرتا ہے دوسری جو ہم اس تعلیم کو جاننے کے بعد عمل کی صورت میں بجالاتے ہیں جو توحید افعال کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

" اقدم التوحید من جہۃ الحق لامن جہتنا فان التوحید من طرفنا توحید الافعال بذا ہو التوحیدالذات ولما بعدہذاالتوحیدعن مبالغ عن افہام الناس تنزل الیٰ مقامالتوحید الافعال لیستدل بہ "[1]

(توحید اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقدم ہے ہماری جانب سے نہیں ہماری جانب سے توحید توحید افعال ہے اور یہ وہ مقام توحید ذات جس کو سمجھ لینے کے بعد لوگ توحید افعال کے مقام پر اترتے ہیں تاکہ توحید افعال کو توحید ذات پر بطور دلیل لائیں)

اس بحث میں تقدیم توحید ذات کو ہے۔ یہ سمجھنے کے بعد توحید افعال، یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ماننے کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے انسان کی جانب سے توحید افعال کو تقدیم حاصل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے توحید ذات کو تقدیم ہے۔

ابن عربی کے بقول توحید ذات سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کو اس کائنات میں فکر اور اللہ تعالیٰ کی ذات تک رسائی کے بعد اس کی معرفت کا حاصل ہونا ہے اور نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملنے والے احکامات کو ماننا یہ توحید ذات ہے۔ یعنی وہ شناسائی اور احکامات جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے کو ملتے ہیں اور انسان کا دل انہیں تسلیم کرلیتا ہے۔ یہ توحید فی الذات ہے۔ اسکے بعد انسان عملی طور پر اللہ تعالیٰ کے احکام بجالاتا ہے اور سب احکام کو پیش نظر رکھ کر اس کے مطابق عملی تصویر بن جاتا ہے یہ توحید فی الافعال ہے۔ ابن عربی کہتے ہیں تقدیم توحید فی الذات کو ہی ہوگی کیونکہ یہ خالق کی جانب سے ہے۔

علامہ ابن جریر توحید کی وضاحت میں فرماتے ہیں واحد کے چار معانی ہیں واحد فی الجنس ، جز لامتفرق ، تشبیہ بالاشیا ء ، نفی النظیر عنہ [2](اپنی جنس میں واحد، ایک جز جو تقسیم نہ ہوسکے، تشبیہ میں بھی منفرد، اس کی مثل کی بھی نفی ہو)

توحید ذات توحید افعال میں اللہ تعالیٰ حاکم ہے جو انسان کو احکامات بجالانے کا حکم دیتا ہے اور اس پر دلیل کائنات کی نعمتیں ہیں۔ جب انسان کو یہ ادراک ہو جاتا ہے اور انسان اپنے دل سے اس ذات کو تسلیم کرلیتا ہے اب عملی طور پر اس کی عبادت میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کی جانب سے اقرار توحید ہوتا ہے جس کی عملی صورت اللہ تعالیٰ کے احکامات

---

1 ۔ ابن عربی ،**تفسیر ابن عربی**، 394/1

2۔ الطبری ،**جامع البیان**، 745/2

کو ماننا ہے اسے توحید افعال کہتے ہیں مگر جب بات تقدیم و تاخیر کی ہو تو توحید ذات کو تقدیم اور توحید افعال کو تاخیر ہے۔"
اقدم التوحید من جہت الحق لامن جہتنا [1] (تقدیم، توحید ذات کو ہے نہ کہ توحید افعال کو کیونکہ توحید ذات اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے)

3۔ توحید ذات کے دلائل: اللہ تعالیٰ نے توحید کے دلائل میں، اپنی نعمتوں کو بطور دلیل پیش کیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:
يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعْبُدُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُمْ وَٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ٱلَّذِي جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ فِرَٰشا وَٱلسَّمَآءَ بِنَآء وَأَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآء فَأَخْرَجَ بِهِۦ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزْقا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُواْ لِلَّهِ أَندَادا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ [2]

(اے لوگو عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے کچھ پھل تمہارے کھانے کے لئے پس نہ ٹھہراؤ اللہ تعالیٰ کے مد مقابل اور تم جانتے ہو) اس آیہ مقدسہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ اگر تم اس کائنات میں غور کرو گے تو تمہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بے شمار مظاہر نظر آئیں گے۔ تو جس ذات نے تمہیں اس قدر نعمتوں سے نوازا ہے عبادت بھی اسی کا حق ہے۔)

اس آیت کی وضاحت میں ابن عربی لکھتے ہیں:

" علق العبودیۃ باالربوبیۃ لیستانسو ا بروبۃ النعمۃ فیحبوہ کما قال خلقت الخلق وتحببت الیہم بالنعیم فیشکرہ بازائہا اذالعبادۃ شکر فلا تکون الا فی مقابلۃ النعمۃ" [3]

(عبادت کو ربوبیت سے متعلق کیا گیا ہے تاکہ نعمت سے انس اور محبت کا ظاہر ہونا اس کی ذات سے محبت کا باعث بنے جیسا کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کیا اور ان کے لئے نعمتوں کو پسند کیا تاکہ وہ اس کو پہچاننے کے بعد اس کا شکر کریں تو عبادت اس کا شکر ہے جو نعمت کے بدلے میں ہے)

ابن عربی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو نعمتیں عطا کی ہیں ان نعمتوں سے انسان کے اعضاء اور جسم بڑھتا ہے تو انہیں اعضا سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے تاکہ یہ اعضا جس ذات کی نعمتوں سے پروان چڑھے ہیں اسی ذات کے سامنے جھکیں بھی نہ کہ غیر کے سامنے اور دوسری بات نعمتوں کا سبب بھی ابن عربی نے بیان کیا یہ سبب محبت ہے تو انسان کو بھی عبادت محبت سے کرنی چاہیئے نہ کہ مجبوری سے اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا فلاتجعلو ا للہ انداداً پس اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناو یعنی خود کو کسی غیر کے سامنے نہ جھکاو تو انسان کے لئے یہ کسی بھی اعتبار سے روا نہیں کہ وہ خود کو کسی غیر

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 84/1

2۔ البقرۃ:21

3۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 40/1

کے سامنے جھکائے فلاتحق العبادة الا لہ [1] پس عبادت صرف اسی کا حق ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کا حکم ان نعمتوں پر شکر کی وجہ سے دیا ہے وہیں اس عبادت پر مزید انعام کا وعدہ بھی کیا ہے کیونکہ عبادت یہ بدنی مشقت ہے اس پر مزید انعام جنت یہ بدنی سعادت ہے۔

تفسیر بالماثور میں، علامہ ابن جریر نعمت کی وجہ سے منعم کی عبادت کا حکم دیتے ہیں جب کہ ابن عربی نعمت کو تو معرفت توحید کا سبب قرار دیتے ہیں مقصد نہیں اور منعم کو عبادت کا مستحق قرار دیتے ہیں جبکہ ابن عربی فرماتے ہیں کہ نعمت سے اس ذات تک رسائی حاصل کرو مگر عبادت نعمت کی وجہ سے نہیں بلکہ نعمت پیدا کرنے کا جو چیز سبب بنی وہ محبت ہے اس کی وجہ سے کرو۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس محبت کو محسوس کرو جو نعمت کو پیدا کرتے ہوئے مالک کو اپنی مخلوق سے تھی۔

-4

ابن عربی نعمت کی افادیت کو خالق تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں مگر نعمت کی وجہ سے عبادت نہیں بلکہ اس محبت کی وجہ سے ہے جو انسان کے لئے ضروریات کو پیدا کرنے کا باعث بنی یہی جذبہ محبت ہے جو انسان کی عبادت میں اخلاص اور عبادت کو قرب الٰہی کا احساس دلاتا ہے۔ تفسیر بالماثور میں نعمت عبادت کا سبب ہے جبکہ تفسیر ابن عربی میں محبت عبادت کا سبب ہے تو ابن عربی عبادت کے اخلاص کو جنت میں حصول کا سبب قرار دیتے ہیں:

" وغاية بذه العبادة الوصول الى الجنة بى كمال عالم الافعال فاالله مهد لهم اراضى نفوسهم" [2]

(اس عبادت کا مقصد جنت تک پہنچنا ہے جو عالم افعال کا کمال ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسا مقام بنایا ہے جہاں ان کے نفوس راضی رہیں گے)

-5

ان کے خیال میں جنت اگرچہ عالم جزا ہے مگر انسان کے جسم کی ضروریات جو دنیا میں تھیں وہی جنت میں بھی ہوں گی۔ کیونکہ عبادت نعمت کے بدلے میں تھی تو اس کی جزا بھی نعمت کی صورت میں ملے گی جو جسم کو ہی راحت دے گی۔ عمل اگر اعضاء تک رہے تو اس کا اجر بھی جسمانی جزا یعنی جنت کی نعمتوں کی صورت میں ملے گا۔ اگر عبادت کا اثر دل میں چلا جائے تو عادات اور اخلاق بھی بدل جاتے ہیں اللہ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: ﴿لَٰكِنِ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوۡاْ رَبَّهُمۡ لَهُمۡ

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 40/1

2۔ ایضاً 41/1

غُرَف مِّن فَوْقِهَا غُرَف﴾[1] (لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں ان کے لئے بالا خانے ہیں جن کے اوپر بالا خانے ہیں۔)

ابن عربی لکھتے ہیں:

"افعالہم وذواتہم فی التجرید والتفرید من اہل التوحید" [2]

(ان کے افعال ان کی ذوات انفراد اور تجرید میں ہوتی ہیں ان کے سب افعال ایک ذات کے لئے خاص ہوتے ہیں یعنی وہ حقیقت میں اہل توحید ہوتے ہیں۔)

6۔ مقام فنا:

ابن عربی کے ہاں اہل توحید کی زندگی کا منشاء اور مقصد صرف ایک ذات باری تعالیٰ ہوتی ہے۔ اسی کی جانب ساری توجہ ہوتی ہے۔ اسکے بدلہ میں ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے مختلف درجات عطا ہوتے ہیں:

" لہم غرف فوقہا غرف ای مقامات و احوال بعضہا فوق بعض کالتوکل بفنا ء الافعال فوقہ الرضا بفناء الصفات فوقہ الفنا فی الذات "[3]

(اس پر اللہ تعالیٰ بعض مقامات پر بلند مقامات اور احوال عطا فرماتا ہے مثلاً توکل یہ افعال کی فنا ہے اس سے اوپر رضا ہے یہ صفات کی فنا ہے اس سے اوپر فنا فی الذات ہے۔)

یہ سب توحید افعال کا نتیجہ ہے کہ ایک سے ایک بلند مقام ہے اس کے بعد یہ اثرات انسان کے وجود میں اثر کرنے لگتے ہیں اور انسان کی ذات سے بری صفات چھٹنے لگتی ہیں اسکو مذکورہ مقامات عطا کئے جاتے ہیں۔ توکل سے رضائے ربانی کی منزل تک، جو کہ ان کے بقول فنا فی الذات کا مقام ہے۔

7۔ غرف فوقہا غرف کی تقابلی وضاحت: تفسیر بالماثور میں غرف سے مراد ایسے بالا خانے اور بلند مقامات ہیں جہاں انسان ہر قسم کی تکلیف غم اور مرض سے محفوظ رہے گا ابن جریر فرماتے ہیں:

"وہم فی الجنۃ "اٰمنون من الموت والہرم والمرض والعداوۃ غیر ذالک" [4]

(وہ جنت میں ہر قسم کی مرض، موت اور دشمنی سے محفوظ رہیں گے)

1۔ الزمر: 20

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 191/2

3۔ **ایضاً**

4۔ **ایضاً**

گویا یہ سب چیزیں اگر وجود میں موجود ہیں تو پریشانی اور اضطراب انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور انسان مختلف قسم کی پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے جب انسان جنت میں جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ہر قسم کی مشکلات سے بچالے گا۔ جب کہ دنیا میں ہر صورت اسے صبر ہی کرنا پڑے گا۔ جبکہ ابن عربی کا تصور اس سے مختلف ہے وہ کہتے ہیں سب چیزیں انسان اہل توحید ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرمادیتا ہے اور دنیا میں اسے خاص کیفیات مل جاتی ہیں جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل بھروسہ کرتا ہے:

فرق یہ ہوا کہ وہ احساس اور سکون کی کیفیات جو تفسیر بالماثور میں جنت میں دیئے جانے کا وعدہ کیا جاتا ہے ابن عربی کے نزدیک وہ دنیا میں سکون کی صورت میں ملتی ہیں اور آخرت میں انعام کی صورت میں ملیں گی اور ان صورتوں میں جو جنت کی محبت چاہتے ہیں انہیں جنت ملے گی جو اللہ کو چاہتے ہیں انہیں خدا ملے گا۔ گویا ابن عربی ان غرف سے مراد توکل، رضا مراد لیتے ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ اپنی ذات پر یقین کامل کی کیفیت سے نواز دیتا ہے ہر انسان ہر حال میں اپنے رب سے راضی رہتا ہے یہ بھی کسی جنت سے کم نہیں ہے۔

8۔ صرف یہیں تک نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو یہ توفیق دیتا ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے رب سے راضی رہتے ہیں اور اپنی راتوں کو اس کی یاد میں تنہائی میں بصر کرنے لگتے ہیں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا﴿تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ ٱلْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفا وَطَمَعا وَمِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ﴾[1] (دور رہتے ہیں ان کے پہلو بستروں سے پکارتے ہیں اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے اوران نعمتوں میں سے جو ہم نے ان کو عطا کی ہیں خرچ کرتے ہیں) اس کی وضاحت میں ابن عربی فرماتے ہیں:

> " بالتجرد عن الغواشی الطبیعة والقیام البدنیة عن الجهات بمحو ا لهیئات بالتوجة الیٰ التوحید فی المقام القلب خوفاً من الاحتجاب لصفات النفس بالتلوین وطمعاً فی لقاء الذات"[2]
>
> (غواشی طبیعہ کے تجرد کے ساتھ اور بدن کی خواب گاہوں کے قیام اور ہیات کو مٹانے کی جہات سے نکلنے کے ساتھ ان کی کروٹیں الگ ہو جاتی ہیں اور مقام قلب میں توحید کی جانب توجہ کے ساتھ تلوین کے ساتھ صفات نفس کے احتجاب کے خوف سے اور ملاقات ذات کی امید میں اپنے رب کو پکارتے ہیں)

1۔ السجدہ: 16

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 141/2

9۔ عقیدہ توحید کے شخصیت پر اثرات:

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ رات کی عبادت سے انسان کی ذات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ نفس سے برائی چھٹ جاتی ہے اور قلب سے حجابات دور ہو جاتے ہیں اور انسان کی توجہ مادیات اور مخلوقات سے ہٹ کر خالق کی جانب ہو جاتی ہے۔ اور انسان کو مسلسل اس بات کا خوف رہتا ہے کہ کہیں میرا نفس مجھے اپنا شکار نہ بنالے اس احساس سے انسان کا اللہ تعالیٰ سے قرب بڑھتا ہے اور انسان کا توحید پر یقین کامل ہوتا ہے اس سے قلب اور روح عروج پاتے ہیں۔ اور انسان ان کیفیات کو اپنے وجود میں محسوس کرتا ہے۔

ابن عربی اسے اللہ تعالیٰ کی جانب توجہ اور یقین ذات سے تعبیر کرتے ہیں کہ کے نفس اور تحت الشعور میں روشی پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان رات کی عبادت سے لذت لیتا ہے اور ملاقات ذات کی امید پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ سب اس وقت تک ہی ممکن ہے جب انسان خود کو اللہ تعالیٰ کے احکامات کا تابع کر لیتا ہے۔ اگر اپنی خواہشات کا تابع ہو جائے تو ایسا ممکن نہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَلَوِ ٱتَّبَعَ ٱلۡحَقُّ أَهۡوَآءَهُمۡ لَفَسَدَتِ ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلۡأَرۡضُ وَمَن فِيهِنَّۚ بَلۡ أَتَيۡنَٰهُم بِذِكۡرِهِمۡ فَهُمۡ عَن ذِكۡرِهِم مُّعۡرِضُونَ﴾[1]

(اور اگر پیروی کرتا حق ان کی خواہشات (نفسانی) تو درہم برہم ہو جاتے زمین وآسمان اور جو کچھ ان میں ہے بلکہ ہم ان کے پاس لے آئے ان کی نصیحت تو وہ اپنی نصیحت سے روگردانی کرنے والے ہیں)

اس آیت مقدسہ کی وضاحت میں ابن عربی فرماتے ہیں:

"الصراط المستقیم الذی یدعو ہم الیہ ہو طرق التوحید المستلزم لحصول العدالۃ فی النفس ووجود المحبۃ فی القلب وشہود الوحدۃ فی الروح والذین یحتجبون عن عالم النور بالظلمات وعن العقل بالحسن وعن القدس بالرجس وانما ہو منہمکون فی الظلم والبغضاء ولعداوۃ الرکون الیٰ الکثرۃ فلا جرم انعم عن الصراط نأکبون منحرفون الیٰ ضدہ جہود فی وادوہم فی واد "[2]

(سیدھا راستہ وہ ہے جس کی طرف ان کو بلاتے ہیں وہ توحید کا ہے یہ نفس میں عدالت، دل میں محبت اور روح میں شہادت سے حاصل ہوتا ہے وہ لوگ جو عالم نور سے حجاب میں ہوتے ہیں وہ گناہوں کی وجہ سے ہوتے ہیں عقل سے

1۔ المومنون: 71

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی**، 2/ 65

دوری جس کی وجہ سے قدس سے دوری یہ رجس کی وجہ سے ہوتی ہے۔اور وہ ہمیشہ ظلم زیادتی اور دشمنی میں مصروف ہوتے ہیں تو یقیناً یہ راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اپنی ضدوں کی وجہ سے یہ ایک وادی میں ہیں اور وہ دوسری میں)

10۔اگر ابن عربی کی اس توضیح کو دیکھیں تو اس میں ساری بات تہذیب نفس کی ہے کہ اگر حق کی پیروی کریں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ نفس میں اعتدال لایئں اعتدال کا مطلب اس کو اللہ تعالیٰ کے احکامات کا تابع کریں دل میں محبت ہو اس میں ڈوب کر اس کی عبادت کی جائے اور روح میں شہود وحدت ہو تو یہ سب تبدیلیاں انسان کی اپنی ذات میں ہی ہیں جب کہ دوسری جانب باطل سے مراد وجود میں رجس اور برائی ہے جو انسان کو عالم قدس سے دور کرتی ہے اور اس میں ظلم زیادتی اور دشمنی کو پیدا کرتی ہے۔

ابن عربی نے اس مقام پر بھی تہذیب نفس اور اصلاح احوال کی بات کی ہے جب کہ تفسیر بالماثور میں احکام اوراعمال کی صورتوں کی بات ہے۔اور اشاری تفسیر میں احوال کیفیات ورتزکیہ نفس کی بات ہے۔اللہ تعالیٰ کی جانب جانے والا راستہ توحید کا ہے جو انسان کے قلب نفس اور روح میں تبدیلی لاتا ہے جس قدر انسان اپنے نفس کو احکام الٰہی کا تابع کرتا ہے اور اس میں عدالت لاتا ہے تو نفس کی سرکشی ختم ہوتی ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کے قریب جاتا ہے اسی طرح اگر اپنے قلب میں تبدیلی لاتا ہے اور روح میں شہود سے مقام شہادت حاصل کرتا ہے انسان کی حس میں گناہ عقل پر پردہ ڈالتی ہے اور فکر کی پراگندگی عالم قدس سے دور کرتی ہے جو عداوتوں اور بغض کا سبب ساری وضاحت میں شیخ اکبر مقام توحید سے قرب کے مفادات اور دوری کے کے مفاسد بتاتے ہیں۔

ان کے خیال میں مقام توحید کا فہم ہی انسان کی تعمیر اور تربیت کا سبب ہے۔جب انسان کی فکر پر توحید ذات غالب آتی ہے تو عالم نور سے رابطہ مضبوط ہوتا ہے۔اگر احساسات پر مادیت غالب آتی ہے تو مقام توحید سے دوری ہوتی ہے ۔جو بالتدریج انسان کے احساس کو مخطل کر دیتی ہے۔تفسیر بالماثور میں احکامات کی اور اشاری میں نتائج، مقاصد اور کیفیات کی بحث ہے۔کہ انسان اپنی نیکی کے بعد اپنی ذات میں اس کے اثرات کو بھی محسوس کرے۔

عقیدہ توحید اور وحدۃ الوجود کا نظریہ:

ابن عربی کے نام کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے متعلق وحدۃ الوجود کا نظریہ، ہمیشہ منسلک رہا ہے۔ ابن عربی کی طرف سے عقیدہ وحدۃ الوجود کے متعلق وضاحت، تفسیر ابن عربی سے زیادہ، ان کی مشہور کتاب 'فصوص الحکم' میں، فص آدمیہ کے عنوان کے تحت درج کی گئی ہے۔ چونکہ اپنے اس تصور کی وضاحت انہوں نے، قرآنی آیات سے استدلال کے ذریعے کی ہے اس لیے، یہاں اس کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

ابن عربی کے مطابق، اللہ تعالیٰ اس کائنات کی تخلیق سے قبل یکتا و تنہا تھا اور تمام صفات کا جامع تھا اس نے خود دیکھنا چاہا تو کل عالم کو تخلیق کیا اور اس کو مثال سے واضح کیا:

"کالمرآۃ فانہ یظہر لہ نفسہ فی صورتہ یعطیہا المحل المنظور فیہ مما لم یکن یظہر لہ من غیر موجود بذا المحل لا تجلیہ لہ"[1]

(پس اپنے آپ میں دیکھنا ایسا نہیں جیسے کہ اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھنا یہ ملاحظہ ہر گز نہ ہو تا جب تک وہ آئینہ پر اپنی تجلی نہ ڈالتا)

ابن عربی اس تصور کو مثال سے واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح آئینہ بذات خود کچھ نہیں جب تک کوئی اس اس میں نظر آنے والا وجود موجود نہ ہو۔ وجود نہیں ہو گا تو اس میں کچھ نظر نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آئینہ کی مثل اس سارے جہان کو پیدا کیا اور اس کے ذریعے اپنی صفات کو دیکھنا چاہا، وہ لکھتے ہیں:

"اوجد العالم کلہ وجود شبح مسویً لاروح فیہ فکان کمرآۃ غیر مجلوۃ"[2]

اللہ تعالیٰ نے سارا جہان پیدا کر دیا تھا جو ہر طرح سے ٹھیک تھا مگر یہ بے روح تھا جیسے آئینہ جو اجلا نہیں ہوتا۔)

ابن عربی، کائنات کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک اس کا جسم اور دوسرا اس کی جان۔ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں جسم تو تکمیل انسانی سے قبل بن چکا تھا مگر اس میں جان نہیں تھی۔ جو انسان کی تخلیق کی صورت میں عطا ہوئی۔

ابن عربی کہتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو جان عطا کرتا ہے تو اس کا ایک خاص طریقہ ہے:

"من شان الحکم الالٰہی انہ ماسوی محلاالاویقبل روحاًالٰہیا عبر عنہ بالنفخ فیہ وما ہو الاحصول الاستعداد من تلک الصورۃ المستواۃ لقبول فیض التجلی"[3]

(یہ حکم الٰہی کی شان ہے کہ جب وہ کسی مقام کو برابر کر لیتا ہے تو وہ روح الٰہیہ کو قبول کر لیتی ہے جس کو نفخ روح سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس صورت کو یہ استعداد حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ فیض الٰہی کی تجلی کو قبول کر لیتی ہے۔)

ابن عربی کہتے ہیں کہ کسی بھی مخلوق کی صورت کی تکمیل ہونے پر اس میں یہ استعداد رکھی جاتی ہے کہ وہ روح الٰہیہ کو قبول کرلے اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی تجلی سے ہوتا ہے اور اس کی تائید میں ابن عربی قرآن مجید کی اس آیہ مقدسہ کو پیش کرتے ہیں:

﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُواْ لَهُ سَٰجِدِينَ﴾[1]

1۔ ابن عربی، محی الدین، **الفصوص الحکم**، (دار الآفاق القاہرہ 2016ء) 49

2 ایضاً

3۔ ایضاً

(اور جب میں اسے درست فرمادوں اور پھونک دوں اس میں خاص روح اپنی طرف سے تو گر جانا اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے)

اس اعتبار سے ابن عربی کے مطابق آدم ہی اس کائنات کی جان ہیں

فکان آدم عین جلاء تلک المرآۃ وروح تلک الصورۃ [2] (آدم ہی اس آئینہ کی جلا اور اس صورت کی روح ہیں)

ابن عربی کہتے ہیں کہ آئینہ کل عالم ہے جس کی روح آدم ہیں اور آدم کی جان نفخت فیہ من روحی ہے۔

وہ مزید قرآن مجید کی ذیل کی آیہ مقدسہ سے استدلال کرتے ہیں :

﴿قَالَ يَٰٓإِبۡلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَن تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَيَّۖ﴾[3] (کہا اے ابلیس کس چیز نے باز رکھا تمہیں اس کو سجدہ کرنے سے جس کو میں نے پیدا کیا اپنے دونوں ہاتھوں سے) اس آیت میں "میرے دونوں ہاتھ" کی وضاحت کرتے ہوئے ابن عربی کہتے ہیں:

" ماھو الا عین جمعہ بین الصورتین صورۃ العالم وصورۃ الحق وھما یدا الحق"[4]

(یہ نہیں مگر دو صورتوں کا اجتماع ایک عالم (جہان) کی صورت اور دوسری حق کی اور یہ دونوں اللہ کے ہاتھ ہیں۔)

گویا، ابن عربی اس عالم کے ظاہر کو خالق کا ایک ہاتھ اور باطن کو دوسرا ہاتھ قرار دیتے ہیں اور آدم کو بھی ظاہر اور باطن دیا اسی وجہ سے آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا کیونکہ خلیفہ اور اصل میں مماثلت ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آدم کا ظاہر اور باطن بھی اپنے مطابق بنایا:

ولھذا آدم خلیفۃ فانشاء صور تہ الظاہرہ من حقائق العالم وانشاء صورتہ الباطنۃ علیٰ صورتہ التعالیٰ [5]

(اسی لیے آدم علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنایا اور اس کی ظاہری صورت عالم کے حقائق کے مطابق بنائی اور اس کی باطنی صورت حق تعالیٰ کے مطابق بنائی)

گویا، انسان کی دو جہتیں ہیں ایک ظاہر اور ایک باطن۔ ظاہر اس جہان دنیا سے متعلق ہے اور اس کا باطن، خالق سے متصل اور واصل ہے اور یہ دوسری جہت ہی رب تعالیٰ سے منسلک ہے اور اس سے ربط میں ہے۔

اس تصور کی مزید وضاحت ابن عربی، قرآن مجید کی ذیل کی آیت مقدسہ سے کرتے ہیں:

1۔ الحجر:29

2۔ ابن عربی، **فصوص الحکم** 49

3۔ ص:75

4۔ ابن عربی، **فصوص الحکم** 55

5۔ ایضاً

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفۡس وَٰحِدَة ---﴾[1]

(اے لوگو ڈرو اپنے رب سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا۔۔۔)

ابن عربی کے خیال میں:

"اتقوا ربکم جعلوا ما ظہر منکم وقایۃ لربکم واجعلوا مابطن منکم وھو ربکم"[2]

(اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو کہ تمہارا ظاہر بنایا کہ تم اپنے رب کے لیے سپر (آڑ) بن جاؤ اور تمہارا باطن بنایا جو تمہارا رب ہے کہ تم اپنی سپر بن جاؤ)

ابن عربی کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے تم انسانوں کا ظاہر بنایا تا کہ تم اپنے رب کے احکام بجالاؤ اور اپنے رب کے احکامات کے تابع رہو اور اس سے وفاداری کا اثبات کرو۔ اسی طرح، اس نے تمہارے باطن کو رب سے متصل رکھا تا کہ اس میں اخلاص ہو کہ جب تم اپنے اعمال لے کر اپنے رب کی بارگاہ میں جاؤ تو وہ اعمال تمہاری سپر اور بچاؤ کا باعث بن جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اعمال نہیں نیتیں جاتی ہیں منظر کی بجائے مقصد کی زیادہ قدر و قیمت ہوتی ہے۔

ابن عربی، قرآن مجید کی آیہ مقدسہ:

﴿هُوَ ٱلۡأَوَّلُ وَٱلۡأٓخِرُ وَٱلظَّٰهِرُ وَٱلۡبَاطِنُۖ وَهُوَ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمٌ﴾ [3]

(وہی اول، وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے)، سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فاوجد العالم عالم غیب وشہادۃ لندرک الباطن بغیبتنا والظاہر بشہادتنا [4]

(اس نے عالم غیب بھی بنایا اور ظاہر بھی تا کہ ہم باطن حق کو اپنے باطن سے اور ظاہر حق کو اپنے ظاہر سے دیکھ سکیں)

ابن عربی کہتے ہیں یہی خوبیاں اللہ تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں اس کا بھی باطن اور ظاہر بنایا ہے تا کہ باطن کی صفائی سے اس پے عالم غیب منکشف ہو اور ظاہر کی طہارت سے عالم ظاہر سے شناساں ہو اور اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بن سکے اور اس کی وضاحت کے لیے کہ انسان کا باطن اللہ تعالیٰ کے نور سے متصل ہے نبی رحمت ﷺ کی حدیث پاک پیش کرتے ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

1۔ النساء:1

2۔ ابن عربی، **فصوص الحکم** ص56

3۔ الحدید:3

4۔ ابن عربی، **فصوص الحکم**، 54

"وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ: كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ"[1]

(میرا بندہ مسلسل نوافل کی وجہ سے میرے قریب آتا ہے میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس اسے پکڑتا ہے اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو اس کو میں عطا کرتا ہوں اگر مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو اس کو عطا کرتا ہوں۔)

اب اس پر سوال یہ ہے کہ اس سماعت بصارت کلام وغیرہ سے کیا مراد ہے کیا یہ حلول اور دخول ہے یا کوئی اور چیز ابن عربی کی اس سے کیا مراد ہے ابن عربی اس کی تفصیل میں کہتے ہیں۔

"اعلم ان الامورالکلیۃ ان لم یکن لہا وجود فی عینہا فہی معقولۃ معلومۃ بلاشک فی الذہن فہی باطنۃ لا تزال عن الوجود العینی ولہا الحکم والاثر فی کل مالہ وجود عینی بل ہو عینہا لا غیرہا "[2]

(جان لو کہ یہ سب امور جن کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے یہ معقول اور معلوم ہیں اور بلاشبہ یہ ذہن تک محدود ہیں جو ہمیشہ باطن میں ہی رہیں گے کبھی وجود عینی میں نہیں آئیں گے بلکہ اس عقلی وجود کا اس عینی وجود پر اثر رہے گا۔)

ابن عربی کے نزدیک ہر چیز کا ایک عینی وجود ہے اور ایک عقلی۔ عقلی وجود دائمی ہے جو عینی وجود پر اثر انداز ہوتا ہے۔ عقلی وجود دائمی ہے اور عینی وجود حقیقت میں اس عقلی وجود کی تحریک ہے۔ وہ کہتے ہیں:

الارتباط بین المعقولات والموجودات العینیۃ فکما حکم العلم علی من قام بہ ان یقال فیہ عالم حکم الموصوف بہ علی العلم انہ حادث فی حق الحادث و قدیم فی حق القدیم[3]

(یہ ربط جو معقولات اور موجودات میں ہے اس کا حکم علم کا ہے جس کے ساتھ قائم ہے کہ حادث کے حق میں حادث اور قدیم کے حق میں قدیم ہے۔)

1۔ بخاری، **الجامع الصحیح**، باب التواضع، ح6502، 8/105

2۔ ابن عربی، **فصوص الحکم**، 51

3۔ ایضاً، 52

ابن عربی انسانی وجود کو جہان قرار دیتے ہیں اور آدم علیہ السلام کو اس کی جان قرار دیتے ہیں اور آدم کی جان اللہ تعالیٰ کی تجلی کو قرار دیتے ہیں جو نفخت فیہ من روحی کی صورت میں اسی کی جانب منسوب ہے۔ هي النفس الناطقة الكلية التي هي قلب العالم وهو آدم[1] (یہ نفس ناطقہ کلیہ آدم تھا جو کل عالم کا دل ہے۔)

ابن عربی کے نزدیک کل عالم میں تحریک کا سبب وہی روح ہے جو اس کائنات میں زندگی کا سبب ہے اور جب یہ لوٹ جائے گی۔ تب کائنات اپنی اصلی صورت میں ہوگی جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا یعنی سوائے اللہ تعالیٰ کے کچھ نہ ہوگا مگر ایک چیز جس کو ابن عربی نے واضح کیا ہے وہ یہ ہے کہ قدیم اور حادث کا نتیجہ چیز کی نسبت سے ہے اگر علم کی نسبت قدیم کی جانب کی جائے تو علم بھی قدیم اگر اس کی نسبت حادث کی جانب کی جائے تو علم بھی حادث ہے یونہی کائنات میں جس کی نسبت خدا کی جانب ہے وہ قدیم اور جس کی نسبت حادث کی جانب ہے حادث۔

ابن عربی کہتے ہیں کہ علم اللہ کی صفت بھی ہے اور بندوں کی بھی لیکن یہ نسبت کی وجہ سے قدیم اور حادث ہے یعنی اگر علم کی نسبت اللہ کی جانب ہو تو قدیم اگر ہماری ہو تو حادث ایسے ہی باطن سب اللہ کے نور نفخت فيه من روحی سے ہے اور ظاہر ناسوتی تو اس باطن کی وجہ سے ہی اس پہلو کو بقا ہے اسی باطن اور عقلی پہلو کو خالق سے متصل کہا ہے اسے ابن عربی نے وحدۃ الوجود کا نام دیا ہے۔

ابن عربی یہاں حقیقی معانی کی جانب گئے ہیں کہ انسان کا باطن اللہ تعالیٰ سے متصل اور اس کی تجلی سے معلق ہے مگر جمہور مفسرین نے اس کے علاوہ توجیہات ذکر کی ہیں۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں۔۔

> "وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي النفخ في العرف إجراء الريح من الفم أو غيره في تجويف جسم صالح لإمساكها والامتلاء بها، والمراد هنا تمثيل إفاضة ما به الحياة بالفعل على المادة القابلة لها وليس هناك نفخ حقيقة"[2]
>
> اس میں روح داخل کی نفخ روح سے مراد عرف میں منہ کے راستہ سے ہوا کا داخل ہونا ہے یا اس کے علاوہ جسم صالح میں رکنا اور اس کا بھر جانا ہے اور اس مثال سے مادہ کی اضافت بالفعل زندگی کی جانب ہے جو اس قابل ہو کہ زندگی دے سکے یہاں حقیقت میں نفخ روح مراد نہیں ہے

ابن عربی انسان کے باطن کو اس مادیت سے ماوراجانتے ہیں اور حادث اور قدیم کی نسبت سے اسے قدیم ہی خیال کرتے ہیں جبکہ جمہور اس سے مراد جان کا داخل ہونا اور زندگی کے قابل ہو جانا مراد لیتے ہیں مگر یہاں پر ابن عربی کہتے ہیں کہ انسان کے باطن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب کیا ہے تو ہم بھی اسے اتصال حقیقی جانیں گے اگر ایسا نہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس

1۔ ابن عربي، **تفسیر ابن عربي** 160/1

2۔ الآلوسی، روح المعانی 281/7

کی نسبت اپنی جانب کیوں کی ہے اس کی ضاحت میں امام آلوسی فرماتے ہیں ایسا نہیں بلکہ یہ محض انسان کو شرف عطا کرنے کے لیے کہا گیا جیسے قرآن مجید میں استعارات کا استعمال ہوا ہے۔

فَإِذا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ ساجِدِينَ أضاف سبحانه الروح إلى نفسه تشريفا لها وتعظيما لقدرها لما أنها سر خفي من أسراره جل وعلا، ولذا قيل: من عرف نفسه عرف ربه[1]

جب میں اس کو ٹھیک کرلوں اور اس میں اپنی روح داخل کر دوں تو تم اسے سجدہ کرنا اللہ تعالیٰ نے انسان کو روح کو اپنی جانب منسوب کیا ہے اس سے انسان کی عظمت اور شان مراد ہے کہ اس کا باطن اللہ کا راز ہے اسی لیے کہا جس نے اپنے نفس کو پہچانا اسے نے اپنے رب کو پہچانا

اس تفصیل میں آلوسی اور ابن عربی دونوں کی آراء میں تضاد ہے ابن عربی حقیقی معانی مراد لیتے ہوئے اسے خالق سے جوڑتے ہیں اور آلوسی اس سے استعارہ مراد لیتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کے نور کا جز نہیں ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

مستشرقین اور وحدۃ الوجود:

مسشرقین نے ابن عربی کے تصور وحدۃ الوجود کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں معروف دو کتابوں کا حوالہ دیا ہے، یعنی فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم ہیں ۔ ایک مستشرق Carl W. Ernst اپنی کتاب " Mystical Dimensions of Islam" میں کہتا ہے کہ ابن عربی کی کتاب فتوحات "قلب "سے متعلق ہے اور فصوص "روح "سے متعلق ہے۔[2] اکثر مستشرکین نے، ابن عربی کے تصور توحید کو تصور وحدۃ الوجود یا Pantheism کے ساتھ منسلک کیا ہے۔

انگریزی زبان کا لفظ Pantheism ، یونانی زبان سے ماخوذ ہے، جس کا اولین مفہوم یہ ہے کہ پوری کائنات میں خدا ہے یا کائنات ہی خدا ہے۔ فلسفے کی زبان میں کائنات کا حقیقی وجود صرف خدا ہے باقی سب اسی کی توسیع ہے، خدا سے الگ کائنات کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس تصور کا ایک کنارہ ہندومت کے تصور وحدۃ الوجود کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس لیے، پینتھی ازم کا ایک مفہوم بت پرستی اور شرک کے ساتھ بھی منسلک ہے۔[3]

1۔ الآلوسی ، روح المعانی 281/7

2 Carl W. Ernst, Mystical Dimension of Islam, University of North Carolina:1975, p: 265

3 Reese, William L. "pantheism". *Encyclopedia Britannica*, 31 Oct. 2022, https://www.britannica.com/topic/pantheism. Accessed 25 November 2022.

ابن عربی نے اس تصور کو اپنی کتاب فصوص الحکم میں فص آدمیہ کے تحت لکھا ہے، جو کہ روح سے متعلق ہے۔ بعض مستشرقین نے اس تصور کو اسلام کے عقیدہ توحید میں ایک اجنبی تصور قرار دیا ہے جو دیگر مذاہب سے مستعار لے کر اسلامی تصوف میں ابن عربی نے شامل کیا ہے۔ تاہم معروف مستشرق آربری(A.J, Arberry) نے لکھا ہے:

"He was violently attacked on for his pantheistic teaching (yet his system can be regarded as monist rather than pantheist) and for his extravagant claims no mystic who came after him was free of his influence"[1]

(ابن عربی کے تصور وحدۃ الوجود پر شدید تنقید کی گئی (باوجود ے کہ ان کے تصورات توحیدی ہیں نا کہ مشرکانہ) تاہم، ابن عربی کے بعد آنے والے کوئی بھی سری / صوفی، ایسے غیر حقیقی دعاوی کے اثرات سے آزاد نہیں ہو سکا۔)

کارل ارنسٹ Carl W. Ernst کی رائے واضح طور پر یہ ہے کہ ابن عربی تصور خلاف اسلام ہے:

"He destroyed the Islamic idea of God as a living and active force and was largely responsible for the decay of the true Islamic religion life"[2]

(ابن عربی نے اسلام کے، اس تصور الٰہ کو بری طرح متاثر کر دیا جس کے مطابق خدائے واحد ایک زندہ متحرک طاقت تھا۔ اس طرح، ابن عربی، حقیقی اسلامی مذہبی زندگی کی تباہی کا بہت بڑا ذمہ دار تھا۔)

کارل ارنسٹ کے نزدیک ابن عربی نے اسلامی عقائد میں یہ عقیدہ شامل کیا ، جو صرف ان ہی کا نظریہ ہے۔ یہ تصور اسلام کا نہیں بلکہ دوسرے مذاہب سے مستعار لیا گیا ہے۔ اس نے پارسی مذہب کی جانب منسوب کرتے ہوئے ہیں لکھا ہے کہ یہ فارسی شاعری سے ماخوذ ہے۔ کارل نے اس سلسلہ میں ایک شاعرہ ماریہ رلائکی (Maria Rilke) کے چند اشعار بھی لکھے ہیں:

"He praises me, and I praises him
And he worshiped me and I worshiped him
How can I help him and assist him
In my knowing him and, I create him[1]"

---

1 .A.J ARBERRY, Sufism an Account of the Mystics of Islam (London1950)101

2. Carl ,W, Ernst, Mystical ,Dimension ,of Islam,263

(وہ میری تعریف کرتا ہے اور میں اس کی تعریف کرتی ہوں، میں اس کی عبادت کرتی ہوں اور وہ میری عبادت کرتا ہے، میں اس کی مدد اور نصرت کیسے کر سکتی ہوں، میں اسے جانتی ہوں اور اسے پیدا کرتی ہوں۔)

عقیدہ توحید کے اس پہلو کی وضاحت میں شیخ اکبر مقام توحید سے قرب کے مفادات اور دوری کے کے مفاسد بتاتے ہیں مقام توحید کا فہم ہی انسان کی تعمیر اور تربیت کا سبب ہے۔ جب انسان کی فکر پر توحید ذات غالب آتی ہے تو عالم نور سے رابطہ مضبوط ہوتا ہے۔ اگر احساسات پر مادیت غالب آتی ہے تو مقام توحید سے دوری ہوتی ہے۔ جو بالتدریج انسان کے احساس کو مخطل کر دیتی ہے۔

یہ عقیدہ جس کو ابن عربی نے اس آیت کے تحت اشارۃً بیان کیا کی وضاحت پانچویں صدی کے عظیم صوفی امام ابوالقاسم قشیری نے رسالہ قشیریہ میں کی ہے کہ انسان جب خود سے بری خصائل ختم کر دیتا ہے تو آہستہ آہستہ برائی کی عادت مکمل طور پر انسان کی ذات میں دم توڑ جاتی ہے انسان خصائل حمیدہ کا منبع بن جاتا ہے اور اس حال میں ذات واحد کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے اس ذات کے علاوہ سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے جہان تو ہوتا ہے مگر اس کے لئے بالکل معدوم ہو

اس سے انسان کی فکر میں بالتدریج تبدیلی آتی ہے۔ جو نظریات عقائد اعمال اور اطمنان تک سفر کرتی ہے اگر یہ فکر اللہ تعالیٰ کے احکامات کی روشنی میں پروان چڑھتی ہے تو ہر مرحلہ انسان کی زندگی میں مثبت تبدیلی لاتا ہے یہ تبدیلی ایک ذات میں ہوتی ہے اور یہ ذات معاشرے کا حصہ بنتی ہے جس سے مثبت معاشرہ جنم لیتا ہے۔ جس کا آغاز توحید پر یقین کامل سے ہوتا ہے اور اس کی تکمیل طبیعت سے فساد ختم ہونے پر ہوتی ہے اگر انسان ان قوانین قدرت سے ہٹتا ہے تو یہ تبدیلی بھی اضطراب نفس سے شروع ہوتی ہے جو اپنے ساتھ بہت سی منفی تبدیلیاں لاتی ہے۔ اس کا انجام منفی فکر سے بڑھ کر منفی رویوں کی شکل اختیار کر جاتا ہے اور معاشرتی اضطراب کا سبب بنتا ہے۔ اور معاشرہ میں فسادات جنم لیتے ہیں لہذا توحید پر یقین کامل معاشرتی استحکام کا باعث ہے۔

کائنات جو نعمتوں سے لبریز ہے یہ اپنے خالق کا پتہ دیتی ہے۔ انسان کی اپنی زندگی بھی اس کی ضروریات بھی نعمتوں پر مشتمل ہیں اور ان ساری نعمتوں میں اضافہ کی بھی اللہ تعالیٰ نے خبر دی۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعۡبُدُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُمۡ وَٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ ٱلَّذِي جَعَلَ لَكُمُ ٱلۡأَرۡضَ فِرَٰشا وَٱلسَّمَآءَ بِنَآء وَأَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآء فَأَخۡرَجَ بِهِۦ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزۡقا لَّكُمۡۖ فَلَا تَجۡعَلُواْ لِلَّهِ أَندَادا وَأَنتُمۡ تَعۡلَمُونَ﴾ [2]

---

1 . Carl ,W, Ernst ,Mystical ,Dimension ,of Islam,266

2۔ البقرۃ:21

(اے لوگو عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے کچھ پھل تمہارے کھانے کے لئے پس نہ ٹھہراؤ اللہ تعالیٰ کے مد مقابل اور تم جانتے ہو)

کائنات کی کوئی بھی مخلوق ہو اس کی زندگی کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں غذائیں مختلف، موسم کی وجہ سے لباس مختلف، بیماری اور صحت کی دوائیں مختلف جو ان ساری ضروریات کا خالق ہے وہی لائق عبادت بھی ہے اس لئے کہ وہ نعمتیں عطا کرتا ہے اور اس کی مزید وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں:

"خلقكم وآباؤكم واجدادكم وسائرا لخلق" [1]

(جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے آباؤ اجداد کو اور ساری مخلوق کو)

جب انسان اپنی ذات میں اپنے وجود کی بقاء اور پرورش میں اس ذات واحد کا مرہون منت ہے تو حق عبادت بھی اسی کو ہے۔ جہاں انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرے وہیں اس پر لازم ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت بھی نہ کی جائے اور اگر انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ نعمتوں میں مزید اضافہ بھی فرماتا ہے۔ انسان کی عبادت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بدلہ میں ہے اور ان میں اضافہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہمیں اس کریم ذات کا پتہ دیتی ہیں جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے وہی لائق عبادت ہے پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَلَا تَجْعَلُواْ لِلَّهِ أَندَاداً وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾[2] (پس تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراو)

"ای لا تشركو ا به غيره من الانداد التی لاتضروا ولاتنفعو ا" [3]

(تم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ جن کو تم اس کا شریک بناتے ہو وہ نہ تو تمہیں نفع دے سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عقیدہ توحید کی تشریح میں علامہ ابن کثیر لفظ حنیفاً کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

" الحنيف ہو المائل عن الشرک قصداً ای تارکاً عن بصيرة مقبل علیٰ الحق لكلية لا يصده عنه الصاد لا يروه عنه الراد"[4]

1۔ الطبری، **جامع البیان**، 362/1

2۔ البقرہ:22

3۔ السیوطی، **الدرالمنثور** 87/1

4۔ ابن کثیر، **تفسیر القرآن العظیم**، 373/2

(حنیف سے مراد ایسی ذات ہے جس کی طبیعت میں توحید کی محبت ڈال دی گئی ہو اور شرک سے نفرت اپنی بصیرت کی وجہ سے کرے یعنی وہ موحد خالص ہو نہ اس کو کوئی طاقت سے روک سکے اور نہ ہی کوئی اسے مجبور کر سکے اور نہ ہی کوئی دلائل سے اس کا رد کر سکے جس کی قوت کے سامنے سب زیر ہو جائیں)

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتیں معرفت توحید کی دعوت دیتی ہیں انسان جہاں تصور توحید میں پختگی حاصل کرتا ہے وہیں اس ذات کے احکامات بجالانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ تاکہ اسے اللہ تعالیٰ کا قرب ملے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کی غرض سے اپنی راتوں کی نیندیں بھی قربان کرتا ہے اور اسے لذت کی دولت ملنے لگتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمایا ﴿ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ ٱلْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفا وَطَمَعا﴾[1] (جو اپنے پہلوؤں کو بستروں سے الگ رکھتے ہیں امید اور خوف کی ملی جلی کیفیت سے اور اپنے رب کو یاد کرتے ہیں)

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کو کس قدر پسند کیا کہ اس کی وضاحت خود فرمادی یہ افراد اپنے رب کی جانب توجہ کے طالب ہیں اپنی سب خواہشوں کو اپنے رب کی محبت پے قربان کرتے ہیں۔ اگر انسان ایمان کے بعد اپنے رب کی بندگی کا اہتمام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسے ایسی نعمتیں ملتی ہیں جن کو دنیا کی نعمتوں کی صورت میں سمجھنا بہت مشکل ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔لَهُمْ غُرَف مِّن فَوْقِهَا غُرَف[2](ان کے لئے جنت کے بالا خانے ہیں) علامہ سمرقندی فرماتے ہیں یہ جنت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے انعام ملے گا اس لیے کہ انہوں نے دنیا میں رہ کر مشکلات کو صبر سے برداشت کیا اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو بجالائے تو اجر میں ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بلند مقامات ملیں گے۔

1۔ السجدہ ، 16

2۔ الزمر: 20

فصل دوم:

فصل: علم وحی اور تصور رسالت

علم الوحی سے مراد وہ علم خاص ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے خاص اور منتخب بندوں یعنی پیغمبروں کو عطا ہوتا ہے اسی علم خاص کے ذریعے انبیاء کرام اللہ کے رسول قرار پاتے ہیں۔ قرآن حکیم کے مطابق نبوت ورسالت کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا، اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر مکمل ہوا۔ علم وحی پر مبنی الہامی کتب کے نزول کا سلسلہ بھی جاری رہا اور قرآن مجید پر آکر مکمل ہوا۔ قرآن مجید، لوح محفوظ میں موجود علم الوحی کی وہ صورت ہے جسے قرآن ناطق کا نام دیا جاتا ہے اور قرآن مجسم، اس کی تعبیر کی وہ صورت ہے جو نبی آخر الزماں ﷺ کے قول و عمل کے ذریعے سامنے آچکی ہے۔

وحی کی ماثوری تعبیر:

لفظ وحی، قرآن مجید میں اپنے لغوی اور اصطلاحی دونوں معانی میں استعمال ہوا ہے۔ راغب اصفہانی نے لفظ وحی کا لغوی مفہوم یوں بیان کیا ہے:

"اصل الوحی ۔الاشارة السریعة والتضمن السرعة قیل امر وحی وذالک یکون بالکلام علیٰ السبیل الرمز والتعریض وقد یکون صو ت مجرد عن الترکیب وباالاشارة ببعض لجوارح او باالکتابة" [1]

(حقیقت میں وحی تیزی سے کیا گیا اشارہ ہے اس میں سرعت شامل ہے کہا جاتا ہے امر وحی یہ رمز سے کیا گیا کلام ہے یہ تعریض کبھی محض آواز ہوتی ہے جس میں ترکیب نہیں ہوتی یا بعض اعضاء سے اشارہ ہوتا ہے یا لکھ کر)

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں:

" الوحی فی اللغة الاعلام فی خفاء والوحی ایضاً الکتابة المکتوب والبعث والالہام والامر والایماء والاشارة والتصویت شیئاً بعد شیء وقیل اصلہ التفہیم وکل مادللت بہ من کلام او کتابة اور سالة او اشارة فہو وحی شرعاً"[2]

(وحی لغت میں خفیہ اشارات ہیں۔ اسی طرح وحی لکھی ہوئی کتاب اور بعث اور الہام معاملات، ایماء، اشارات اور ایک کے بعد ایک آواز آنا۔ کہا گیا اس کا اصل تفہیم اور ہر وہ جو کلام اور کتاب یا رسالت پر دلالت کرے یا اشارہ پس وہ شرعی وحی ہے۔)

1۔ الاصفہانی، حسین بن محمد، **المفردات فی غریب القرآن**، (دار القلم الدار الشامیة بیروت، 2000ء) 858

2۔ العسقلانی، **الفتح الباری**، 9/1

ان کے خیال میں اصطلاحاً، وہ کلام ہے جو نبی ﷺ کی طرف اللہ کی طرف سے نازل ہوا:

"الوحی یراد بہ اسم المفعول منہ ای الموحی وہو کلام اللہ المنزل علی البنی ﷺ "[1]

(وحی اسم مفعول کے معنیٰ میں ہے اس سے مراد وہ کلام ہے جو نبی ﷺ پر نازل ہوا)

قرآن مجید میں لفظ وحی کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے، جیسے سورۃ النحل میں شہد کی مکھی کو عطا کیے گئے جبلی علم کے لیے یہ لفظ آیا ہے۔ تاہم لفظ وحی اپنے اصطلاحی معانی میں، انبیاء ورسل کے ساتھ خاص کر کے آیا ہے۔ جس طرح عام انسانوں کو دن کے اجالے کے ساتھ سورج کا یقین ہوتا ہے ایسے ہی ان ذوات قدسیہ کو، اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین کامل ہوتا ہے اور اسی کے تحت، ان کو علم وحی کا یقینی طور پر ادراک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ہے:

﴿قُلۡ إِنَّمَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ أَنَّمَآ إِلَٰهُكُمۡ إِلَٰهٞ وَٰحِدٞۖ فَهَلۡ أَنتُم مُّسۡلِمُونَ﴾[2]

(فرمادیجئے کہ میرے پاس تو صرف یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود (وہی ہے جو) ایک واحد ہے پس کیا تم اسلام لانے کے لئے تیار ہو)

اس کی وضاحت میں علامہ ابن جریر فرماتے ہیں:

" قل یا مُحَمَّد: ما یوحي إلي ربي إلا أنَّه لا إله لکم یجوز أن یُعبد إلا إله واحد، لا تصلح العبادة إلا له[3]"

(اے محمد ﷺ کہہ دیجیے جو وحی کی میرے رب میری طرف کہ اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں اس کے علاوہ کسی کی عبادت جائز نہیں۔)

اللہ تعالیٰ جہاں انبیاء کو یقین کی دولت عطا فرماتا ہے وہیں ان کو نص کے ذریعے باخبر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین کامل اور توحید پر اثبات کے بعد پھر اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے اپنے احکامات کے نفاذ کا عملی حکم دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا: ﴿إِنۡ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّۖ﴾[4] (کہ دیجیے) میں اس کی پیروی کرتا ہوں جو میری جانب میرے رب نے وحی کی ہے)۔

---

1 العسقلانی، **الفتح الباری**، 9/1

2۔ الانبیاء، 108

3۔ الطبری، **جامع البیان** 552/18

4۔ الانعام، 51

اس وحی سے مراد وہ احکام ہیں جو انتہائی بھلائی کے لئے اللہ تعالیٰ انبیاء کی جانب نازل فرماتا ہے، علامہ ابن جریر فرماتے ہیں:

-"ما أتبع فيما أقول لكم وأدعوكم إليه، إلا وحي الله الذي يوحيه إليّ، وتنزيله الذي ينزله عليّ، - فأمضي لوحيه وأئتمر لأمره"[1]

(میں تمہیں اس وحی کی جانب دعوت دیتاہوں جو اللہ تعالیٰ نے میری جانب کی ہے۔ یہاں نازل کرنے سے مراد شرعی احکامات ہیں جو انبیاء کے لئے بھی ضروری ہیں اور امت کے لئے بھی ان پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔)

اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ تعلیمات ہیں جن پر عمل کرنا ہر صورت میں لازمی ہے یہ وہ احکامات ہیں جن کو وحی قسم اصطلاحی میں شامل کیا جاتا ہے۔ جن کا تعلق صرف انبیاء و رسل سے ہے۔ فرمایا: ﴿قُلۡ إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَرٞ مِّثۡلُكُمۡ يُوحَىٰٓ إِلَيَّ﴾[2] (میں تمہاری مثل بشر ہوں میری جانب وحی آتی ہے)۔

اس آیہ مقدسہ میں وحی سے مراد وہ احکامات ہیں جن کے امت اور نبی دونوں پابند ہیں۔ سورہ طٰہٰ میں فرمایا:

﴿وَأَنَا ٱخۡتَرۡتُكَ فَٱسۡتَمِعۡ لِمَا يُوحَىٰٓ﴾[3]

(پس میں نے پسند کیا تجھے (رسالت کے لئے) سو خوب کان لگا کر سن جو وحی کیا جاتا ہے)

اس کی وضاحت میں علامہ سمرقندی فرماتے ہیں:

"-فَاسْتَمِعْ لِما يُوحى يعني: اعمل بما تؤمر وتنهى"[4]

(پس سنو جو تمہاری جانب وحی کی جاتی ہے اور عمل کرو جس کے کرنے اور نہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے)

انبیاء کرام وحی الٰہی کی پیروی کرتے ہیں کبھی بھی لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہیں کرتے۔ ارشاد فرمایا: ﴿قُلۡ إِنَّمَآ أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ مِن رَّبِّيۚ هَٰذَا بَصَآئِرُ مِن رَّبِّكُمۡ وَهُدٗى وَرَحۡمَةٞ لِّقَوۡمٖ يُؤۡمِنُونَ﴾[5]

1۔ الطبری، **جامع البیان**، 371/11

2۔ الکھف:110

3۔ طٰہٰ:13

4۔ السمرقندی، **بحرالعلوم** 391/2

5۔ الاعراف:203

(فرمایئے میں تو اس کی پیروی کرتا ہوں جو وحی کی جاتی ہے میری طرف میرے رب سے یہ روشن دلیلیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے اس قوم کے لیے جو ایمان لاتی ہے)

اس کی وضاحت میں علامہ ابن جریر فرماتے ہیں:

"فبيَّن ذلك أن الله إنما أمر نبيه صلى الله عليه بأن يجيبهم بالخبر عن نفسه أنه إنما يتبع ما ينزل عليه ربه ويوحيه إليه، لا أنه يحدث من قبل نفسه قولا "[1]

(اس میں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا کہ آپ ان کو وحی کی روشنی میں خود خبر دیں آپ کو اس کی پیروی کرنی ہے جو وحی کی روشنی میں آپ ﷺ پر نازل کیا جاتا ہے کیونکہ آپ ﷺ اپنی خواہش نفس سے بات نہیں کرتے)

علامہ سمرقندی لکھتے ہیں۔ "قل امرت بامرفعلت ولا" (کہہ دو مجھے جس چیز کا حکم دیا جاتا ہے کرتا ہوں اگر نہیں ملتا تو نہیں کرتا) کسی بھی نبی نے اپنی خواہش سے نہ بات کی اور نہ ہی لوگوں کی خواہشات کے تحت احکامات بدلے مگر اس کے باوجود تنبیہ کی گئی کہ لوگوں کی منشاء اور مرضی کے مطابق تبدیلیاں کی جائیں جب مشرکین نے چند احکامات بدلنے کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلۡ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنۡ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلۡقَآيِ نَفۡسِيٓۖ إِنۡ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّۖ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّي عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيمٖ﴾[2]

(فرمایئے مجھے اختیار نہیں کہ ردوبدل کر دوں اس میں اپنی مرضی سے میں نہیں پیروی کرتا (کسی چیز کی) بجز اس کے جو وحی کی جاتی ہے میری طرف میں ڈرتا ہوں اگر اپنے رب کی نافرمانی کروں بڑے دن کے عذاب سے)

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:

"قالُوا لَوْلا اجْتَبَيْتَها هلا جمعتها تقولاً من نفسك كسائر ما تقرؤه أو هلا طلبتها من الله. قُلْ إِنَّما أَتَّبِعُ مَا يُوحى إِلَيَّ مِنْ رَبِّي لست بمختلق للآيات أو لست بمقترح لها"[3]

(انہوں نے کہا آپ خود سے جواب کیوں نہیں دیتے جس طرح باقی ساری چیزیں بیان کرتے ہیں عجیب بات ہے تم اللہ تعالیٰ سے طلب کرتے ہو فرمایا میں تو وحی کی پیروی کرتا ہوں خود سے آیات نہیں بناتا ہوں اور نہ ہی گھڑتا ہوں یہ سب بصیرت اہل قلب کے لئے ہے جو حق کو دیکھنے کے قابل ہیں)

1۔ الطبری، **جامع البیان**، 13/342۔343

2۔ یونس: 15

3۔ البیضاوی، ناصر الدین ابو اسعید عبداللہ بن عمر **انوار لتنزیل و اسرار التاویل** (دار الاحیاالتراث العربیہ بیروت 1996ء) 3/47

اس وضاحت سے وحی کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وحی ایسی خاص علم کی قسم ہے کہ اس میں انبیاء کے الفاظ شامل نہیں ہوتے وہ سب اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا ہے اور اگر نبی چاہے تو اس میں کوئی چیز شامل نہیں کر سکتا اور اگر چاہے تو اس سے خارج نہیں کر سکتا، جہاں مشرکین اپنی بات جاننے میں جلدی کرتے وہیں کچھ حذف کرنے کا بھی مطالبہ کرتے کہ فلاں فلاں مقام کو بدل دو۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿وَإِذَا تُتۡلَىٰ عَلَيۡهِمۡ ءَايَاتُنَا بَيِّنَٰتٖ قَالَ ٱلَّذِينَ لَا يَرۡجُونَ لِقَآءَنَا ٱئۡتِ بِقُرۡءَانٍ غَيۡرِ هَٰذَآ أَوۡ بَدِّلۡهُۚ قُلۡ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنۡ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلۡقَآيِ نَفۡسِيٓۖ إِنۡ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّۖ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّي عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيمٖ﴾[1]

(اور جب ان پر ہماری روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں (تو) کہنے لگتے ہیں جو توقع نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی کہ لے آیئے (دوسرا) قرآن اس کے علاوہ یا رو و بدل کر دیجئے اس میں اپنی مرضی سے میں پیروی نہیں کرتا (کسی چیز کی) بجز اس کے جو وحی آتی ہے میری طرف میں ڈرتا ہوں اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں بڑے دن کے عذاب سے)

گویا، وحی ایسا پختہ علم ہوتا ہے اس میں شک وشبہ کی گنجائش بالکل نہیں ہوتی اس میں عام انسان تو کیا انبیاء کو بھی تبدیلی کی اجازت نہیں ہوتی علامہ ابن جریر اس کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

"(قل) لهم، يا مُحَمَّد = (ما يكون لي أن أبدله من تلقاء نفسي)"[2]

(اے محمد ﷺ آپ ان سے فرمادیں ایسا نہیں کہ میں اسے اپنی مرضی سے بدل دوں)

اللہ تعالیٰ نے نبی رحمت ﷺ کی جانب احکامات بھی خود نازل کیے اور ان ذوات قدسیہ کو بھی اس میں تبدیلی کی اجازت نہیں دی۔ تو وحی انسانیت کی ہدایت کے لئے ایسا علم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کی ہدایت کے لئے خدا کا سلسلہ ہدایت ہے جو انسان کو ہر مشکل میں اور ہر مصیبت میں کامیابی و کامرانی کے اصول بتاتا ہے۔

وحی کے نزول کی صورتیں :

قرآن مجید میں، انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے کلام کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ شوریٰ میں فرمایا:

---

1 یونس: 15

2۔ الطبری، **جامع البیان**، 40/15

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ ٱللَّهُ إِلَّا وَحۡيًا أَوۡ مِن وَرَآيِٕ حِجَابٍ أَوۡ يُرۡسِلَ رَسُولا فَيُوحِيَ بِإِذۡنِهِۦ مَا يَشَآءُۚ إِنَّهُۥ عَلِيٌّ حَكِيم﴾[1]

(اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ کلام کرے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ (براہ راوت) مگر وحی کے طور پر یا پس پردہ یا بھیجے کوئی پیغمبر (فرشتہ اور وہ وحی کرے اس کے حکم سے جو اللہ تعالیٰ چاہے بلاشبہ وہ اونچی شان والا واحد بہت دانا ہے)1

1۔ پہلی صورت یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء سے خود کلام کرتا ہے، علامہ ابن جریر فرماتے ہیں۔ يوحي الله اليه كيف يشاء او الهاماً [2] (جس طرح اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وھی یا الہام کرتا ہے)، اللہ تعالیٰ کے انبیاء ہی اسے جانتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی واسطہ کے کلام کرتا ہے۔

2۔ دوسری صورت: پردہ کے پیچھے سے کلام،

(أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ) يقول: أو يكلمه بحيث يسمع كلامه ولا يراه، كما كلم موسى نبيه صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّم[3]

(یا پردہ کے پیچھے وہ اس طرح کلام کرتا ہے کہ اس کا کلام سنائی دیتا ہے اور وہ دکھائی نہیں دیتا جیسے اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔)

3۔ یا اللہ تعالیٰ انبیاء کی جانب کوئی فرشتہ بھیجتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آتا ہے

، (أَوْ يُرْسِلَ رَسُولا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ) قال: جبرائيل يأتي بالوحي.[4]

(یا اللہ تعالیٰ کوئی فرشتہ بھیجتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے وحی کرتا ہے جیسے جبرائیل یا اس کے علاوہ کوئی اور فرشتہ وحی لے کر آتا تھا)

1۔ الشوریٰ: 51

2۔ الطبری، **جامع البیان** 558/21

3۔ ایضاً

4۔ ایضاً

ابن عربی کی تشریحات:

لفظ وحی کے مفہوم کے سلسلہ میں ابن عربی کے تصور کا مطالعہ، ذیل کی آیات کی تشریح کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔

ا)سورہ طہ کی آیت میں ارشاد ہے:

﴿ وَأَنَا ٱخۡتَرۡتُكَ فَٱسۡتَمِعۡ لِمَا يُوحَىٰٓ﴾ [1]

(میں نے پسند کر لیا ہے تجھے (رسالت کے لیے) سو خوب کان لگا کر سن جو وحی کیا جاتا ہے)

ابن عربی، اس آیت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

" ہذا وعد بعد الاصطفاء الذی کان بعد التجلی التام الذاتی الذی جعل جبل وجودہ دکاً با لفناء فیہ باالاندکاک وحرورہ صعقاً عند اقامۃ باالوجود الحقانی"[2]

(یہ انتخاب کا وعدہ کامل ذاتی تجلی کے بعد کا ہے جس نے وجود کے پہاڑ کو فنا کر کے ریزہ ریزہ کر دیا تھا وجود کے اندکاک کے بعد وجود حقانی کے ساتھ ہوش میں آنے کے وقت، کامل تجلی حاصل ہوئی)

گویا، وحی سے مراد تجلی ذات خداوندی کے بعد اصلاح قلب اور تہذیب نفس کی منزل حاصل ہونا ہے، ایسی صورت حال میں پیغمبر اپنے رب سے امر حق وصول کرتا ہے۔ تفسیر بالماثور میں موسیٰ علیہ السلام کی جانب وحی سے مراد علامہ سمرقندی فرماتے ہیں "اعمل بما تومر"[3] (جو آپ کو حکم دیا جارہا ہے اسے بجالائیں) ان احکامات کی پابندی میں جو خاص کیفیت ابن عربی بتارہے ہیں یہ روح کی روشنی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء ورسل کو عطا فرماتا ہے۔

ب)دوسری آیت، جو حضرت موسیٰ کی والدہ محترمہ کی طرف کی جانے والی وحی سے متعلق ہے، میں ارشاد ہوا:

﴿إِذۡ أَوۡحَيۡنَآ إِلَىٰٓ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰٓ أَنِ ٱقۡذِفِيهِ فِي ٱلتَّابُوتِ فَٱقۡذِفِيهِ فِي ٱلۡيَمِّ فَلۡيُلۡقِهِ ٱلۡيَمُّ بِٱلسَّاحِلِ ---﴾ [4]

(اور جب ہم نے وحی کی وہ بات تمہاری ماں کی طرف جو وحی کئے جانے کے قابل تھی کہ رکھ دو اس معصوم بچے کو تابوت میں پھر ڈال دو اس صندوق کو دریا میں پھینک دے گا اسے ساحل پے)

1طہ:13

2۔ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 17/2

3۔السمرقندی، **بحرالعلوم**، 552/18

4۔ طہ: 39،38

اس ضمن میں ابن عربی نے، وحی سے وہ اشارہ مراد لیا ہے جو طبع جسمانی کو بطور امر کیا گیا، وہ لکھتے ہیں:

" اذ اوحینا الیٰ امک ای نفس الحیوانیہ ما یوحیٰ ای اشرنا الیہا ان اقذ فیہ فی التابوت البدن اوالطبیعۃ الجسمانیۃ ---[1]

(جب ہم نے وحی کی موسیٰ کی ماں یعنی نفس حیوانیہ کی جانب اور ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا کہ اسے بدن کے تابوت میں ڈال دو یا طبع جسمانی کو اس کے طبع ہیولانیہ میں ڈال دو۔۔۔)

ابن عربی کے خیال میں یہاں "امک" سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نہیں بلکہ ان کا نفس حیوانی ہے، اور صندوق، بدن یعنی طبیعت جسمانی ہے، جس کو بدن میں ڈال کر مشقت میں رکھنے کا کہا گیا ہے۔ اس پر مسلسل مجاہدہ سے ہدایت اور گمراہی میں فرق کی صلاحیت پیدا ہو گی ۔ یہ وہ مخصوص اشاری تعبیر ہے جو ماثوری تفسیر میں نہیں ملتی، مفسرین نے یہاں وحی سے مراد وہ ہدایت خاص لی ہے جو حضرت موسیٰ کی والدہ کو دی گئی، معصوم بچے کی حفاظت اس خطرے سے ہو سکے جو فرعون کے اعلان کی صورت میں موجود تھا۔

1۔ انبیاء کی جانب وحی:

قرآن حکیم کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انبیاء کو نبوت پے فائز فرماتا ہے تو انسانوں اور جنوں میں بہت ان کے موافق اور مخالف ہو جاتے ہیں۔ اور وہ انبیاء کی دعوت کی طرف لوگوں کو متوجہ ہونے سے دور کرتے رہتے ہیں، قرآن میں آتا ہے:

﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَٰطِينَ ٱلْإِنسِ وَٱلْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ ٱلْقَوْلِ غُرُورًا﴾[2]

(اس طرح بنا دیتے ہیں (یعنی) سرکش انسان اور جن چپکے چپکے سکھاتے تھے ایک دوسرے کو خوش نما باتیں (لوگوں کو) دھوکہ دینے کے لیے)

اس کی وضاحت میں ابن عربی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مراتب ارواح روحوں کی بلندیوں کے مطابق تقسیم کیے ہیں:

''ان مقابلۃ اصفی الاستعدات وانوارہا واکدرہا واظلمہا وابعدہا لزم منہ وجود عدو لکل نبی للتضاد الحقیقی بینہا''[1]

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی**، 20/2

2۔ الانعام: 112

(تا کہ ہم پسندیدہ اور صاف قوتوں اور ان کی روشنیوں کا کدورتوں ظلمتوں اور دوریوں سے مقابلہ کریں دونوں قوتوں کو باہم اکٹھا رکھا حق کو واضح کیا جائے)

ان شیاطین سے مقابلہ کے وقت انبیاء میں ایک خاص ملکہ موجود ہوتا ہے جس سے انکساری عاجزی اور محبت پیدا ہوتی ہے اور دشمن اپنے مشوروں میں ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ انبیاء کو نفس کے شغل سے محفوظ رکھتا ہے علامہ ابن عربی فرماتے ہیں:

"فی مقام القلب وتجلدة معرضاً عن النفس ولذاتہا لاشتغالہ باالعدو ذابلاً عنہا"[2]

(وہ مقام قلب میں دشمن کے ساتھ جلدی کرنے میں ثابت قدم ہوتا ہے۔ اور نفس اس کی لذات سے اعراض کرتا ہے۔)

جب شیاطین اپنی تخریب کاریوں میں مصروف ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو ثابت قدمی عطا فرماتا ہے اور وہ شیطان کی تخریب کاریوں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور نبی ان کی زیادتیوں پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتا ہے اور مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے نبی رحمت ﷺ فرماتے ہیں"مااذوی قط مثل مااوذیت"[3] (کسی اس قدر نہیں ستایا گیا جیسے مجھے ستایا گیا ہے) مگر یہ سب نبی رحمت ﷺ نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ یہ وسوسہ اندازی جو شیطان ڈالتے ہیں ان کی حرکتیں انبیاء کی صداقت کو مزید واضح کرتی ہیں اور بری قوتوں کی خباثتوں کو بھی عیاں کرتی ہیں۔ اس ساری وضاحت میں ابن عربی کہتے ہیں شیاطین کی وسوسہ اندازیاں اور تخریب کاریاں انبیاء کی عظمت کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہیں تا کہ شر اور خیر دونوں کی اچھائیاں اوور برائیاں ظاہر ہو جائیں۔

تفسیر بالماثور میں اس نقطہ کی وضاحت مختلف آتی ہے مثال کے طور پر علامہ سمرقندی فرماتے ہیں:"یزین القول الباطلا ویغربہم بذالک "[4] (وہ باطل قول کو مزین کر کے دکھاتے ہیں اور دھوکہ دیتے ہیں۔)

شیاطین اپنی وسوسہ اندازیوں سے آخر کار خجالت اور شرمندگی کا سامنا کرتے ہیں جب کہ اہل حق کے نصیب میں عزت اور سرخروئی ہوتی ہے۔ اگرچہ انبیاء کو جتنی مخالفت کا سامنا ہو وہ کبھی حق کو چھپاتے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی**، 239/1

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

4۔ السمرقندی، **بحرالعلوم** 476/1

﴿فَلَعَلَّكَ تَارِكُۢ بَعۡضَ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيۡكَ وَضَآئِقُۢ بِهِۦ صَدۡرُكَ أَن يَقُولُواْ لَوۡلَآ أُنزِلَ عَلَيۡهِ كَنزٌ﴾[1] (پس یہ کیا ہو سکتا ہے کہ آپ چھوڑ دیں کچھ حصہ اس کا جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف اور اور تنگ ہو جائے اس کے ساتھ آپ سینہ (اس اندیشہ سے) کافر یہ کہیں گے کہ کیوں نہ اتارا گیا اس پر خزانہ)۔

اس کی وضاحت علامہ شیخ اکبر فرماتے ہیں:

''لما لم يقبلوا كلامه بالارادة وانكرو ا قوله بالاقتراحات الفاسدة وقابلوه باالعنادوالاستهزاء وضاق صدره لم ينبسط للكلام اذا الارادة تجذب الكلام وقبول المستمع يزيد نشاط المتكلم ويوجب بسطه فيه ''[2]

(جب کفار نبی رحمت ﷺ کے کلام کو ارادت سے قبول نہیں کریں گے عناد اور استہزاء سے آپ کا مقابلہ کریں گے تو آپ ﷺ کا سینہ تنگ ہو گا اور کلام کے لیے کھلے گا نہیں کیوں کہ ارادت کلام کو جذب کرتی ہے۔ اور سننے والے کا قبول کرنا متکلم کے لئے نشاط کا باعث بنتا ہے اور اس کے بسط کو لازم کر دیتا ہے)

اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عربی ایک خاص کیفیت کو وحی سے سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کے رویے کی وجہ سے آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے اور سامعین کے سامنے الفاظ ساتھ نہیں دیتے اور کھل کر بات کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔

علامہ ابن جریر نقل کرتے ہیں "مخافة ان يقولوا لولا انزل عليه كنز اوجاء معه ملک" [3]

(اس خوف سے کہ یہ نہ کہ دین کہ ان پر کوئی خزانہ یا فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوا)۔

گویا لوگوں کا یہ مطالبہ وحی کی صداقت کے لئے نہیں اس کے لیے تو اللہ کے نبی تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۔ محبوب لوگوں کی وجہ سے وحی کا کوئی حصہ نہیں چھوڑا جائے گا مگر ابن عربی کہتے ہیں کہ لوگوں عناد اور استہزاء کی وجہ سے دل میں انبساط پیدا نہیں ہوتی جس سے متکلم خود متاثر ہوتا ہے اور کلام کر نہیں پاتا جب حقیقت ایسے نہیں نبی رحمت ﷺ کو وحی کی حقیقت بتائی گئی ہے اس کا انبساط سے تعلق نہیں بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو ہر حالت میں پہنچنا ہے ۔ تو ابن عربی وحی کو کیفیت سے جوڑتے ہیں اور بالماثور میں اسے اللہ کے کلام سے جو حقیقت بھی ہے۔

1۔ ھود:12

2۔ ابن عربی ، **تفسیر ابن عربی** 319/1

3۔ الطبری ، **جامع البیان** 258/15

2۔ انبیاء کی بشری حیثیت کی حکمت:

علامہ ابن عربی فرماتے ہیں کہ انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کا سبب بنایا ہے، وہ خدا کی جانب سے وحی وصول کرتے ہیں اور اس حقیقت کو انسانیت کے ہم نوع اور ہم مجلس ہونے کی وجہ سے اعلیٰ انداز میں انسانیت تک پہنچاتے ہیں۔ انبیاء ایک طرف تو منشاء الٰہی کے عارف ہوتے ہیں اور دوسری جانب انسانیت میں شامل ہوتے ہیں، اس طرح اللہ تعالیٰ کا پیغام انسانیت کو دیتے ہیں اور انہیں توحید کی تعلیم دیتے ہیں۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿قُلۡ إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَرٞ مِّثۡلُكُمۡ يُوحَىٰٓ إِلَيَّ أَنَّمَآ إِلَٰهُكُمۡ إِلَٰهٞ وَٰحِدٞ﴾[1]

(آپ فرمایئے کہ میں بشر ہی ہوں تمہاری طرح، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود صرف واحد معبود ہے)

ابن عربی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''انی من جنسکم واناسبکم فی البشریۃ والماثلۃ النوعیۃ لتوجہ للانس والخلطۃ ،اباینکم بالوحی المنبہ علی التوحید المبین بطریق السلوک فاتصلوا بی بالمناسبۃ النوعیۃ ومجالسۃ البشریۃ لتہتدو ا بنورالتوحید والوحی وسلکوا سبیل الحق الذی عرفنیہ'' [2]

(میں تمہاری جنس سے ہوں اور مماثلت نوعیہ میں تم سے مناسبت ہے تاکہ انس اور اختلاط کے ذریعے تمہیں اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ کر سکوں اور توحید مبین کی تمہیں وحی کے ذریعے تعلیم دوں مناسبت نوعیہ اور مجالست بشریہ کے ساتھ تم میرے قریب آؤ تاکہ دین کو بیان کرنے میں اور نور توحید کو اور وحی سے فائدہ حاصل کرو اور حق کے راستہ پر چلو تاکہ تمیں اس کی معرفت ہو)

علامہ ابن جریر اس مقام پر لکھتے ہیں:

"يوحي الله إلى أن لا معبود لكم تصلح عبادته إلا معبود واحد. (فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ) يقول: فاستقيموا إليه بالطاعة، ووجهوا إليه وجوهكم بالرغبة والعبادة دون الآلهة والأوثان"[3]

1۔ فصلت: 6

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 206/2

3۔ الطبری، **جامع البیان**، 430/21

(میری جانب میرے رب نے وحی کی کہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے جس کی عبادت کرنا اللہ تعالیٰ کے علاوہ ٹھیک ہو پس اس کے لئے طاعت میں سیدھے ہو جاؤ اسی کی جانب توجہ کرو اسی کی جانب رغبت رکھو نہ کہ اس کے علاوہ خداؤں اور بتوں کی جانب)

3۔ علم الوحی سے روح کی ترقی:

ابن عربی کہتے ہیں کہ علم الوحی کا اثر انسان کے قلب و روح پر پڑتا ہے اور قلب اپنی انتہاؤں کو چھونے لگتا ہے اور افق الاعلیٰ کی جانب عروج کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنۡ هُوَ إِلَّا وَحۡيٞ يُوحَىٰ﴾ [1] علامہ ابن عربی لکھتے ہیں:

"من وقت وصول الیٰ ا فق القلب الاسماء الروح الیٰ انتہائہ الیٰ الافق الاعلیٰ الذی نہایۃ روح المبین"[2]

(وحی کے وقت وصول افق قلب آسمان تک پہنچے جو روح افق اعلیٰ کی انتہا تک آتا ہے، جو روح مبین کی انتہا ہے)

یعنی انسان اپنے قلب اور روح سے عروج کرتا ہے اور عالم ناسوت سے ملکوت کی جانب عروج کرتا ہے یہ حقیت میں روح انسانی کی ترقی ہوتی ہے۔ جب روح اس قدر عروج حاصل کر لیتی ہے تو وحی کی کیفیات اللہ تعالیٰ انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے۔

گویا، ابن عربی وحی کی وصولیت کو نبی رحمت ﷺ کی اپنی کیفیت بتا رہے ہیں جبکہ بعد کی آیات اس کی نفی کرتی ہیں۔ مگر وحی کے لئے نہیں کیونکہ بعد کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ﴿عَلَّمَهُۥ شَدِيدُ ٱلۡقُوَىٰ﴾[3] (انہیں سکھایا ہے زبردست قوتوں والے نے) جو جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ اسی لیے علامہ ابن جریر کہتے ہیں:

" يوحي الله تبارك وتعالى إلى جبرائيل، ويوحي جبرائيل إلى مُحَمَّد ﷺ"[4]

(اللہ تعالیٰ نے جبرائیل امین کی جانب وحی کی اور جبرائیل نے آپ ﷺ کی جانب وحی کی)

یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلۡ إِنَّمَآ أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ مِن رَّبِّيۚ﴾[5]

1۔ النجم: 4

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 276/2

3۔ النجم: 5

4۔ الطبری، **جامع البیان** 498/22

5۔ الاعراف: 203

(فرمایئے میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو وحی کی جاتی ہے میری)

علامہ ابن عربی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"لا افتعل بنفسی بل ابلغ عن الله ولا اقول الا ما یوحیٰ الی منہ بہ لانی قائم بہ ولا بنفسی "[1]

(میں خود سے کوئی بات نہیں کرتا مگر جو میری جانب میرا رب وحی کرتا ہے وہ پہنچاتا ہوں کیوں کہ میں اس (وحی) کے ساتھ ہوں نہ کہ اپنے ساتھ)

ابن عربی کی اس وضاحت نے ان کے پہلے تصور کو واضح اور درست کر دیا کہ انبیاء کو وحی اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتی ہے ان کی اپنی کیفیات نہیں ہوتی ہیں اگر ان کی اپنی کیفیات ہوتیں تو اس میں غلطی کی گنجائش ہوتی مگر وحی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے لہٰذا اس میں غلطی کی گنجائش نہیں رہ سکتی۔

قرآنی آیات کی روشنی میں عقیدہ رسالت:

قرآن مجید میں لفظ رسول کا استعمال باون مقامات پر ہوا ہے ان مقامات پر اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب ان کے اللہ تعالی کی جانب سے مبعوث ہونے اور ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَمَّا جَآءَهُمۡ رَسُول مِّنۡ عِندِ ٱللَّهِ ﴾[2] (اور جب بھی ان کے پاس رسول آئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے)۔

ا۔ رسول اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانیت کی ہدایت کے لئے آتے ہیں اور اللہ تعالی نے کی اطاعت سب پر لازم کی ہے فرمائی اس کی وضاحت میں علامہ ابن جریر فرماتے ہیں "وكلّ كتاب أنزله على نبي، ورسالة أرسلها إلى أمة "[3](ہر کتاب کسی نبی پر نازل کی جاتی ہے اور رسول کو امت کی جانب بھیجا جاتا ہے)اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذۡنِ ٱللَّهِۚ ﴾[4](اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے)رسول ہمیشہ مطاع ہوتے ہیں۔

علامہ ابن جریر لکھتے ہیں: "لكي يطاع بأمر الله"[5] (تمہیں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی طرف لائے)اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی یہ صفت بھی بیان کی ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تبلیغ کرتے ہیں نہ کہ اپنے خواہش نفس کی

1۔ابن عربی ، **تفسیر ابن عربی** 272/1

2۔ البقرہ:101

3۔ الطبری ،**جامع البیان** 11/1

4۔ النساء:64

5۔الطبری ،**جامع البیان** 315/1

فرمایا﴿كُلَّمَا جَآءَهُمۡ رَسُولُۢ بِمَا لَا تَهۡوَىٰٓ أَنفُسُهُمُ ﴾[1] (جب بھی ان کے پاس کوئی رسول وہ حکم لے کر آیا جسے ناپسند کیا ان نفسوں) ان سب مقامات پر رسول سے مراد وہ برگزیدہ شخصیات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ منصب رسالت پر فائز فرماتا ہے اور وہ انسانیت کے لئے باعث ہدایت ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے اپنا پیغام انسانیت تک پہنچاتے ہیں۔ انبیاء ورسل اللہ تعالیٰ کی وہ منتخب شخصیات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لئے کتابوں اور شریعت دے کر مبعوث کیا ہوتا ہے۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ: قرآن مجید کی اس آیت مقدسہ -

﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذۡنِ ٱللَّهِۚ﴾

(اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے) کی روشنی میں فرماتے ہیں۔ کہ جتنے بھی اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے ہیں ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ نے فرض کی ہے۔

" ولم نرسل یامُحَمَّد رسولاً الا فرضت طاعتہ علیٰ من ارسلتہ الیہ"[2]

(اے محمد ﷺ ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے ہیں اس کی قوم پر ہم نے ان کی اطاعت فرض کی ہے۔)

یہاں رسول کے منصب کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانیت کی ہدایت کے لیے احکام شرعی لاتا ہے اور اس کی تعلیمات اور احکام فرض کا درجہ رکھتے ہیں۔

ب۔ نبی اپنی ذات میں معصوم اور محفوظ ہوتے ہیں شر الدور میں بھی ان کی ذات خیر کا مخزن ہوتی ہے اور گناہ اور شرک کی کثرت کے ماحول میں بھی ان کی ذوات بچپن سے ساری زندگی ان برائیوں سے محفوظ ہوتے ہیں جن میں عوام الناس مبتلا ہوتے ہیں اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے نبی رحمت ﷺ سے دریافت کیا تو نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

((" أَنا أَنفسكُم نسبا وصهراً وحسباً لَيْسَ فِيَّ وَلَا فِي آبَائِي من لدن آدم سفاح كلهَا نِكَاح))[3]

(میرے نسب قرابتداری اور حسب میں اور آباواجداد میں کبھی سفاح نہیں ہوا بلکہ سب کا نکاح ہوا)

اللہ تعالیٰ انبیاء کو وجاہت، کلام اور معجزات عطا فرماتا ہے وہیں ان کو بے عیب اور لوگوں کی برتر نسل سے پیدا فرماتا ہے تاکہ ان پر کوئی زبان طعن دراز نہ کر سکے۔

1۔ المائدہ 70

2۔ لطبری ، **جامع البیان**، 515/8

3۔ السیوطی ، **الدرالمنثور** 327/4

ج۔ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو ان کے اپنے قبیلوں میں مبعوث فرمایا کیونکہ وہ اپنے قبیلہ کے سب حالات اور معاملات کو جانتے تھے اوراس کی وضاحت قرآن مجید کی اس آیہ مقدسہ میں کی

﴿وَلِكُلِّ أُمَّة رَّسُول فَإِذَا جَآءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِٱلْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ [1]

(اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے پس جب آیا ان کا رسول اور انہوں نے اس کو جھٹلایا تو فیصلہ کر دیا گیا ہے ان کے درمیان انصاف کے ساتھ اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا ہے)

اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ جس نبی کو بھی مبعوث کیا اس کے قبیلہ سے اس کی نبوت کا اعلان اور آغاز ہوا کیونکہ جہاں پر انسان کا بچپن لڑکپن اور جوانی گزری ہو تو ان میں انسان کی ذات ایک خاص مقام رکھتی ہے اب اس نبی کی دعوت کو کوئی قبول یارد کرتا ہے تو قیامت کے دن اسی نبی کی موجودگی میں اس کا حساب بھی ہو گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فیصلہ کے وقت وہ نبی موجود ہوں گے۔ جو اس کے کردار عمل اور ایمان پر گواہی دیں گے جب آخرت کا اتنا بڑا فیصلہ جس کے بعد انسان کی ناکامی اور کامیابی کا حتمی فیصلہ کیا جائے گا اور اسکے بعد اس میں تبدیلی نہیں ہو گی ایسے میں ایسی شخصیات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اس کی وضاحت علامہ سمرقندی فرماتے ہیں:

"الاہل کل دین رسول اتاہم فاذا جاءہم رسو لہم فابلغہم ینقصون من ثواب اعمالہم شیأً قال مجاہد اذاجاء رسولہم یوم القیامۃ قضی بینہم بالعدل وہم لایظلمون "[2]

(اہل دین میں سب کے پاس اللہ کے رسول آئے تو لوگوں نے ان کے دین کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ اور ان کے رسولوں کے درمیان فیصلہ عدل سے کرے گا اور کسی پر ظلم نہیں ہو گا)

دنیا میں رسول نے اللہ تعالیٰ کا پیغام دنیا کو عدل سے دیا تو جنہوں نے انکار کیا وہ ظالم ہیں تو ان کی زیادتی کا فیصلہ بھی قیامت کے دن ہو گا اور رسولوں کی موجودگی میں انصاف کے تقاضوں کے ساتھ ہو گا اگر ان کو قیامت کے دن ناکامی ہو گی تو جن انبیاء کا انہوں نے انکار کیا انہیں کی موجودگی میں ان کو شرمساری کا سامنا بھی ہو گا اور ناکامی کا پروانہ بھی انہیں کی موجودگی میں وصول کریں گے اور انہیں کی گواہی پر کامیابی وکامرانی کی نوید سنائی جائے گی۔

1۔ یونس:47

2۔ السمرقندی، **بحرالعلوم** 119/2

مقام رسالت سے متعلق ابن عربی کی تعبیرات:

قرآن حکیم کے مطابق اللہ کے رسول کی بعثت، اس کی اطاعت کے لزوم کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذۡنِ ٱللَّهِ﴾ [1] (اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے)۔ اس موضوع سے متعلق، قرآنی آیات کی تفسیر ماثور سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول صاحب احکام ہوتا ہے جو انسانیت کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے شریعت کی تعلیم دیتا ہے، اس بنا پر رسول کی اطاعت اہل ایمان کے لیے لازم ہوتی ہے۔

1۔ رسالت، نبوت اور ولایت:

نبی اور رسول کے مقام و منصب میں، ابن عربی کے ہاں فرق حسب ذیل ہے:

" ان الرسالة باعتبار تبليغ الآحكام --- يايهاالرسول بلغ - والنبوة باعتبار الاخبار عن المعارف والحقائق التى تتعلق بتفاصيل الصفات والافعال فان النبوة ظاہرالولاية التى ہى استغراق فى عين الجمع والفناء فى الذات "[2]

(بے شک منصب رسالت کا تعلق، اللہ تعالیٰ کے احکام لوگوں تک پہنچانے کے ساتھ ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے اے میرے رسول پہنچادو۔ اور نبوت ان حقائق و معارف کی خبروں سے تعلق رکھتی ہے جو صفات اور افعال کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ پس نبوت حقیقت میں رسالت کا مقام ولایت ہے یہ عین الجمع میں استغراق اور فنا فی الذات ہے)

ابن عربی کے مطابق رسول، اللہ تعالیٰ کا پیغام انسانیت تک پہنچاتے ہیں۔ ایک رسول، نبی بھی ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا عارف بھی ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے احکامات دیئے ہیں ان کی حقیقت کی معرفت بھی رکھتا ہے۔ حقیقت میں نبوت، رسالت کے لیے مقام ولایت ہوتا ہے۔ نبی، یاد خدا میں اس قدر فنا ہوتا ہے کہ اس کی زبان پر اللہ تعالیٰ کے احکامات جاری ہوتے ہیں اور اعضاء عمل میں مستعد ہوتے ہیں۔

1۔ النساء:64

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 1/170

محل نظر پہلو:

ا۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے اور ہر نبی ولی ہوتا ہے مگر ہر ولی نبی نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر نبی رسول ہوتا ہے آپ فرماتے ہیں:

"وكل نبي ولي ، وليس كل ولي نبيا ولا كل نبي مرسلا "[1]

(ہر نبی ولی ہوتا ہے مگر ہر ولی نبی نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر نبی رسول ہوتا ہے)

گویا کہ نبوت رسالت کے لئے شرط ہے اور ولایت نبوت کے لئے ۔ ہر رسول عارف باللہ یعنی نبی ہوتا ہے مگر رسول صاحب شریعت ہوتا ہے اور نبی صاحب کتاب وشریعت نہیں ہوتا بلکہ صاحب طریقت و معرفت ہوتا ہے اور جہاں تک ایک ولی اللہ کی بات ہوتی ہے وہ بالکل الگ ہے کہ وہ نہ نبی ہوتا ہے نہ رسول۔ تو اس ساری بات سے واضح ہوا کہ رسول صاحب احکام بھی ہوتا ہے اور صاحب عرفان بھی۔

ابن عربی کی وضاحت کے مطابق رسول صاحب شریعت ہوتا ہے اور نبی عارف باللہ ہوتا ہے۔ اس لئے نبی، رسول کی شریعت کی پیروی کرتا ہے مگر وہ عارف باللہ ہو کر، مقام ولایت پر فائز ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مقام الرسالة دون مقام النبوة لكونها مبينة لاحكام كالحلال والحرام منبهة على الاوضاع كالصلوٰة والصيام فهى متعلقة ببيان الاحكام المكلفين"[2]

(مقام رسالت نبوت سے الگ ہے کیونکہ یہ حلال اور حرام کی وضاحت کرتا ہے اور شریعت کی اوضاع یعنی نماز روزہ اور مکلفین کے لئے احکام ضروریہ اور مزید فرماتے ہیں۔

" والرسول ہو الذی یکون لہ مع ذالک کلہ وضع شریعۃ وتقنین"[3] (رسول شریعت اور تمام قوانین وضع کرتا ہے)

یہ تصور ابن عربی کا اپنا وضع کردہ ہے جس کا ثبوت قرآنی آیات یا نصوص میں بالکل نہیں ہے یہ ایک افتراء ہے۔ ابن عربی کا یہ بھی کہنا ہے کہ رسول خود شریعت وضع کرتا ہے یہ بات خلاف حقیقت ہے بلکہ انبیاء ورسل اللہ تعالیٰ کے نمائندے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔

---

1 ۔ ابن عربي ، **تفسير ابن عربي** 170/1

2 ۔ ابن عربي ، **تفسير ابن عربي** 55/2

3 ایضاً

جبکہ جہاں تک مقام رسالت کی بات ہے قرآن مجید میں اس کی کئی مقامات پر وضاحت موجود ہے

﴿قَدۡ أَنزَلَ ٱللَّهُ إِلَيۡكُمۡ ذِكۡرٗا رَّسُولٗا يَتۡلُواْ عَلَيۡكُمۡ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ مُبَيِّنَٰتٖ لِّيُخۡرِجَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ مِنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِۚ---﴾[1]

(بے شک اللہ تعالیٰ نے نازل کیا تمہاری طرف ذکر ایک ایسا رسول جو پڑھ کر سناتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ کی روشن آیات تاکہ نکال لے جائے انہیں جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اندھیروں سے نور کی طرف)

اس کی وضاحت میں علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

" أراد بإنزالِ الذِّكْرِ هاهنا بِعْثَةَ النبيِّ عليه الصلاة والسلام، وسمَّاه ذكراً كما سُمِّيَ عيسى عليه السلام كلمةً"[2]

(یہاں نزول ذکر سے مراد نبی ﷺ کی بعثت ہے اس لیے اس کو ذکر کا نام لیا یا جیسے عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ کا نام دیا گیا)

علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں بعثت کا مطلب ہی نزول ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو کتاب اور شریعت دے کے کائنات میں مبعوث فرماتا ہے اور ان کا کوئی بھی شرعی حکم ذاتی نہیں ہوتا بلکہ وحی الٰہی ہوتا ہے سورہ النجم میں ہے: ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلۡهَوَىٰٓ إِنۡ هُوَ إِلَّا وَحۡيٞ يُوحَىٰ﴾[3] (وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش نفس سے نہیں ہے یہ مگر جو ان کی طرف وحی کی جاتی ہے) نبی رحمت ﷺ آپ خود شریعت نہیں بناتے بلکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام انسانیت کی طرف لاتے ہیں علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

"القرآن وكل ذلك مفهوم من السياق إِلَّا وَحْيٌ من الله عز وجل"[4]

(سارا قرآن اور جو بھی سیاق کا مفہوم ہے یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی ہے)

2۔ رسول جنس انسانی اور قبیلہ سے ہی کیوں ہوتا ہے:

قرآن حکیم میں ہے ﴿لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُولٞ مِّنۡ أَنفُسِكُمۡ﴾[1] (بے شک تمہارے طرف رسول آگئے جو تم ہی سے ہیں) کی روشنی میں واضح کرتے ہیں۔ ابن العربی اس آیت کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

1۔ الطلاق:10۔11

2۔ الاصفہانی۔ **المفردات** 800

3۔ النجم:2۔3

4۔ الآلوسی، **روح المعانی**، 46/14

"ليكون بينكم وبينهم جنسة نفسانية بها تقع الالفة بينكم وبينه فتخالطونه بتلك الجنسية وتخطلتون به فتتاثر نورانيتها المستفادة من نور قلبه انفسكم فتنور بها وتنسلخ عنها ظلمة الجبلة العادة "[2]

(تاکہ تمہارے اور ان کے درمیان جنسیت نفسانیہ ہو تاکہ تمہارے اور ان کے درمیان محبت اور الفت ہو اور اس کی وجہ سے تم ان سے مل جل کر رہو اس کے دل کے نور سے مستفاد نورانیت سے تمہارے نور سے متاثر ہوں گے اور اس فیض سے روشن ہو جائیں گے اور ان سے جبلت اور عادت کی ظلمت نکل جائے گی)

ابن عربی بیان کرتے ہیں کہ ہم جنس ہمیشہ اپنے ہم جنس سے متاثر ہوتا ہے اور ہم جنس سے ہی الفت اور محبت رکھتا ہے اس لئے وہ رسول ان سے الفت اور محبت رکھتے ہیں ان کے دل کی روشنی چاہتے ہیں اور یہ انسان بھی ان سے استفادہ چاہتے ہیں اس سے انسان کی جبلت میں موجود فطری ظلمت چھٹ جاتی ہے اگر یہ رسول جنس انسانی سے نہ ہوتا تو اس قدر اس سے روشنی اور ہدایت کا حصول لوگوں کے لیے ممکن نہ ہوتا۔

ابن عربی یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ رسول اپنی ہی قوم سے کیوں ہوتا ہے۔ آیہ مقدسہ ﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ﴾ [3](ہر امت کے لئے رسول ہے) کے تحت لکھتے ہیں:

"يجالسهم فى الاحوال النفسانية يمكن بينهم الفة الموجبة للاستفادة منه يمكنه النزول الى يبالغ عقولهم ومراتب فهمو منهم فيزكيهم بمايصلح احوالهم ويكشف حجبهم ويعلمهم بما يوجب ترقيهم عن مقاماتهم و يهديهم الى الله "[4]

(احوال نفسانیہ میں رسول اس قوم کی جنس سے ہوتا ہے تاکہ ان کے درمیان اس سے استفادہ کی کی موجب لذت اور محبت ممکن ہو سکے اور ان لوگوں کی عقول اور مراتب تک رسول کا نزول ممکن ہو سکے تو وہ ان میں ہوتا ہے تاکہ ان کو پاک کرے جس سے ان کے احوال کی اصلاح ہو سکے اور ان کے حجابات اٹھ سکیں اور انہیں تعلیم دے تاکہ ان کے مقامات سے ان کی ترقی کا موجب ہو اور اللہ تعالیٰ کی جانب راہ دکھائے۔)

ان کے خیال میں رسول کو اسی کی قوم میں اس لیے بھیجا جاتا ہے تاکہ ان کی باہمی محبت اور الفت کی وجہ سے اس فیض نبوت ورسالت حاصل کرنا ممکن ہو اس قوم کی عقلی وفکری بلندی سے بھی رسول اچھی طرح واقف ہوتا ہے تو ان کو فائدہ پہنچانا آسان ہوتا ہے ان کی روحانی ترقی میں ان کی صحیح منزل کا تعین بھی اس صورت میں ممکن ہوتا ہے تاکہ وہ خود بھی

1۔ التوبہ:128

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 298/2

3۔ یونس:47

4۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 310/1

اپنی سمت کا صحیح کا تعین کر سکیں اور رسول ان کی اللہ تعالیٰ کی جانب مناسب راہنمائی کر دے اس مقصد کے لئے رسول کو مبعوث کیا جاتا ہے۔

تفسیر بالماثور میں نبی کو اس کے قبیلہ سے بھیجنے کی توجیہ بیان کرتے ہوئے مفسرین نے لکھا ہے کہ نبی کی زندگی کا ہر لمحہ ان کے مخاطبین کی نظر میں ہوتا ہے جس پر وہ اعتراض نہیں کر سکتے اور نبی اپنی قوم کی بیماریوں اور کمزوریوں سے بھی واقف ہوتا ہے اس کی وضاحت میں علامہ سمرقندی لکھتے ہیں:

"الاہل کل دین رسول اتاہم فاذا جاءہم رسو لہم فابلغہم ینقصون من ثواب اعمالہم شیأء قال مجاہد اذاجاء رسولہم یوم القیامۃ قضی بینہم بالعدل وہم لایظلمون "[1]

(اہل دین میں سب کے پاس اللہ کے رسول آئے تو لوگوں نے ان کے دین کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ اور ان کے رسولوں کے درمیان فیصلہ عدل سے کرے گا اور کسی پر ظلم نہیں ہو گا)

انبیاء کو اللہ تعالیٰ اتمام حجت کے لئے کامل بنا کر بھیجتا ہے تا کہ ان کے ظاہر اور باطن پر کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ ہو۔ ان ہی میں سے، جس کے کردار، گفتار، قبیلہ، خاندان اور عادات واطوار سے شرافت چھلکتی ہے اور ان کی ذاتی زندگی اس قدر ستھری ہوتی ہے کہ کوئی بھی ان پر اعتراض نہیں کر سکتا اور قیامت کے دن فیصلہ بھی انہیں انبیاء کی موجودگی میں کیا جائے گا اس لئے اتمام حجت کے لیے ان کے کردار پر انہیں افراد کی گواہی ہوتی ہے جن کا فیصلہ اس نبی کی گواہی پر ہو رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا اشاری اور بالماثور دونوں مفاہیم میں یہاں تطبیق ہے تفاوت نہیں۔

3۔ رسول شریعت اور رسول عقل کی اختراع:

بعض قرآنی آیات کی تشریح میں ابن عربی نے رسول کی دو اقسام بیان کر کے، اختراع کی ہے۔ وہ ایک کو رسول شریعت اور دوسرے کو رسول عقل کہتے ہیں۔ ان کے مطابق رسول شریعت یہ اللہ تعالیٰ کے احکام بندوں کی طرف لاتا ہے جس کی وضاحت اس سے قبل کی جا چکی ہے مگر ان احکام کو قبول کرنے کا حکم سب کو نہیں ہے بلکہ صرف مکلف کو ہے اس لئے ایسے مکلف کی ایک خاص حد ہے جب یہ احکامات کے تابع ہوتا ہے اس کے لئے انسان کی عقل ہے، جو اعضاء کو احکامات کے تابع کرتی ہے۔ ابن اعربی نے رسول عقل کا نام دیا ہے اور سورۃ اسراء کی آیت ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ [2](اور ہم عذاب نہیں کرتے جب تک ہم نہ بھیجیں کسی رسول کو) کی تعبیر میں انہوں نے لکھا ہے:

1۔ السمرقندی، **بحرالعلوم** 119/2

2۔ الاسراء:15

"رسول العقل باللزام الحجۃ وتمیزالحق والباطل الا تریٰ ان الصبی والسفیہ غیر المکلفین "[1]

(حق اور باطل میں امتیازاور لزوم حجت کے لئے جب تک ہم رسول یعنی عقل کی نہ بھیجیں ہم کسی کو عذاب نہیں کرتے آپ دیکھتے نہیں کہ بچے اور بے وقوف مکلف نہیں ہوتے)

یعنی رسول صرف وہی نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ کے احکامات پہنچاتا ہے بلکہ ہمارے وجود کی ان احکامات کے تابع بنانے والی قوت بھی رسول ہے وہ ہماری عقل ہے اس لئے کہ رسول کے احکامات بچوں کے لئے نہیں ہوتے اورا نہ ہی ان کو بجالانے جزااور سزاہوتی ہے اور جو شخص سفیہ اور بے وقوف ہے کبھی بھی مکلف نہیں ہوتا کیونکہ اس میں قبول اور عدم قبول کی صلاحیت نہیں ہوتی اس تصور رسالت کی کوئی قرآنی دلیل ابن عربی نے نہیں دی اور حقیقت میں اس کی کوئی تائید قرآن حدیث میں موجود نہیں ہے یہ محض ابن عربی کا اپنا فلسفہ اور فکر ہے۔

5۔ معرفت خدا کو معرفت رسول پر تقدیم ہے:

ابن عربی کی تشریحات کے مطابق، معرفت رسول تب ممکن ہے جب مخاطبین رسول، اللہ کی معرفت سے قبل ازیں فیضیاب ہو چکے ہوں۔ قرآن مجید کی آیہ مقدسہ: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا﴾[2] (اور ہم عذاب نہیں کرتے جب تک ہم نہ بھیجیں کسی رسول کو) ابن عربی کہتے ہیں جو معرفت رسالت کا انکار کرتے ہیں حقیقت میں ان کو معرفت خدا حاصل ہی نہیں ہوتی اس لئے کہ جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات پر بھی ایمان رکھتا ہے۔

"انماہم کاذبون فی شہادۃ الرسالۃ لان حقیقۃ معنی الرسالۃ لا یعلمہا الا اللہ والراسخون فی العلم الذین یعرفون بمعرفۃ رسول اللہ "[3]

(وہ اپنی اس رسالت کی گواہی میں ہی جھوٹے ہیں کیونکہ رسالت کے حقیقی معنیٰ تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے یاوہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی معرفت سے ہی رسول کی معرفت حاصل ہوتی ہے)

اس توضیح میں معرفت رسول کو ابن عربی اللہ تعالیٰ کی عطا قرار دیتے ہیں یہ ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ علم میں پختگی عطا فرماتا ہے وہی لوگ اس سے مستفید اور مستفیض ہوتے ہیں اور شیخ اکبر مزید فرماتے ہیں:

"فان معرفۃ الرسو ل لا تمکن الا بعد معرفۃ اللہ "[4]

1۔ ابن عربي، **تفسير ابن عربي** 400/1

2۔ الاسرا:15

3۔ ابن عربي، **تفسير ابن عربي** 323/2

4۔ ایضاً

(معرفت رسول بغیر اللہ تعالیٰ کی معرفت کے ممکن ہی نہیں)

اس عبارت میں ابن عربی یہ واضح کرتے ہیں کہ کسی بھی انسان کو نبی یا کسی بھی رسول کی معرفت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اسے معرفت خدا حاصل نہیں ہو جاتی کیونکہ جن کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو اب اللہ تعالیٰ کے احکامات کی بھی انسان کی نظر میں ایک خاص حیثیت ہوتی ہے تو انسان اللہ تعالیٰ کے ان نمائندگان کی خلاف ورزی اس لیے نہیں کرتا کہ ان کی اطاعت اللہ کا حکم ہے جب اللہ انہیں اپنی ذات کی معرفت عطا نہیں فرماتا ہے تو یہ معرفت رسول سے بھی محروم رہتے ہیں۔

6۔ انبیاء کا غصہ قہر الٰہی ہے:

اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو عظمتیں عطا فرماتا ہے اور پھر ان عظمتوں کا اقرار بھی انسانوں سے کرواتا ہے اللہ تعالیٰ کے وہ احکامات جو انبیاء لے کر آتے ہیں اگر امتیں ان کی مخالفت کرتی ہیں تو ان پر اللہ تعالیٰ کے عذاب آتے ہیں ابن عربی کہتے ہیں حقیقت میں یہ عذاب اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے سورۃ طہ میں فرمایا: ﴿قَالَ فَٱذۡهَبۡ فَإِنَّ لَكَ فِي ٱلۡحَيَوٰةِ أَن تَقُولَ لَا مِسَاسَۖ ﴾ [1](فرمایا جا چلا جا بس تیرے لیے تو اس زندگی میں (سزا) ہے کہ تو کہتا پھرے مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے)۔ ابن عربی کہتے ہیں حقیقت میں جب اللہ تعالیٰ کے نبی ناراض ہوتے ہیں تو قوموں پر اللہ تعالیٰ کے عذاب اتارتے ہیں:

'' وانمایجب حلول العذاب من غضب الانبیاء والاولیاء لانہم مظاہرالصفات اللہ تعالیٰ فکل من غضبو ا علیہ وقع فی قہرہ تعالیٰ وشقیٰ فی الدنیا والآخرۃ وعذب عذاب الابد"[2]

(ان پر جو اللہ تعالیٰ کا عذاب واقع ہوا اس کا سبب ان پر انبیاء اور اولیاء اللہ کی ناراضگی تھی کیونکہ یہ ذوات اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظاہر ہوتے ہیں تو ان کے دشمن اللہ تعالیٰ کے قہر کا شکار ہوتے ہیں اور دنیا اور آخرت میں بدبخت اور اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہوتے ہیں)

ابن عربی کے نزدیک نافرمان قوموں پر اللہ تعالیٰ کا غضب انبیاء کی ناراضگی کی صورت میں آتا ہے کیونکہ انبیاء و رسل اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہوتے ہیں تو کو خوشی سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے خوشی اور ان کی ناراضگی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے یہ بات ان اہل شقاوت کو معلوم نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو ناراض کر کے اللہ تعالیٰ کے

1۔ طہ: 97

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 28/2

غضب کو دعوت دیتے ہیں۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ سامری کی دشمنی اللہ تعالٰی کے نبی سے تھی جس کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوا۔

باب سوم:

تقدیر، ملائکہ اور علامات قیامت سے متعلق ابن عربی کی تعبیرات کا تجزیہ

فصل اول: ملائکہ اور تقدیر سے متعلق اشاری تعبیرات

فصل دوم: علامات قیامت سے متعلق ابن عربی کی تشریحات

فصل اول: ملائکہ اور تقدیر سے متعلق اشاری تعبیرات

اسلامی ایمانیات کی تفصیل پر مشتمل کئی نصوص موجود ہیں، ایک آیت ذیل میں بطور مثال پیش کی جاتی ہے:

﴿لَّيۡسَ ٱلۡبِرَّ أَن تُوَلُّواْ وُجُوهَكُمۡ قِبَلَ ٱلۡمَشۡرِقِ وَٱلۡمَغۡرِبِ وَلَٰكِنَّ ٱلۡبِرَّ مَنۡ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِ وَٱلۡمَلَٰٓئِكَةِ وَٱلۡكِتَٰبِ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ﴾[1]

(نیکی (بس یہی) نہیں کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنے رخ مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی (کا کمال) تو یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر اور فرشتوں پر، اور کتابوں اور انبیاء پر)

مشہور حدیث جبریل میں، جبرائیل کے سوال وما الایمان (ایمان کیا ہے)؟ کے جواب میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((الإِيمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَبِلِقَائِهِ، وَرُسُلِهِ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ»))[2]

(ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر اس کے فرشتوں پر کتابوں پر اس کی ملاقات پر رسولوں پر اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے پر ایمان لائے)

قرآنی آیات سے ماخوذ تصور ملائکہ:

1۔ ملائکہ کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے علامہ طبری فرماتے ہیں کہ ان کا نام ملائکہ، باالرسالہ کی وجہ سے رکھا گیا اس لئے کہ یہ اللہ کا پیغام اس کے انبیاء کو پہنچاتے ہیں اور انہیں اس کے بندوں میں سے ان کی جانب بھیجا جاتا ہے۔[3] یعنی حقیقت

1۔ البقرہ: 177

2۔ البخاری، **الجامع الصحیح**، 50/19

3۔ الطبری **جامع البیان** 447/1

میں ملائک وہ مخلوق ہیں جو اللہ تعالیٰ کا پیغام اس کے منتخب نمائندگان یعنی انبیاء تک پہنچاتے ہیں۔ امام نسفی ماتریدی فرماتے ہیں کہ یہ لطیف اور نورانی جسم ہیں۔[1] فارسی میں ملائکہ کو فرشتے کہا جاتا ہے۔

2۔ فرشتے نور سے پیدا ہونے والی مخلوق ہے جو مختلف شکلیں بدلتے ہیں مگر کریہہ اور ناپسندیہ شکل میں تبدیل نہیں ہوتے۔ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے نور سے پیدا کیا یہ اللہ تعالیٰ اور انبیاء ورسل کے درمیان رابطہ ہیں فرشتوں کو جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت اور بندگی کے لیے پیدا کیا، وہیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اچھے اور برے اعمال کی شہادت اور سزا اور جزا کا مظہر بھی بنایا انسان کے اعمال کا حساب رکھنے کے لیے دو فرشتوں کی ذمہ داری لگائی جن کو کراماً کاتبین کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَٰفِظِينَ كِرَامًا كَٰتِبِينَ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ[2]

(حالانکہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں (حرف بحرف لکھنے والے ہیں جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو)

کراماً کاتبین ہمارے تمام اعمال پر گواہ ہیں لمحہ بھر کے لیے بھی ہم سے الگ نہیں ہوتے ان کی ذمہ داری کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ طبری کہتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں اور محفوظ کرتے ہیں جو کچھ تم خیر اور شر سے بجالاتے ہو اور تم پر شمار کرتے ہیں۔[3]

3۔ قرآن حکیم کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتے کارکنان قضاء وقدر ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمانبرداروں کو ان کے ذریعے جزا اور نافرمانوں کے ان کے ذریعے سزا دی جاتی ہے۔ نبی رحمت ﷺ جب غزوہ بدر میں صحابہ کرام کے ساتھ موجود تھے اور دشمن اپنی کثیر تعداد اور تیاری کے ساتھ میدان میں اتر چکا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنی مدد کا مظہر بنا کر بھیجا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿بَلَىٰٓ إِن تَصْبِرُوا۟ وَتَتَّقُوا۟ وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ ءَالَٰفٍ مِّنَ ٱلْمَلَٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِينَ وَمَا جَعَلَهُ ٱللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُم بِهِۦ ۚ وَمَا ٱلنَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ ٱللَّهِ ٱلْعَزِيزِ ٱلْحَكِيمِ﴾[4]

1۔ النسفی، ماتریدی، عمر بن محمد، شرح **عقائد نسفیہ** مترجم عبدالناصر لطیف، (نظامیہ کتاب گھر لاہور 2013ء) 149

2۔ الانفطار: 10،11

3۔ الطبری **جامع البیان**، 271/24

4۔ آل عمران: 125، 126

(مدد کرے گا تمہارا رب تمہاری پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں اور نہیں بنایا ان فرشتوں کے اترنے کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مگر خوشخبری تاکہ مطمئن ہو جائیں تمہارے دل اس حال سے (حقیقت تو یہ ہے) کہ نہیں ہے نصرت اور فتح مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سب پر غالب اور حکمت والا ہے)

4۔ پیغمبران خدا کے پیروکار، اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر جب مشکلات کو برداشت کرتے ہیں، اس وقت دشمن کی کثرت اور طاقت کے باوجود اسے اطمنان کی دولت عطا فرماتا ہے اور فکری اور عملی مدد بھی عطا فرماتا ہے، اس کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں:

"وما جعل الله وعده إياكم ما وعدكم من إمداده إياكم بالملائكة الذين ذكر عددهم إلا بشرى لكم"، يعني بشرى، يبشركم بها ولتطمئن قلوبكم به"، يقول. وكي تطمئن بوعده الذي وعدكم من ذلك قلوبكم، فتسكن إليه، ولا تجزع من كثرة عدد عدوكم، وقلة عددكم وما النصر إلا من عند الله"[1]

(تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا فرشتوں کے ذریعے امداد کا اسے پورا کیا فرشتوں کی تعداد ذکر کرکے تاکہ اس کے ذریعے تمہیں بشارت دے اور تمہیں اپنے وعدہ کے ایفاء سے اطمنان کی دولت عطا کرے جس سے تمہارے دلوں کو سکون ملے کہ کبھی بھی اپنے دشمن کی کثرت سے نہ گھبرائیں اور نہ ہی اپنی قلت کا غم کریں)

5۔ فرشتوں کی تخلیق کا مقصد ہی انسانیت کی خدمت ہے مگر یہ مخلوق باعث تسکین صرف مؤمنین کے لیے ہے جہاں یہ فرشتے مومنوں کے لیے باعث اطمنان و سکون ہیں وہیں کافروں کے لیے باعث عذاب ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لِيَقۡطَعَ طَرَفا مِّنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓاْ أَوۡ يَكۡبِتَهُمۡ فَيَنقَلِبُواْ خَآئِبِينَ﴾[2] (تاکہ کاٹ دے ایک حصہ کافروں سے یا ذلیل کر دے ان کو پس لوٹ جائیں نامراد ہو کر)

اس آیہ مقدسی کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں:

"فقطع الله يوم بدر طرفًا من الكفار، وقتل صناديدهم ورؤساءهم، وقادتهم في الشر"[3]

(پس یوم بدر کے دن اللہ تعالیٰ نے ایک طرف کافروں کی کاٹ دی اور ان کے بڑے بڑے شرفاء سرداراس جنگ میں)

1۔ الطبری، **جامع البیان** 190/7

2۔ آل عمران: 127

3۔ لطبری، **جامع البیان** 192/1

جس طرح مومنین کی حفاظت اطمنان اور ان کی فتح میں ان کی مدد یہ فرشتوں کے ذمہ تھی ایسے ہی کافروں کی شکست ان کا قتل اور ان کا اضطراب بھی فرشتوں کی ذمہ داری تھی ۔ اللہ تعالیٰ کے یہ فرشتے باعث عذاب بھی ہیں اور باعث اطمنان بھی اگر انسان کے اعمال اچھے ہیں تو وقت موت یہ بہت نرمی کرتے ہیں اور اگر اعمال اچھے نہیں ہیں تو یہ بہت سختی سے پیش آتے ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ تَوَفَّىٰهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمۡ قَالُواْ فِيمَ كُنتُمۡۖ قَالُواْ كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِينَ فِي ٱلۡأَرۡضِۚ ﴾[1]

(بے شک وہ لوگ کہ قبض کیا ان (کی روحوں) کو فرشتوں نے اس حال میں کہ وہ ظلم توڑ رہے تھے اپنی جانوں پر فرشتوں نے انہیں کہا تم کسی مشکل میں تھے (معذرت کرتے ہوئے) انہوں نے کہا ہم تو بے بس تھے زمین میں)

6۔ فرشتوں کا مسکن زمین نہیں بلکہ افلاک ہیں زمین پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور انسان بعد از وصال زیر زمین جاتے ہیں اور قیامت کے دن زمین سے باہر آئیں گے اور فرشتے قیامت کے دن آسمانوں سے اتریں گے ۔اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اوشاد فرمایا﴿ وَيَوۡمَ تَشَقَّقُ ٱلسَّمَآءُ بِٱلۡغَمَٰمِ وَنُزِّلَ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ تَنزِيلٗا﴾[2](اور یاد کرو جس دن پھٹ جائے گا آسمان اور بادل نمودار ہو گا اور اتارے جائیں گے فرشتے گروہ در گروہ) اور اس کی وضاحت میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے۔

((عنابن عباس يقول: إن هذه السماء إذا انشقت نزل منها من الملائكة أكثر من الجنّ والإنس، وهو يوم التلاق، يوم يلتقي أهل السماء وأهل الأرض))[3]

(حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن یہ آسمان پھٹ جائے گا آسمانوں سے فرشتے اتر پڑیں گے ان کی تعداد انسانوں اور جنوں سے کہیں زیادہ ہو گی یہ ملاقات کا دن ہو گا جس میں زمین و آسمان والے سب مل جائیں گے)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا

﴿وَٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ وَيَسۡتَغۡفِرُونَ لِمَن فِي ٱلۡأَرۡضِۗ أَلَآ إِنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلۡغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ﴾[4]

1۔النساء:97

2۔الفرقان: 25

3۔الطبری، **جامع البیان** 161/10

4۔الشوریٰ:5

(فرشتے تسبیح کر رہے ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ اور بخشش طلب کر رہے ہیں اہل زمین کے لیے سن لو یقیناً اللہ ہی بہت بخشنے والا ہے اور ہمیشہ رحم کرنے والا ہے)

اللہ تعالیٰ کے سب فرشتے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں اور اسکی حمد بھی کرتے ہیں مگر ان کا ستغفار اہل زمین میں انسانوں کے لیے ہوتا ہے اور اسے بھی خاص مومنین کے لیے کیا جاتا ہے حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں:

"عن ابن عباس (وَالْمَلائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ) قال: والملائكة يسبحون له من عظمته.وقوله: (وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الأَرْضِ) يقول: ويسألون ربهم المغفرة لذنوب من في الأرض من أهل الإيمان به"[1]

(حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرشتے اللہ تعالیٰ کی عظمت کے تحت اس کی حمد بیان کرتے ہیں اور زمین میں موجود انسانوں کے لیے استغفار طلب کرتے ہیں)

7۔ فرشتے سراپا خیر ہیں جو اہل ایمان کے لیے مدد گار بھی ہیں اور ان کے لیے باعث اطمنان بھی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے سفارشی بھی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے استغفار کرنے والے بھی اور دوسری جانب جو لوگ اچھے اعمال کے حامل نہیں ہیں تو ان کے لیے باعث عذاب بھی ہیں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے۔

﴿فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَٰرَهُمْ﴾[2]

(پس ان کا کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی روحیں قبض کر رہے ہوں گے اس کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں۔

"والله يعلم إسرار هؤلاء المنافقين، فكيف لا يعلم حالهم إذا توفتهم الملائكة، وهم يضربون وجوههم وأدبارهم"[3]

(اور اللہ تعالیٰ ان سب منافقین کے راز جانتا ہے جب فرشتے مار رہے ہوں گے ان کی پیٹھوں اور چہروں پر تو کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ان کے حالات مخفی ہوں)

اللہ تعالیٰ نے منافقین کے مستقبل کی خبر دے دی کہ جیسے آج یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری چالوں سے کوئی واقف نہیں مگر حقیقت اس کے الٹ ہے ایسے ہی جب یہ قریب المرگ ہوں گے تو فرشتے ان کو سزا دینے کے لیے ان پر مقرر ہوں گے پھر یہ بچ نہیں پائیں گے اور فرشتے ان کے ساتھ یہ سلوک کیوں کریں گے اس کی وضاحت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ ٱتَّبَعُواْ مَآ أَسْخَطَ ٱللَّهَ وَكَرِهُواْ رِضْوَٰنَهُۥ فَأَحْبَطَ أَعْمَٰلَهُمْ﴾[4]

1۔ الطبری جامع البیان 502/21

2۔ الانفال 50

3۔ الطبری، **جامع البیان** 183/22

4۔ محمد: 28

(یہ درگت ان کی اس لیے بنے گی کہ انہوں نے پیروی کی اس کی جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث تھا اور ناپسند کیا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو)

حقیقت میں کامیابی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خوشنودی میں ہے اور سزا اور ناکامی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور نافرمانی میں ہے اور اس کا سلسلہ جان کے نکلنے سے شروع ہو جاتا ہے فرشتے یہ معاملہ ان کے ساتھ کیوں کرتے ہیں علامہ طبری فرماتے ہیں۔

"تفعل الملائكة هذا الذي وصفت بهؤلاء المنافقين من أجل أنهم اتبعوا ما أسخط الله، فأغضبه عليهم من طاعة الشيطان (وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ) يقول: وكرهوا ما يرضيه عنهم من قتال الكفار به، بعد ما افترضه عليهم طبری"[1]

(منافقین کے ساتھ فرشتے اس لیے کرتے ہیں کہ انہوں اس چیز کی پیروی کی جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی کا باعث تھی ان پر غضب کی وجہ ان کا شیطان کی پیروی کرنا تھا اور انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جبکہ ان پر اس کی فرمانبرداری فرض تھی)

8۔ فرشتوں کے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ سکون اور اطمنان کی کیفیات عطا کرتا ہے اور اسی کے ذریعے اللہ تعالیٰ جزا اور سزا کا سلسلہ شروع ہوتا ہے آغاز میں یہ جزا اور سزا کیفیات تک محدود رہتی ہے اور یہ کیفیات مخصوص ایام اور لیالی میں زیادہ واضح ہو جاتی ہیں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے شب قدر کی فضیلت میں بیان کیا فرمایا ﴿تَنَزَّلُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ وَٱلرُّوحُ﴾[2] (اترتے ہیں فرشتے اور روح القدس اس میں) اس کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں۔

" تنزل الملائكة وجبريل معهم، وهو الروح في ليلة القدر "[3]

(فرشتے اترتے ہیں ان کے ساتھ جبرائیل امین ہوتے ہیں)

یہ فرشتے جبرائیل امین کی سربراہی میں رہتے ہیں اور طلوع فجر تک موجود رہتے ہیں جہاں تک فرشتوں کو دیکھنے کی بات ہے وہ عام لوگوں کو دکھائی نہیں دیتے حضرت کعب احبار فرماتے ہیں۔

"أن جبريل عليه السلام لا يدع أحدا من الناس إلّا صافحه.وفي رواية لا يدع مؤمنا ولا مؤمنة إلّا سلم عليه إلّا مدمن الخمر وآكل لحم الخنزير والمتضمخ بالزعفران، وإن علامة مصافحته عليه السلام اقشعرار الجلد ورقة القلب ودمع العينين "[4]

1۔ الطبری، **جامع البیان** 183/22

2۔ القدر: 4

3۔ الطبری، **جامع البیان**، 183/22

4 الآلوسی، **روح المعانی** 419/15

(بے شک جبرائیل علیہ السلام ہر مسلمان سے مصافحہ کرتے ہیں اور ہر مومن کو سلام کرتے ہیں مگر جو شراب پیتا ہے خنزیر کا گوشت کھاتا ہے زعفران استعمال کرتا ہے اور جبرائیل کے مصافحہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جسم کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں دل میں رقت پیدا ہوتی ہے اور آنکھیں نم ہوتی ہیں)

تو یہ نزول ملائکہ کی کیفیت ہوتی ہے اور جہاں تک فرشتوں کے نظر آنے کی بات ہے وہ سوائے انبیاء کے کسی کو نظر نہیں آتے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا۔

﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ﴾[1] (پھر وہ قریب ہوا پھر اور قریب ہوا)

اس کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں:

"ثم دنا جبريل من مُحَمَّد ﷺ فتدلى إليه"[2]

(پھر جبرائیل نبی رحمت ﷺ کے قریب ہوئے پھر اور قریب ہوئے)

نبی رحمت ﷺ نے جبرائیل کو کئی شکلوں میں دیکھا مگر شب معراج آپ ﷺ نے اس کی اصلی شکل میں دیکھا۔ فرشتوں پر ایمان کا عقیدہ اسلام کا بنیادی حصہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہر گز نہیں جیسے مشرکین کہتے تھے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مدد کے مظاہر ہیں ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ سزا اور جزا کا سلسلہ فرمائے گا۔

ملائکہ سے متعلق ابن عربی کی تعبیرات:

قرآنی آیات کی ملائکہ سے متعلق اشاری تعبیرات، تفسیر بالماثور سے بلکل مختلف ہیں۔ ابن عربی نے اپنی تفسیر میں فرشتوں سے انکار نہیں کیا مگر ان کی وضاحت اسقدر مختلف کی ہے کہ جمہور مفسرین کی رائے سے مطابقت نہیں رکھتی

۔

1۔ فرشتے ذوات قدسیہ، ابن عربی، فرشتوں کی حقیقت اور حیثیت سے متعلق لکھتے ہیں:

"الذوات القدسيه الجبروتية التى هى ملائكة المقربون والارواح المجردة الملكوتية المكوتية التى هى النفوس السماوية "[3]

(یہ ذوات قدسیہ جبروتیہ ہیں اور مقرب فرشتے اور ملکوتی ارواح مجردہ ہیں اور یہ آسمانی نفوس ہیں)

1۔ النجم: 8

2۔ الطبری، **جامع البیان** 501/22

3۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی**، 45/1

ابن عربی فرماتے ہیں کہ فرشتے آسمانوں کی روح ہیں انہیں سے آسمانوں کی تحریک ہے جس طرح ہمارے جسموں میں روح ایک حقیقیت ہے ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو پیدا کرکے فرشتوں کو ان کی ارواح بنا دیا ہے۔ ابن عربی، فرشتوں کو آسمانوں کی جان بتاتے ہیں اور پھر اس جان کو اس عالم اجسام کی زندگی سے باہم متصل کرتے ہیں کہ یہ فرشتے آسمانوں کو زندہ کرنے کے بعد عالم اجسام میں بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور زمین پر موجود اشیاء کے لیے زندگی کا باعث ہیں۔

2۔ جبریل، عقل فعال:

ابن عربی نے یہ تعبیر سورۃ البقرہ کی آیت کی وضاحت میں کی ہے، آیت کریمہ ہے :

﴿قُلۡ مَن كَانَ عَدُوّا لِّجِبۡرِيلَ فَإِنَّهُۥ نَزَّلَهُۥ عَلَىٰ قَلۡبِكَ بِإِذۡنِ ٱللَّهِ مُصَدِّقا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَهُدى وَبُشۡرَىٰ لِلۡمُؤۡمِنِينَ ﴾[1]

(آپ فرمایئے جو کوئی دشمن ہو اجبرائیل کا (اسے معلوم ہونا چاہیئے) کہ اس نے اتارا قرآن مجید آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے یہ تصدیق کرنے والا ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے اتریں اور سراپا ہدایت اور خوشخبری ہے ایمان والوں کے لیے)

ابن عربی نے، جبریل امین اور دیگر ملائکہ کے بارے میں، اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:

والظاہر ان جبرائیل ہو العقل الفعال ومیکائیل ہو روح الفلک السادس وعقلہ المفیض للنفس النباتیۃ الکلیۃ الموکلۃ بارزاق العبا د واسرافیل ہو روح الفلک الرابع وعقلہ المفیض للنفس الحیوانیۃ ا لکلیۃ الموکلۃ بالحیوانات وعزرائیل ہو روح الفلک السابع الموکل بالارواح الانسانیۃ کلہا ویقبضہا بنفسہ"[2]

(جبرائیل علیہ السلام عقل فعال ہیں اور میکائیل علیہ السلام چھٹے آسمان کی روح ہیں ان کی عقل نباتات کو فیض پہنچاتی ہے اور انسانوں کی روزی کی مؤکل ہے جبکہ اسرافیل چوتھے آسمان کی روح ہے اور اس کی عقل تمام نفوس حیوانیہ کو فیض پہنچاتی ہے عزرائیل ساتویں آسمان کی روح ہے آپ تمام ارواح انسانیہ کے مؤکل اور ان کی ارواح کو قبض کرتے ہیں)

محل نظر نقطہ:

1۔ البقرہ: 97،98۔

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 67/1

اس وضاحت کا موازنہ تفسیر بالماثور سے کیا جائے تو یہ مفہوم باہم ضدین ہیں اور اس میں جو وضاحت کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جبرائیل، عزرائیل اور اسرافیل سب ایک طرح کی مخلوق ہے ان کا اپنا وجود ہے اور ان کی اللہ تعالیٰ کی جانب سے کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ یہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان واسطہ ہیں ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ مخلوق تک اپنے احکام پہنچاتا ہے علامہ سمرقندی فرماتے ہیں:

"الملک بوجہ اولا ثم بوساطۃ یبلغہ نزول الکتاب ثم یصل ذالک الکتاب الیٰ الرسول "[1]

(ان آیات میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے رسولوں کا ذکر کیا پھر ان کی وساطت سے تبلیغ کے لیے کتاب نازل کی پھر اس کتاب کو رسولوں تک فرشتوں کے ذریعے پہنچایا)

قرآن کی روشنی میں فرشتے ایک ایسی مخلوق ہیں جو اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان واسطہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کا پیغام رسولوں تک وحی کی صورت میں لاتے ہیں جبکہ ابن عربی ایک عجیب توجیہ کے ساتھ ان کو آسمانوں کی روح قرار دیتے ہیں پھر ان کے ساتھ زمین پر نباتات اور انسانوں کی زندگی کو جوڑتے ہیں جس کی کوئی تائید نہ تو قرآن وحدیث سے ملتی ہے اور نہ ہی اقوال صحابہ و تابعین سے ملتی ہے یہ تفسیر بالماثور کے بالکل خلاف ہے۔

3۔ البتہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن میں ابن عربی جمہور علما کی رائے سے متفق ہیں مثلاً ابن عربی کہتے ہیں فرشتوں کا تعلق ملاء اعلیٰ سے ہے یہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اترتے ہیں تاہم ان کے بقول انسان کی یہ نسبت ملاء اعلیٰ سے دو طرح سے ہے:

" اتصال النفس بالملاءالاعلیٰ انما یکون بامرین استعداد اصلی وصفاء فطری یناسب بہ جوہر الروح العالم الاعلیٰ واستعداد الحالی بالتصفیۃ والتزکیہ ولا یکفی مجردحصول فیہابل المعتبر ھ و الملٰئکہ "[2]

(انسان کے نفس کا اتصال ملاء اعلیٰ سے دو وجوہ کی بنیاد پر ہوتا ہے استعداد اصلی اور صفائے فطری اس کے ساتھ جوہر روح عالم اور تصفیہ و تزکیہ کے ساتھ استعداد حالی اس میں اس کا مجرد حصول کافی نہیں بلکہ معتبر یہ ہے کہ فرشتے ہوں)

گویا کسی بھی فرد کے ملاء اعلیٰ سے تعلق کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں اس میں اصلی استعداد یعنی روح عالم کا جوہر موجود ہو وہ اس کی توجہ اپنے وطن کی جانب رکھتا ہے دوسرا اس کے تزکیہ اور تصفیہ کے بعد استعداد حالی یعنی اطمینان نفس بھی اسے حاصل ہو مگر ابن عربی کہتے ہیں یہ صرف کیفیت یا فکر تک ہی محدود نہ ہو اس پر حقیقت میں فرشتوں کا نزول بھی ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت میں ابن عربی نے قرآن مجید کی اس آیہ مقدسہ کی تفسیر میں فرمایا۔﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ قَالُواْ رَبُّنَا ٱللَّهُ

1۔ السمرقندی، **بحرالعلوم** 134/2

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 10/2

ثُمَّ ٱسۡتَقَٰمُواْ تَتَنَزَّلُ عَلَيۡهِمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ﴾ [1] (بے شک وہ (سعادت مند) جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر وہ اس قول کی پختگی سے قائم رہے اترتے ہیں ان پر فرشتے) اترتے ہیں)

4۔ ابن عربی کے خیال میں اس وقت جب انسان میں جوہر کامل ہوتا ہے اور انسان تصفیہ باطن کی دولت سے بھی مالا مال ہوتا ہے تو اس کا اتصال اور محقق ملاء اعلیٰ سے ہو جاتا ہے تو اس کی مدد اور اطمینان کے لیے اللہ تعالیٰ فرشتوں کو نازل فرماتا ہے اور فرشتے اللہ کی مدد کا مظہر بن جاتے ہیں اور ہمیں قرآن مجید میں اس کی بھی بہت سی امثلہ ملتی ہیں کہ انسان کی جیسی روحانی حالت ہوتی ہے ویسے ہی فرشتے ان سے سلوک کرتے ہیں اور انسان جب اس دنیا سے جانے لگتے ہیں تو ان کی روح کو قبض کرنے کی تین حالتیں ہیں:

"توفی الملئکۃ وتوفی الملک الموت الملئکۃ فہو الاصحٰب النفوس وہم سعداء اہل الخیر والصفات الحمیدہ والاخلاق الحسنۃ "[2]

(جن کو فرشتے فوت کرتے ہیں جن کو ملک الموت فوت کرتے ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ فوت کرتا ہے جن کو فرشتے فوت کرتے ہیں یہ اصحاب نفوس ہوتے ہیں یہ سعادت مند اور صفات حمیدہ اور اخلاق حسنہ کے مالک ہوتے ہیں)

کیونکہ ان کی شان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

ٱلَّذِينَ تَتَوَفَّىٰهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَٰمٌ عَلَيۡكُمُ ٱدۡخُلُواْ ٱلۡجَنَّةَ بِمَا كُنتُمۡ تَعۡمَلُونَ[3]

(وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خود خوش ہوتے ہیں (اس وقت) فرشتے کہتے ہیں (اے نیک بختو سلامتی ہو تم پر داخل ہو جاؤ جنت میں (ان نیک اعمال)

کے باعث جو تم کیا کرتے تھے یعنی یہ افراد ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کیا ہے۔

دوسری طرف وہ انسان جو اچھے کردار کے حامل نہیں ہوتے ان کے لیے فرمایا:

ٱلَّذِينَ تَتَوَفَّىٰهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَٰمٌ عَلَيۡكُمُ ٱدۡخُلُواْ ٱلۡجَنَّةَ بِمَا كُنتُمۡ تَعۡمَلُونَ [4]

(وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خود خوش ہوتے ہیں (اس وقت) فرشتے کہتے ہیں (اے نیک بختو سلامتی ہو تم پر داخل ہو جاؤ جنت میں (ان نیک اعمال) کے باعث جو تم کیا کرتے تھے)

1۔ فصلت: 30

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 175/1

3۔ النحل: 32

4۔ النحل: 32

یعنی یہ افراد ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے جنت کس وعدہ کیا ہے اور وہ انسان جو اچھے کردار کے حامل نہیں ہوتے ان کے لیے فرمایا۔

﴿ٱلَّذِينَ تَتَوَفَّىٰهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمۡۖ﴾[1] (جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں در انحالکہ وہ اپنے آپ پر ظلم کررہے ہیں) اس کی وضاحت میں ابن عربی فرماتے ہیں" فمعادہم الی النار"[2] (ان پر وقت موت فرشتوں کی جانب سے سختی کرنے کی وجہ بیان کرتے ہیں):

" فمعادہم الی النار وامابمنعہا عن حقوقہا التی اقتضتہا استعداداتہم من الکمالات المودعۃ "[3]

(ان کو چاہیے تھا اپنے نفس کو روک لیتے ان کمالات اوار استعداد کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے ان میں پیدا کیا ہے)

ان پر سختی کی وجہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ استعداد کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے فرشتے ان کو سزا کے طور پر ان پر زیادتی کرتے ہیں۔ اگر ابن عربی اس کی تشریح کو دیکھیں تو اس میں وہ اس بات کی تائید کرتے نظر اتے ہیں کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر میں ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ بندوں کو سزا اور جزا دیتا ہے یہی کچھ تفسیر بالماثور میں ہے علامہ طبری فرماتے ہیں:

قال الذين توفّاهم الملائكة ظالمي أنفسهم:"كنا مستضعفين في الأرض"، يستضعفنا أهل الشرك بالله في أرضنا وبلادنا بكثرة عددهم وقوتهم، فيمنعونا من الإيمان بالله، واتباع رسوله ﷺ، معذرةٌ ضعيفةٌ وحُجَّة واهية[4]

(وہ لوگ کہتے ہیں جن کی جان فرشتے سختی سے نکال رہے تھے ہم زمین میں کمزور تھے ہمیں اہل شرک نے کمزور کر دیا ہمارے شہروں میں اپنی قوت اور عدد کثرت کی وجہ سے پس ہمیں اتباع رسول اور اللہ تعالیٰ پر ایمان سے روک لیا تو اس پر جواب ہو گا تمہاری واہیات اور معذرت کمزور ہے)

یعنی ان کی اس معذرت پر ان کو سزا فرشتوں کی شدت اور سختی کی صورت میں ہو گی یہی ابن عربی بھی کہتے ہیں کہ ان میں نیکی کی استعداد ہونے کے باوجود نیکی نہ کرنا ان کی سب سے بڑی غلطی ہے۔

5۔ جہاں مؤمنین کے ساتھ مدد کی بات ہے تو غزوہ بدر میں بہت سے فرشتے مسلمانوں کی مدد کو آئے علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں:

1۔ النساء:97

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 75/1

3۔ ایضاً

4۔ الطبری، **جامع البیان** 100/9

"كانت سيما الملئكة يوم بدر عمائم سوداً ويوم احد عمائم حمرا "[1]

(فرشتوں کی شناخت بدر والے دن سیاہ عمامے اور احد والے دن سرخ عمامے تھے)

فرشتوں کی علامت یوم بدر کے دن ان کے سیاہ عمامے تھے اور احد کے دن سرخ اللہ تعالیٰ صرف انسانوں کو ہی ہمت عطا نہیں کرتا بلکہ ان کی مدد فرشتوں سے بھی فرمادیتا ہے اور جسمانی طور پر ان کو ان کی جنگ میں شامل کر دیتا ہے۔ قرآن مجید کی آیہ مقدسہ: ﴿يُنَزِّلُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةَ بِٱلرُّوحِ﴾[2] (اتارتا ہے اس میں فرشتوں کو روح (وحی کے ساتھ) کی وضاحت میں ابن عربی لکھتے ہیں:" العلم الذی یحی به القلوب"[3] (ایسے علم کے ساتھ جو دلوں کی زندگی دیتے ہیں)

6۔ قرآن مجید کی وضاحت ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک ان کے حال کے مطابق لاتے ہیں کہیں پر دلوں کی زندگی مل رہی ہوتی ہے اور کہیں پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے سزا۔ ابن عربی قرآن مجید کی آیہ کی مقدسہ ہے:

﴿مَلَٰٓئِكَةٌ غِلَاظ شِدَاد لَّا يَعْصُونَ ٱللَّهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾[4]

(فرشتے مقرر ہیں جو تیز تند خو اور سخت مزاج ہیں نافرمانی نہیں کرتے اللہ تعالیٰ کی جس کا اس نے انہیں حکم دیا ہے اور فوراً بجالاتے ہیں جو ارشاد انہیں فرمایا جاتا ہے)

اس کی وضاحت میں ابن عربی کہتے ہیں کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے احکامات پہنچانے میں اپنے ماتحتوں سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب نسبت اور احکام کی تابعداری میں مغلوب اور کمزور ہوتے ہیں یعنی نہ تو اللہ تعالیٰ کے احکام کو ٹال سکتے ہیں اور نہ ہی مخلوق ان کے سامنے انکار کر سکتی ہے اس کی وضاحت میں ابن عربی فرماتے ہیں۔

"وان كانوا قهارين مؤثرين بالنسبة الى ما تحتهم من اجرام بذا العالم وقوابا فانهم مقهورون ومتاثرون بالنسبة الى الحضرة الٰهية "[5]

(فرشتے اپنے ماتحتوں کی نسبت سے زیادہ غالب اور موثر اور طاقتور ہوتے ہیں اور جب ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہوتی ہے تو مغلوب اور مقہور ہوتے ہیں)

1۔ السیوطی، **الدرالمنثور** 309/2

2۔ النحل:2

3۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 380/1

4۔ التحریم: 6

5۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 333/2

ابن عربی واضح کرتے ہیں کہ فرشتے اس قدر طاقتور ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی عملداری میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان سے مقابلہ کی جرات بھی کسی کو نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ کسی بھی حکم سے پس وپیش کرنے کی ان میں ہمت نہیں ہوتی۔ اسی طرح کی وضاحت، علامہ طبری فرماتے ہیں:

"لا يخالفون الله في أمره الذي يأمرهم به (وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ) يقول: وينتهون إلى ما يأمرهم به ربهم"[1]

(وہ کسی بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت نہیں کرتے جو ان کو کہا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں اور اس سے رک جاتے جس کا اللہ تعالیٰ ان کو حکم نہیں دیتا)

اگر ان دونوں مفاہیم کو باہم مقابل لائیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جو مراد ابن عربی کی ہے وہی علامہ طبری کی ہے ابن عربی نے زیادہ تفصیل میں لکھ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنی طاقت دے دی ہے کہ مخلوقات ان کے سامنے بے بس ہیں اور وہ اپنے خالق کے احکامات سے انحراف نہیں کرتے اور طبری نے کہا کہ وہ اللہ کا حکم خود بھی بجالاتے ہیں اور دوسروں سے بھی پورا کرواتے ہیں۔

7۔ حقیقت میں فرشتوں پر ایمان اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے مشرکین فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے مگر اللہ نے ارشاد فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی جانب پیغام رسانی اور مخلوق پر گواہی ان کے حساب کتاب اور سزا اور جزا کا ذریعہ بنایا ہے مؤمنین اور مسلمین کے لیے باعث اطمنان اور مشرکین اور کافروں کے لیے باعث عذاب ہیں جس کی امثلہ ہمیں مختلف غزوات میں ملتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے مؤمنین کی مدد کی ان کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے نور سے کی ہے۔

دوسری جانب ابن عربی فرشتوں کو آسمانوں کی روح قرار دیتے ہیں اور اس سے زمین پر موجود حیوانات اور نباتات کی زندگی کا سبب قرار دیتے ہیں، اس مؤقف کے حق میں ان کا استدلال، کسی نص یا روایت سے نہیں، نا ہی انہوں نے اس کی کوئی عقلی دلیل پیش کی ہے، لہٰذا، ابن عربی کی یہ اشاری تعبیر اپنے شرعی مآخذ سے محروم ہے۔

مسئلہ تقدیر سے متعلق آیات کی تفسیر:

تقدیر خیر وشر، اسلامی عقائد میں سے بنیادی عقیدہ ہے اس کی وضاحت قرآن مجید کی بہت سی آیات میں کی گئی ہے۔ تقدیر سے مراد اس کائنات میں کیا ہو گا کیسے ہو گا یہ کائنات کیسے چلے گی، اس کا فیصلہ رب کائنات نے کر رکھا ہے اور اس کی ساری وضاحت اس سے پہلے لکھ دی گئی ہے۔ تقدیر ایک یقینی علم ہے جو علم الٰہی ہے اور اس پر ایمان لانا ہی عام

1۔ الطبری، **جامع البیان** 23/ 492

لوگوں کے لیے ضروری ہے اس کی تفہیم کو کوشش وقت کا ضیاع ہے اس تک انسان کی رسائی نہیں ہے اس لیے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اسے بحر عمیق طریق مظلم اور اسرار الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔

مثال کے طور پر مصیبت کے بارے میں قرآن مجید کی آیت میں کہا گیا ہے:

﴿مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٖ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَلَا فِيٓ أَنفُسِكُمۡ إِلَّا فِي كِتَٰبٖ مِّن قَبۡلِ أَن نَّبۡرَأَهَآۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرٞ﴾[1]

(نہیں آتی کوئی مصیبت زمین پر اور نہ تمہاری جانوں پر مگر وہ لکھی ہوئی ہے کتاب میں اس سے پہلے کہ ہم ان کو پیدا کریں بے شک یہ بات اللہ کے لیے بالکل آسان ہے)

اس آیہ مقدسہ کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں کہ جو کچھ کائنات میں اور انسان کی اپنی ذات میں ہونے والا ہے اس کو پہلے سے تحریر کر دیا گیا ہے ایک روایت نقل کرتے ہیں:

"عن منصور بن عبد الرحمن، قال: كنت جالسا مع الحسن، فقال رجل: سله عن قوله: (مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الأَرْضِ وَلا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا) ، فسألته عنها، فقال: سبحان الله، ومن يشكّ في هذا؟ كل مصيبة بين السماء والأرض ففي كتاب الله من قبل أن تبرأ النسمة"[2]

(منصور بن عبد الرحمٰن روایت کرتے ہیں میں حضرت امام حسن کے پاس بیٹھا تھا تو ایک شخص نے کہا کہ (ماا صاب من مصیبہ۔۔۔) سے متعلق سوال کرو پس میں نے سوال کیا پس انہوں نے فرمایا اس میں کس کو شک ہے ؟ کہ زمین اور آسمان میں آنے والی ہر مصیبت کو تمام مخلوقات کے پیدا ہونے سے قبل ایک کتاب میں لکھ دیا گیا تھا)

حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

((أول ما خَلَقَ الله القَلَمَ، فَكَتَبَ ما يكون في الدنيا مِنْ عَمَلٍ مَعْمُولٍ، براً وفاجَراً وَأحْصَاهُ فِي الذِّكْرِ فَاقْرَؤُوا إِن شِئْتُمْ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ فهَلَ يَكُونُ النّسْخُ إلاّ مِنْ شَيءٍ قَدْ فُرِغ مِنْهُ))[3]

(پہلے قلم کو پیدا کیا گیا اور اسے کہا گیا کہ کائنات میں جو کچھ عمل اور معمول ہے اور ہو گا لکھ اچھائی اور برائی اور اسے شمار کر دیا گیا ذکر (لوح محفوظ میں) میں پس اسے پڑھو اگر تم چاہو کہ ہم اس میں تبدیلی کریں جو تم عمل کرتے ہو تو اس شئ میں کیسے تبدیلی ہو سکتی ہے جس سے فارغ ہوا جا چکا ہے)

حضرت علی المرتضیٰ سے روایت ہے کہ:

1۔ الحدید: 22

2۔ الطبری، **جامع البیان**، 196/23

3۔ السمرقندی **بحر العلوم** 281/3

((عن عليّ، عن النبيّ ﷺ أنه كان في جنازة، فأخذ عودا، فجعل ينكت في الأرض، فقال: "ما منْ أحَدٍ إلا وَقَدْ كُتبَ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ أوْ مِنَ الجَنَّةِ"، فقالوا: يا رسول الله أفلا نتكل؟ قال: "اعْمَلُوا فَكُلّ مُيَسَّرٌ (فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَى وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَى فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَى))[1]

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک جنازے میں تھے، آپ کے ہاتھ میں ایک تنکا تھا جس سے زمین کو کر دیتے تھے اور فرمایا کہ ہر ایک کا مقام جنت یا دوزخ میں لکھ دیا گیا ہے تو انہون نے عرض کی یا رسول اللہ کیا ہم اسی پر ہی توکل نہ کر لیں فرمایا عمل کرو جو آسان ہو پھر جس نے راہ خدا میں اپنا مال دیا اور اور ڈر تا رہا اور اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم اس کے لیے آسان کر دیں گے آسان راہ)

1۔ تقدیر کے حوالہ سے سب سے بڑی غلط فہمی جو ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر تقدیر کے ہی سب پابند ہیں تو اسی پر ہی کیوں نہ توکل کر لیا جائے تو اس کی وضاحت نبی رحمت ﷺ نے فرما دی کہ انسان کو اپنی کوشش کرنا ہے البتہ جو کچھ انسان کے نصیب میں ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے آسان فرما دیتا ہے۔

اگر انسان مشکلات کا شکار ہوتا ہے تو اس پر اپنے جذبات کا اظہار کرنا اور تکلیف کو محسوس کرنا یہ کیسا ہے۔ اس کی وضاحت قرآن مجید کی اس آیہ مقدسہ کی روشنی میں کی جاتی ہے ﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلا بِإِذْنِ اللَّهِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ﴾[2] (نہیں پہنچتی (کسی کو) کو کوئی مصیبت بجز اللہ تعالیٰ کے اذن کے اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے) اس کی وضاحت میں علامہ سمرقندی فرماتے ہیں کہ اسے اپنی تکلیف میں کیا کرنا چاہیے اس کی رویت علقمہ بن قیس سے کرتے ہیں:

" أن رجلاً قرأ عنده هذه الآية، فقال: أتدرون ما تفسيرها؟ وهو أن الرجل المسلم، يصاب بالمصيبة في نفسه وماله، يعلم أنها من عند الله تعالى، فيسلم ويرضى. ويقال: مَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ للاسترجاع يعني: يوفقه الله تعالى لذلك. وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ أي: عالم بثواب من صبر على المصيبة"[3]

(ایک آدمی نے آپ کے پاس اس آیت کی تلاوت کی آپ نے فرمایا اس کی تفسیر جانتے ہو کہ جب ایک مسلمان کو اس کے مال یا جان میں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے پس اس کو تسلیم کرے اور راضی رہے اور فرمایا جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو استرجاع کی توفیق دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو توفیق دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے یعنی اس کے مصیبت پر صبر کو)

1۔ الطبری، **جامع البیان**، 196/23

2۔ التغابن: 11

3۔ السمرقندی، **بحر العلوم**، 457/3

2۔ صبر کا حکم اور اجر بھی شائد اسی لیے دیا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر شکوہ کرنے کی بجائے انسان کو صبر کی تلقین ہے اور استرجاع (انا لله وانا اليه راجعون) پڑھ کر اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ اس کائنات میں اور انسان کی اپنی ذات میں سب اللہ تعالیٰ کا ہے انسان کا اللہ تعالیٰ سے مقدر پر شکوہ عبث ہے انسان کو صبر اور شکر کا ہی دامن تھامنا چاہیے۔

اس پر ایک مزید سوال یہ ہے کہ انسان کو اپنے معاملات میں بھی اختیار ہے یا انسان مجبور محض ہے انسان کو اگرچہ اختیار ہے مگر یہ اختیار بھی تقدیر ہی کا حصہ ہے اللہ تعالیٰ انسان کو اگر کسی فیصلہ یا کام میں اختیار عطا فرما دیتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں انسان تقدیر سے آزاد ہو گیا ہے اس کی وضاحت میں علامہ طبری طبری فرماتے ہیں:

"لا أحد يقدر على شيء إلا بأن يشاء الله يقدره عليه، ويعطيه القدرة عليه"[1]

(کسی کو بھی کسی چیز پر قدرت نہیں ہے مگر جس قدر اللہ تعالیٰ قدرت عطا فرما دیتا ہے)

تو انسان کی قدرت از خود کچھ نہیں یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے جو انسان میں کام کرنے کی صلاحیت ہے وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہی ہے اور جو انسان میں نہ کرنے کی صلاحیت ہے وہ بھی اسی کی عطا سے ہے انسان صرف اللہ کے احکامات کے تابع ہے اس کائنات میں جو بھی تبدیلی آتی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ﴿وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلا يَعْلَمُهَا وَلا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الأَرْضِ وَلا رَطْبٍ وَلا يَابِسٍ إِلا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ﴾[2] (اور نہیں گرتا کوئی پتہ زمین میں مگر وہ جانتا ہے اس کو اور نہیں کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں نہ کوئی تو اور نہ کوئی خشک مگر وہ لکھی ہوئی ہے روشن کتاب میں)

3۔ کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جسے اللہ تعالیٰ جانتا نہ ہو ہر چیز سے واقف ہے اس آیہ مقدسہ کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں:

"ولا تسقط ورقةٌ في الصحاري والبراري، ولا في الأمصار والقرى، إلا الله يعلمها ="ولا حبة في ظلمات الأرض ولا رطب ولا يابس إلا في كتاب مبين"، يقول: ولا شيء أيضًا مما هو موجود، أو ممّا سيوجد ولم يوجد بعد، إلا وهو مثبت في اللوح المحفوظ، مكتوبٌ ذلك فيه، ومرسوم عددُه ومبلغه، والوقت الذي يوجد فيه، والحالُ التي يفنى فيها"[3]

1۔ الطبری، **جامع البیان** 44/24

2۔ الانعام:59

3۔ الطبری، **جامع البیان** 403/11

(نہیں گرتا کوئی بھی پتہ صحراؤں میں نہ ویرانوں میں نہ ہی شہروں میں اور نہ ہی بستیوں میں اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور نہ ہی کوئی داناز مین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی خشک اور نہ کوئی تر مگر وہ روشن کتاب میں موجود ہے اور نہ ہی کوئی چیز جو موجود ہے اور وہ جو عنقریب موجود ہو گی اور جو بعد میں موجود نہیں ہو گی وہ لوح محفوظ میں درج ہے لکھی ہوئی ہے اس کی تعداد مقام وقت جس میں پائی جائے گی اور جس حال میں فنا ہو گی)

جو کچھ کائنات میں ہو چکا ہے ہو گا ہونے والا ہے اس کا وقت جگہ مقام تعداد مقدار حتیٰ کہ جو کچھ ہو گا سب مستقبل میں سب لوح محفوظ میں درج ہے نہ کوئی تنہائیوں میں نہ ہی مجلسوں میں نہ ہی کائنات کا کوئی گوشہ ہے جو اس کی ذات سے مخفی ہو اعمال وقوع پذیر بعد میں ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہیں کہ وہ لوح محفوظ میں درج ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے انسان کی رسائی سے بال تر ہے۔

4۔ یہ تو واضح ہو گیا کہ تقدیر حق ہے اور یہ انسان کی دسترس سے ماوراء ہے تو اس پر ایک سوال ہے کہ کیا تقدیر بدلتی ہے تو اس کو جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اشاد فرمایا﴿يَمۡحُواْ ٱللَّهُ مَا يَشَآءُ وَيُثۡبِتُۖ وَعِندَهُۥٓ أُمُّ ٱلۡكِتَٰبِ﴾[1] (مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اور باقی رکھتا ہے (جو چاہتا ہے) اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے) اس آیہ مقدسہ کی وضاحت میں علامہ طبری ایک روایت نقل فرماتے ہیں:

"، أن كعبًا قال لعمر رحمة الله عليه: يا أمير المؤمنين، لولا آية في كتاب الله لأنبأتك ما هو كائنٌ إلى يوم القيامة قال: وما هي؟ قال: قولُ الله: (يمحو الله ما يشاءُ ويثبت وعندَهُ أم الكتاب) [2]

(حضرت کعب احبار نے سیدنا فاروق اعظم سے کہا اے امیر المومنین اگر قرآن مجید میں ایک آیہ مقدسہ نہ ہوتی تو میں تمہیں قیامت تک ہونے والی تمام خبریں دے دیتا آپ نے پوچھا وہ کونسی آیت ہے تو کعب احبار کہنے لگے (يمحو الله ما يشاءُ ويثبت وعندَهُ أم الكتاب)

یہ بھی واضح ہو گیا کہ تقدیر بدلتی ہے اور عوام الناس کی لوح محفوظ تک رسائی نہیں ہوتی جب کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ تک رسائی دی ہوتی ہے۔ انہیں میں سے حضرت کعب احبار تھے کہ انہوں نے سیدنا عمر فاروق سے کہ اگر تقدیر بدلتی نہ ہوتی تو میں تمہیں سب بتا دیتا اس کے علاوہ سیدنا فاروق اعظم کا فرمان موجود ہے آپ کعبہ میں تھے اور یہ دعا کر رہے تھے۔

1۔ الرعد: 39

2۔ الطبری، **جامع البیان**، 484/16

"سمعت عمر بن الخطاب ﷺ يقول، وهو يطوف بالكعبة: اللهم إن كنت كتبتَني في أهل السعادة فأثبتني فيها، وإن كنت كتبت عليَّ الذّنب والشِّقوة فامحُني وأثبتني في أهل السّعادة، فإنك تمحو ما تشاء وتثبت، وعندك أمّ الكتاب."[1]

(میں نے عمر بن خطاب سے سنا آپ فرمارہے تھے اے اللہ اگر تو نے مجھے اہل سعادت سے لکھا ہے تو اس کو باقی رکھ اگر اہل شقاوت سے لکھا ہے تو اسے بدل دے اور تیرے پاس ہی ام الکتاب ہے)

5۔ اس روایت میں اس بات کی دلیل ہے کہ تقدیر میں تبدیلی ممکن ہے اور اس کی وضاحت میں مزید روایات بھی ہیں جیسا کہ علامہ طبری نقل کرتے ہیں نبی رحمت ﷺ نے دعا کی کہ عمر بن خطاب اور ابو جہل میں سے کسی ایک کو اسلام کی توفیق عطا فرما:

"حَيْثُ قَالَ النَّبِي صلى الله عَلَيْهِ وَسلم: اللَّهُمَّ أعِزَّ دينَكَ بعمر بن الْخطاب أَو بِأبي جهل بن هِشَام فهدى الله عمر رَضِي الله عَنهُ وأضل أَبَا جهل[2]"

(جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا اے اللہ عمر خطاب یا ابو جہل کے ذریعے اسلام کو عزت عطا فرما تو اللہ تعالیٰ نے عمر بن خطاب کو ہدایت عطا فرمائی اور ابو جہل گمراہ رہا۔)

اس سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ دعا تقدیر پر اثر انداز ہوتی ہے مگر اس کے علاوہ کچھ ایسی احادیث ہیں جن سے واضح ہو تو ہے کہ قلم خشک ہو چکا ہے اب جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہی ہو گا اس میں تبدیلی ممکن نہیں ہے علامہ طبری قرآن مجید کی اس آیہ مقدسہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں ﴿أَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَى وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَى فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَى﴾[3] (پھر جس نے راہ خدا میں اپنا مال دیا اور (اس لیے) ڈرتا رہا اور (جس نے) اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم اس کے لیے آسان کر دیں گے آسان راہ)

سیدنا عبد اللہ بن عباس کی ہے آپ فرماتے ہیں کہ چند چیزیں ایسی ہیں جو تبدیل نہیں ہوتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

"ابن عباس، في قوله: (يمحو الله ما يشاء ويثبت وعنده أم الكتاب) ، قال: يدبّر الله أمرَ العباد فيمحو ما يشاءُ، إلا الشقاء والسعادة [والحياة] والموت"[4]

(حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ بندوں کے معاملات کی تدبیر فرماتا ہے پس جو چاہتا مٹا دیتا ہے مگر شقاوت سعادت موت اور حیات میں تبدیلی نہیں ہوتی)

1۔ الطبری، **جامع البیان**، 482/16

2۔ ایضاً 7/7

3۔ الیل: 5،6،7

4۔ الطبری، **جامع البیان** 477/16

6۔ اس ساری وضاحت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تقدیر ہر چیز کو پیدا کرنے سے پہلے لکھ دی گئی تھی اور جو کچھ ہمارے نصیب میں لکھا گیا ہے اسے انجام دینے میں ہمیں آسانی ہوتی ہے اس کے علاوہ میں مشکل ہوتی ہے انسان اگر کسی کام کے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو یہ توفیق بھی اسی تقدیر کا حصہ ہے اللہ تعالیٰ وہ کام کرنے کی ہمت عطا فرما دیتا ہے۔

تقدیر سے متعلق ابن عربی کی تعبیرات:

ابن عربی تقدیر کی چار اقسام بیان کرتے ہیں جو کہ ان کے خیال میں قرآن مجید کی ذیل کی آیہ مقدسہ سے ماخوذ ہیں:

﴿ يَمۡحُواْ ٱللَّهُ مَا يَشَآءُ وَيُثۡبِتُۖ وَعِندَهُۥٓ أُمُّ ٱلۡكِتَٰبِ﴾[1]

(مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اور باقی رکھتا ہے (جو چاہتا ہے)

اس آیت کی وضاحت کے سلسلہ میں ابن عربی نے لکھا:

"لو ح القضاء السابق الذی ہو عقل الکل المنتقش بکل ماکا ن ومایکو ن ازلاً وابداً علی الوجہ الکلی المنزۃ عن المحو والاثبات"[2]

(پچھلے فیصلے کی لوح جو عقل کل ہے جس پر لکھا ہوا ہے وہ سب کچھ جو ہو چکا ہے کہ وہ پاک ہے مٹائے جانے سے اور رقم کرنے سے)

1۔ پہلی قسم لوح قضاء السابق، جس میں وہ سب کچھ درج ہے جو ہو چکا ہے اور جو ہو گا اس میں مطلق تبدیلی نہیں ہے یہ لوح حقیقت میں سب معاملات کا اجمال ہے اور اس میں سب فیصلے موجود ہیں اسے ابن عربی عقل اول کا نام دیتے ہیں فرماتے ہیں:

"لوح القضاء السابق العالی عن المحو والاثبات وہو لوح العقل الاول "[3]

(یہ پچھلی لوح ہے اور عقل اول کی لوح ہے اس میں تبدیلی نہیں ہے)

ابن عربی کہتے ہیں کہ اس قسم تقدیر میں تبدیلی نہیں ہے۔ اس سابق اور آئندہ سب کا خلاصہ درج ہے۔

2۔ دوسری لوح قضا کی قسم کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ اکبر فرماتے ہیں:

"ولوح القدر ای: لوح النفس الناطقہ الکلیۃ التی یفصل فیہا الکلیات اللوح الاول و یتعلق باسبابہا وہو مسمی باللوح المحفوظ "[1]

1۔ الرعد: 39

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 1/ 367

3۔ ایضاً

(لوح قدر یعنی نفس ناطقہ کلیہ کی لوح جس میں لوح اول کی تفصیل ہوتی ہے اور اس کے اسباب سے متعلق ہوتی ہے اس کا نام لوح محفوظ ہے)

ابن عربی کے مطابق جس تقدیر کا لوح قضاء میں اجمال تھا اس کی ساری تفصیل لوح قدر میں ہوتی اس میں یہ درج ہے کہ اشیاء کے نتائج یہ ہیں اور اس میں اس کے سارے اسباب اعمال اور طریقہ کار کی وضاحت موجود ہے۔

3۔ اسکے بعد ایک تیسری قسم کی لوح، اس میں وہ قسم درج ہے جو عیاں نہیں ہوتی بلکہ نہاں اور راز ہوتی ہے ان کی صورتوں کی تفصیل اس میں درج ہوتی ہے اس کی تعلق محض خیال کے ساتھ ہے ابن عربی فرماتے ہیں:

"التی ینتقش فیہا کل ما فی ہذا العالم بشکلہ وہیائتہ ومقدارہ وہو المسمی بالسماءالدنیا وہو بمثابۃ خیال العالم کما ان الاول بمثابۃ روحہ والثانی بمثابۃ قلبہ "[2]

(اس میں ہر چیز کی ہئیت اور شکل اور مقداریں لکھی ہوئی ہیں اس کو آسمان دنیا کہا جاتا ہے اس کا تعلق جہان کے خیال کے ساتھ ہے کیونکہ پہلی کا تعلق روح سے دوسری کا تعلق قلب سے)

اس میں عملی اور ظاہری چیزیں نہیں ہیں بلکہ محوی خیالات درج ہیں کیونکہ اس کا تعلق انسان کی روح کے ساتھ ہے تو وہ دکھائی نہیں دیتی لہذا اس کے مشمولات بھی دکھائی نہیں دیتے اور دوسری لوح کا تعلق قلب سے ہے تو اس میں قلب سے متعلقہ چیزوں کی تفصیل درج ہے۔

4۔ آخری اور چوتھی قسم کو لوح ھیولا کا نام دیتے ہیں اس کا تعلق انسان کی پیدائش سے قبل کا ہے جب انسان ابھی اس دنیا میں نہیں آیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے بطن مادر میں ہی اس کا نصیب لکھنے کے لیے فرشتوں کو بھیج دیا تھا۔ ابن عربی لکھتے ہیں کہ:

"لوح الہیولیٰ القابل للصورۃ فی عالم الشہادۃ "[3](یہ قسم عالم شہادۃ (ماں کے پیٹ) کی صورت ہے)

تقدیر کی یہ چار اقسام ابن عربی بیان کرتے ہیں جبکہ دوسری جانب جب اس تفصیل کو تفسیر بالماثور سے جاننے کو کوشش کی جاتی ہے تو ایسی تفصیل بالکل نہیں ملتی بلکہ سورہ رعد کی اس آیہ مقدسہ یمحوا اللہ مایشاء اس کی وضاحت میں علامہ طبری کچھ آحادیث اور صحابہ کے اقوال لائے ہیں:

((سَأَلَ رَجُلٌ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَقَالَ: أَخْبِرْنِي عَنِ الْقَدَرِ ؟ قَالَ: طَرِيقٌ مُظْلِمٌ لَا تَسْلُكْهُ، وَأَعَادَ السُّؤَالَ فَقَالَ: بَحْرٌ عَمِيقٌ لَا تَلِجْهُ، فَأَعَادَ السُّؤَالَ فَقَالَ: سِرُّ اللَّهِ قَدْ خَفِيَ عَلَيْكَ فَلَا تَفْتِشْهُ))[1]

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 1/ 367

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

(سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے سوال کی گیا مجھے تقدیر کی خبر دیں فرمایا یہ ایک اندھیرا راستہ ہے اس پے نہ چلو اس نے اپنا سوال دہرایا پس آپ نے فرمایا یہ ایک گہرا سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں ہے اس نے پھر اپنا سوال دہرایا آپ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا راز ہے جو تم سے پوشیدہ ہے اس کی تلاش نہ کرو)

اگر ابن عربی کی اس تفصیل اور علامہ طبری کی سب روایات کو دیکھیں تو یہ اابن عربی کا فلسفہ تو ہو سکتا ہے اس کا شریعت اور روایت سے تعلق نہیں ہے۔

کیا تقدیر بدلتی ہے؟

قرآن مجید کی اس آیہ مقدسہ: ﴿وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقا وَعَدۡلاۚ لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَٰتِهِۦۚ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلۡعَلِيمُ﴾[2] (مکمل ہو گئی آپ کے رب کی بات سچائی اور عدل سے نہیں کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کا وہی سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے)

اس آیہ مقدسہ کی وضاحت میں ابن عربی فرماتے ہیں:

"تم قضاؤہ فی الازل بما قضیٰ وقدر من اسلام من اسلم وکفر من کفر ومحبۃ من ا حب احدا وعداوۃ من عاد یٰ قضاء مبرما وحکماً صادقاً مطابقاً لما یقع عادلاً "[3]

(اللہ تعالیٰ کی قضا ازل سے پوری ہو چکی ہے جس کے ساتھ فیصلہ مقدر ہو چکا ہے کہ کون اسلام سے مسلمان ہے اور کون کفر سے کافر ہے اور جو کوئی محبت کرے گا اس کی محبت اور جو کوئی دشمنی کرے گا اس کی دشمنی مقدر ہو چکی ہے وہ قضائے مبرم ہے اور حکم صادق اس امر کے مطابق ہے جو واقع ہو گا عدل سے)

ابن عربی کہتے ہیں کہ قضائے مبرم میں تبدیلی نہیں ہوتی یہ عقیدہ اور ایمان سے مشروط ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں فیصلہ فرمادیا تھا کہ کون ایمان لائے گا اور کون کفر کرے گا۔

1۔ تقدیر کی اشاری اور بالماثور تعبیرات میں یہ قدر مشترک ہے کہ تقدیر کی ایک ایسی قسم ہے جس میں تبدیلی نہیں ہوتی اور وہ اٹل ہے جس کو ابن عربی نے مبرم کا نام دیا ہے اور نبی رحمت ﷺ سے نوجوانوں نے سوال کیا تو آپ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمادی یہاں ان دونوں وضاحتوں میں مقامات اگرچہ الگ الگ ہیں مگر مفہوم میں تضاد نہیں بلکہ اتفاق ہے تو تقدیر کی ایسی قسم ہے جس میں تبدیلی نہیں ہے۔

1۔ القاری، الہروی، علی بن سلطان ابو الحسن نور الدین، **مرقاۃ المفاتیح مشکاۃ المصابیح** (دار الفکر بیروت لبنان 2002ء)، 147/1

2۔ الانعام:115

3۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 239/1

لیکن اس میں ایک خاص بات جس کو ابن عربی قرآن مجید کی کی ذیل کی آیہ مقدسہ کی ذیل میں لکھا ہے:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَن يَسۡتَغۡفِرُواْ لِلۡمُشۡرِكِينَ وَلَوۡ كَانُوٓاْ أُوْلِي قُرۡبَىٰ مِنۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمۡ أَنَّهُمۡ أَصۡحَٰبُ ٱلۡجَحِيمِ﴾[1]

(نبی کے لیے اور نہ ایمان والوں کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ مغفرت طلب کریں مشرکوں کے واسطے اگرچہ وہ مشرک ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں جب کہ واضح ہو گیا ان پر کہ یہ دوزخی ہیں)

اس کی وضاحت میں ابن عربی کہتے ہیں کہ جب ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے تقدیر کا علم ہو جاتا ہے اور کسی کے انجام سے باخبر ہو جاتے ہیں تو اس پر ہی راضی ہو جاتے ہیں اگرچہ ان کی طبیعت اسکے خلاف ہی کیوں نہ ہو:

"لما اطلعو ا علیٰ سر القدر ووقفو ا علیٰ ما قضی اللہ وقدر وعلمو ا بما ینتہی الیہ عواقب الامور لم یکن لہم ان یطلبوا خلاف ذالک ورضو ا بما دبراللہ من امرہ وان کان فی طبیعتہم ما یقتضی خلافہ "[2]

(جب ان کو تقدیر پر اطلاع ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے وہ واقف ہو گئے اور معاملات کے انجام اور انتہا کے سبب کو جان گئے تو ان کے لیے قطعاً روا نہیں کہ اس کے خلاف طلب کریں بلکہ اس پر راضی رہیں جس حکم کی اللہ نے ان کے لیے تدبیر کی ہے اگرچہ ان کی طبیعت اس کے خلاف ہی کیوں نہ چاہے)

2۔ ابن عربی کے مطابق جن لوگوں کے نصیب میں کفر ہے اور اس کے سبب وہ جہنمی ہیں ان کی ناکامی اور نامرادی اللہ نے لکھ دی ہے ان کے لیے دعا کرنا یہ کسی کے لیے روا نہیں ہے بلکہ ایسی چاہت بھی جب علم ہو جائے تو اہل رضا کی شایان شان نہیں ہے جبکہ دوسری جانب تفسیر بالماثور میں اس آیہ مقدسہ کے تحت تقدیر کو نہیں لایا گیا البتہ جہاں تک اللہ کے فیصلہ کو دل سے اور خوشی سے تسلیم کرنے کی بات ہے اس کی وضاحت میں ﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلا بِإِذْنِ اللَّهِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ﴾[3] (نہیں پہنچتی (کسی کو) کوئی مصیبت بجز اللہ تعالیٰ کے اذن کے اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے)۔

اس آیت کی وضاحت میں علامہ سمرقندی فرماتے ہیں:

" أن رجلاً قرأ عنده هذه الآية، فقال: أتدرون ما تفسيرها؟ وهو أن الرجل المسلم، يصاب بالمصيبة في نفسه وماله، يعلم أنها من عند الله تعالى، فيسلم ويرضى. ويقال: مَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ للاسترجاع

1۔ التوبہ:113

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 295/1

3۔ التغابن:11

يعني: يوفقه الله تعالى لذلك. وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ أي: عالم بثواب من صبر على المصيبة"(سمرقندی بحرالعلوم"[1]

(ایک آدمی نے آپ کے پاس اس آیت کی تلاوت کی آپ نے فرمایا اس کی تفسیر جانتے ہو کہ جب ایک مسلمان کو اس کے مال یا جان میں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے پس اس کو تسلیم کرے اور راضی رہے اور فرمایا جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو استرجاع کی توفیق دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو توفیق دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے یعنی اس کے مصیبت پر صبر کو)

جس طرح ابن عربی نے کہا کہ انسان کے تقدیر کے فیصلہ پر انسان کو اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا چاہیے اور شکوہ شکایت نہیں کرنا چاہیے اسی طرح تفسیر بالماثور میں بھی صبر ہی کا درس ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے اس مشکل پر صبر کرتے ہوئے اجر کی امید رکھنی چاہیے اس اعتبار سے مفہوم قریب قریب ہے اگرچہ مقامات مختلف ہیں۔

3۔ ابن عربی ایک اور بات تقدیر پر جو دوسرے سب مفسرین سے مختلف ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوح محفوظ سے نبی رحمت ﷺ کی ذات لیتے ہیں اور اس میں وہ اس آیہ مقدسہ کی تفسیر کرتے ہیں ﴿تِلْكَ ءَايٰتُ ٱلْكِتَٰبِ ٱلْمُبِينِ﴾[2] (یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی) اس کے ابن عربی کہتے ہیں کہ ہیں کہ کتاب مبین سے مراد نبی رحمت ﷺ کی ذات ہے۔

"الذی ہذ ہ الاسماء والصفات آیاتہ ہو الموجود المحمدی الکامل ذو البیان والحکمۃ"[3]

(جس کی آیات یہ اسماء اور صفات ہیں وہ موجود محمدی کامل بیان اور حکمت والی ہے)

ظاہر بات ہے کہ اس کی تعبیر میں نا تو کوئی شرعی دلیل ہے نا عقلی۔

تفسیر اشاری اور بالماثور میں تقدیر کے تقابلی جائزہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تقدیر حق ہے اس پر ایمان لازمی ہے اس کا انکار شریعت کے ایک شعبہ کا انکار ہے اس میں بہت سے مقامات بالماثور اور اشاری مفاہیم میں اتفاق ہے اور چند میں اختلاف بھی ہے۔ تفسیر بالماثور اور اشاری کے اتفاقی پہلو میں تقدیر کی ایک قسم ہے جو بدلتی نہیں۔ اسے موت حیات، شقاوت اور سعادت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

1۔ السمرقندی، **بحرالعلوم**، 457/3

2۔ الشعراء:2

3۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 87/2

فصل دوم:

علامات قیامت سے متعلق ابن عربی کی تشریحات

قرآن مجید کی متعدد آیات میں علامات قیامت کی تفصیلی وضاحت موجود ہے۔اور حدیث نبوی ﷺ میں بھی نبی رحمت ﷺ نے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے اور مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اس کی تصریح کی ہے جس میں شق قمر ،دخان، یاجوج ماجوج، سورج کا مغرب سے طلوع اور ایسی بہت سی علامات ہیں جو قیامت سے قبل ظاہر ہوں گی تب انسان کو اس بات کا احساس ہو گا کہ انسان کی زندگی اس کا ایسا قیمتی سرمایہ ہے کہ اگر ساری دنیا بھی دے دی جائے تب بھی اس کا بدل نہیں ہو سکتا اور انسان کی زندگی میں ایسا وقت بھی آئے گا جب قیامت کی علامات کا ظہور ہو جائے گا تب انسان کو اس زندگی کی قیمت کا احساس ہو گا۔

قرآن حکیم کی آیات مقدسہ سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ خالق کائنات کے منصوبہ کائنات میں ایک وقت ایسا مقرر کیا گیا ہے جب کائنات کی موجودہ تنظیم وترتیب مکمل طور پر پلٹ دی جائے گی۔ ہیئت کائنات مکمل تباہی کا شکار ہو کر دوبارہ سے تشکیل جدید کے مرحلے سے گذرے گی: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو ٱلْجَلَٰلِ وَٱلْإِكْرَامِ﴾[1] (جو کچھ زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے اور باقی رہے گی آپ کے رب کی ذات جو بڑی عظمت اور احسان والی ہے)۔زندگی کی ہر صورت، بشمول انسان موت کا شکار ہو جائے گی اور ہر جان کو موت آئے گی اور کوئی بھی مخلوق جو زمین پر موجود ہے فنا ہو جائے گی اور بفرمان باری تعالیٰ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ ٱلْمَوْتِ﴾[2](ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے) کے مرحلہ سے گزرنا ہے۔

اس سارے عمل کے وقوع پذیر ہونے کا نام قیامت ہے جس کے لیے ایک وقت خاص مقرر ہے مگر اس کی پریشانی کا آغاز اس سے قبل علامات قیامت سے ہو جائے گا۔

علامات قیامت سے متعلق ماثوری اور اشاری تعبیرات:

1۔الرحمٰن:26۔27

2۔آل عمران: 185

مفسرین کے مطابق، قرآن مجید نے قیامت کی کچھ علامات بیان فرمائی ہیں قیامت کی علامات میں سے کچھ ایسی علامات بھی ہیں جو نبی رحمت ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی پوری ہو گئی تھیں اور کچھ ایسی ہیں جو اب پوری ہو چکی ہیں اور کچھ بالکل قریب قیامت پوری ہوں گی، جیسے کہ ایک علامت چاند کا ٹوٹنا ہے:

﴿ٱقۡتَرَبَتِ ٱلسَّاعَةُ وَٱنشَقَّ ٱلۡقَمَرُ﴾[1]

(قیامت قریب آگئی اور چاند شق ہو گیا)

اس آیہ مقدسہ کی روشنی میں چاند کا شق ہونا بھی قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے مگر کیا یہ نشانی گزر چکی ہے؟ یا ابھی نہیں گزری؟ اس کی وضاحت میں علامہ سمرقندی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت نقل کی ہے:

" قال: كنا مع رسول الله صلّى الله عليه وسلم: فانشق القمر نصفين، فرأيت حراء بين فلقتي القمر، أي: شقتي القمر. وعن جبير بن مطعم قال: انشق القمر ونحن مع رسول الله صلّى الله عليه وسلم بمكة. وروى قتادة، عن أنس قال: سأل أهل مكة رسول الله صلّى الله عليه وسلم آية فانشق القمر بمكة. وقال بعضهم: اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ يعني: تقوم الساعة، وينشق القمر يوم القيامة. وأكثر المفسرين قالوا: إن هذا قد مضى"[2]

(وہ فرماتے ہیں ہم نبی رحمت ﷺ کے ساتھ تھے تو چاند درمیان سے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا پس ہم نے دیکھا حرا کو چاند کے دونوں حصوں کے درمیان یعنی چاند شق ہو گیا اور جبیر بن مطعم سے روایت ہے ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے مکہ میں اور قتادہ نے انس بن مالک سے روایت کی کہ نبی رحمت ﷺ سے مکہ میں اس آیت سے متعلق سوال کیا گیا بعض نے کہا ہے کہ یہ قیامت کے دن شق ہو گا اور اکثر کا قول ہے کہ یہ ہو چکا ہے یعنی نبی رحمت ﷺ نے توڑ دیا تھا)

علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں ایک روایت نقل کی ہے جو حضرت حذیفہ بن اسید سے مروی ہے، نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

"لاتقوم حتى تروا قبلها عشر آيات: الدخان، والدجال، وعيسى ابن مريم، ويأجوج وماجوج، والدابة، وطلوع الشمس من مغربها، وثلاثة خسوف: خسف بالمشرق، وخسف بالمغرب، وخسف بجزيرة العرب، وآخر ذلك نار تخرج من قعر عدن أو اليمن تطرد الناس إلى المحشر"[3]

1۔ القمر: 1

2۔ السمرقندی، **بحر العلوم** 369/3

3۔ الآلوسی، **روح المعانی** 305/4

(قیامت قائم نہیں ہو گی یہاں تک کہ تم اس سے قبل دس آیات دیکھ لو۔ دھواں، دجال، عیسیٰ بن مریم، یاجوج ماجوج، دابۃ الارض، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، تین خسف مشرق میں مغرب میں اور جزیرہ عرب میں اور اس میں آخری علامت ایک آگ نکلے گی جو عدن یا یمن سے نکلے گی اور لوگوں محشر میں جمع کر دے گی)

نبی رحمت ﷺ نے بالترتیب علامات قیامت کا تذکرہ فرمادیا اب ان میں سے ہر علامت کو مفسرین کی وضاحتوں کی روشنی میں ذیل میں آتا ہے۔

دخان کی علامت:

قیامت کی علامات میں سے پہلی علامت اس حدیث کی روشنی میں دخان (دھواں) ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿فَٱرۡتَقِبۡ يَوۡمَ تَأۡتِي ٱلسَّمَآءُ بِدُخَانٖ مُّبِينٖ﴾[1]

(پس آپ انتظار کریں اس دن کا جب ظاہر ہو گا آسمان پر صاف نظر آنے والا دھواں)

علامہ ابن جریر فرماتے ہیں:

" يأتي يوم القيامة، فيأخذ أسماع المنافقين وأبصارهم، ويأخذ المؤمنين منه شبه الزكام "[2]

(یہ قیامت کے دن آئے گا اور منافقین کی آنکھوں اور کانوں کو پکڑ لے گا اور مومنین صرف معمولی زکام میں مبتلا ہوں گے)

گویا، قیامت کی علامات میں دھواں کا خروج ہے جو محسوس سبھی کو ہو گا مگر تکلیف سب کو نہیں دے گا اور خاص کر مومن اس سے مامون رہیں گے جب کہ منافق اس سے شدید متاثر ہوں گے اور کافر بھی اس سے شدید تکلیف میں مبتلا ہوں گے اس کی وضاحت میں علامہ آلوسی نے لکھا ہے:

"أما الكافر فيكون بمنزلة السكران يخرج من منخريه وأذنيه ودبره"[3]

(اور جہاں تک کافر ہے وہ بے ہوشی میں ہو گا اس کے نتھوں کانوں اور دبر سے یہ دھواں نکلے گا)

1۔ الدخان:10

2۔ الطبری، **جامع البیان** 22/14

3۔ الآلوسی، **روح المعانی**۔ 117/13

اللہ تعالیٰ مومن کو اس دن کی سختی سے محفوظ فرمائے گا اور منافقین کافر اور بدکار شدید آزمائش میں ہوں گے۔ یہ سلسلہ کتنے دن باقی رہے گا؟ اسکی وضاحت میں نبی رحمت ﷺ کی حدیث ہے علامہ آلوسی نقل فرماتے ہیں: "يملأ ما بين المشرق والمغرب يمكث أربعين يوما وليلة"[1] (یہ دھواں مشرق و مغرب کو بھر دیے گا اور چالیس دن تک رہے گا)

البتہ امام رازی کہتے ہیں کہ یہ حقیقت میں دھواں نہیں ہو گا بلکہ مسلسل قحط کی وجہ سے لوگوں کو بھوک کی شدت کی وجہ سے یہ محسوس ہو گا:

"أَصَابَهُمْ مِنْ شِدَّةِ الْجُوعِ كَالظُّلْمَةِ فِي أَبْصَارِهِمْ حَتَّى كَانُوا كَأَنَّهُمْ يَرَوْنَ دُخَانًا، فَالْحَاصِلُ أَنَّ هَذَا الدُّخَانَ هُوَ الظُّلْمَةُ الَّتِي فِي أَبْصَارِهِمْ مِنْ شِدَّةِ الْجُوعِ، وَذَكَرَ ابْنُ قُتَيْبَةَ فِي تَفْسِيرِ الدُّخَانِ بِهَذِهِ الْحَالَةِ وَجْهَيْنِ الْأَوَّلُ: أَنَّ فِي سَنَةِ الْقَحْطِ يَعْظُمُ يُبْسُ الْأَرْضِ بِسَبَبِ انْقِطَاعِ الْمَطَرِ وَيَرْتَفِعُ الْمَطَرُ وَيَرْتَفِعُ الْغُبَارُ الْكَثِيرُ وَيُظْلِمُ الْهَوَاءُ، وَذَلِكَ يُشْبِهُ الدُّخَانَ"[2]

(شدت بھوک کی وجہ سے ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جائے گا اور ان کو دھواں دکھائی دے گا الغرض یہ دھواں انسان کی آنکھوں کے سامنے شدت بھوک کی وجہ سے ہو گا ابن قطیبہ نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ اس کی دو وجوہات ہیں پہلی تو یہ ہے کہ کئی سال تک بارش نہیں ہو گی جس کی وجہ سے قحط پڑے گا اور غبار آسمان کی جانب اٹھے گا اور فضا آلودہ ہو جائے گی اسے دخان کہا گیا ہے)

ان کے بقول دھواں نظر آنے کا دوسرا سبب یہ ہو گا:

"الثَّانِي: أَنَّ الْعَرَبَ يُسَمُّونَ الشَّرَّ الْغَالِبَ بِالدُّخَانِ فَيَقُولُ كَانَ بَيْنَنَا أَمْرٌ ارْتَفَعَ لَهُ دُخَانٌ، وَالسَّبَبُ فِيهِ أَنَّ الْإِنْسَانَ إِذَا اشْتَدَّ خَوْفُهُ أَوْ ضَعْفُهُ أَظْلَمَتْ عَيْنَاهُ فَيَرَى الدُّنْيَا كَالْمَمْلُوءَةِ مِنَ الدُّخَانِ"[3]

(دوسری بات عرب شر غالب کو بھی دخان سے تعبیر کرتے تھے اور کہتے ہمارے درمیان ایسا معاملہ پیدا ہو گیا ہے جس سے دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جب خوف یا کمزوری سے مرعوب ہوتا ہے تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے اور اس کو ساری دنیا میں دھواں ہی دھواں دکھائی دیتا ہے۔)

یہ علامت قیامت برپا ہونے کے آغاز کی ہے جس وقت انسان کو یہ احساس ہو جائے گا کہ اب اس دنیا کا اختتام ہونے والا ہے مگر اچھے اعمال کا ہونا اس دن کی شدت سے بچائے گا اور برے اعمال پر انسان کو سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

1۔ الآلوسی، **روح المعانی**۔117/13

2۔ الرازی ، ابو عبداللہ محمد بن عمر **مفاتیح الغیب التفسیر الکبیر** (دار الاحیاء التراث العربہ بیروت1998ء) 656/27

3۔ الرازی، **مفاتیح الغیب**، 656/27

ابن عربی کا نقطہ نظر:

ابن عربی کے نزدیک اس دخان سے مراد کوئی معروف دھواں نہیں بلکہ اس سے مراد موت کے وقت کی سختی ہے جس کا تعلق انسان کے اعمال سے ہے اور اس کی وجہ یہ ہے انسان نے اپنے جسم کی جانب زیادہ توجہ نہ دی بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو بجالایا ابن عربی کہتے ہیں:

" ان المومن لقلۃ تعلقہ باالامور البدنیہ وضعف تلک الہیئۃ المستفاد من مباشرۃ الامورا لسفلیۃ یقل انفعالہ منہا ویسہل زوالہ وخصوصا اذا اکتسب ملکۃ الاتصا ل بعالم الانوار "[1]

(کیونکہ مومن کا تعلق امور بدنیہ سے کم ہوتا ہے اس حال میں اس کی یہ ہیئت کمزور ہو جاتی ہے جس کے ملنے سے انسان نے امور سفلیہ سے فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے اس کا انفعال بھی کم ہوتا ہے اور عالم انوار کے ساتھ اتصال کے ملکہ کا اکتساب کرتا ہے)

مومن کو یہ موت کی سختی کم ہوتی ہے کیونکہ اس کی توجہ جسم پروری کی بجائے روح کی آبیاری کی جانب ہوتی ہے اس پر سفلی معاملات اور خواہشات کے اثرات کم ہوتے ہیں اور اس کا تعلق عالم انوار سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے جب موت کا وقت ہو گا یا قیامت کبریٰ (ملاقات الٰہی) کا وقت ہو گا اس وقت نہ تو موت کی سختی اس پر ہو گی اور نہ ہی دیدار الٰہی سے دوری ہو گی۔

ابن عربی کہتے ہیں:

" ام الکافر فلشدۃ تعلقہ قوۃ محبتہ للجسمانیات ورکوعہ الیٰ السفلیات تغشاہ تلک الہیئۃ فتحیرہ وتشملہ حتیٰ عمت مشاعرہ الظاہرۃ والباطنۃ ومخارجہ العلویہ والسفلیہ فلایہتدی الی طریق لا الیٰ العالم العلوی ولا الیٰ عالم السفلی "[2]

(جہاں تک کافر کا تعلق ہے اس کا بہت زیادہ تعلق اور محبت جسمانیات سے ہوتی ہے اور اس کا جھکاؤ سفلی اشیاء کی جانب ہوتا ہے یہ ہیئت اسے حیران کر دیتی ہے یہاں تک کہ وہ ظاہری و باطنی علوی اور سفلی مشاعر دیکھنے سے اندھا ہو جاتا ہے اب اسے نہ عالم علوی کی جانب راستہ نظر آتا ہے اور نہ ہی عالم سفلی کی جانب)

ابن عربی کے نزدیک کافر اپنی روح اور عالم انوار سے بالکل بے خبر ہوتا ہے اس کی ساری توجہ عالم سفلی کی جانب ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت اسے حیران کر دیتی ہے یہاں تک کہ وہ فائدہ اور نقصان دینے والی چیزوں میں فرق کرنے کی قوت کھو بیٹھتا ہے اس کیفیت کو دخان کا نام دیا گیا ہے۔ گویا یہ سب انسان کی اپنی ذاتی تکالیف اور کیفیات ہیں جو مومن کو

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 2/232

2۔ ایضاً

موت کے سکون کی صورت میں اور کافر کو سزا کی صورت میں ہیں۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ قیامت کی دو اقسام ہیں قیامت صغریٰ اور دوسری قیامت کبریٰ۔ وہ موت کو قیامت صغریٰ قرار دیتے ہوئے اسے دخان سے تعبیر کرتے ہیں۔

محل نظر پہلو:

جمہور مفسرین دخان کو قیامت کی ایک علامت قرار دیتے ہیں جب کہ موت کا تصور الگ ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿كُلُّ نَفْس ذَآئِقَةُ ٱلْمَوْتِۖ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِۖ﴾[1]

(ہر نفس موت کو چکھنے والا ہے اور پوری مل کر رہے گی تمہیں تمہاری مزدوری قیامت کے دن)

اس آیہ مقدسہ میں واضح ہے کہ موت الگ چیز ہے اور قیامت الگ ہے۔ موت انسان کو عالم اجسام سے عالم برزخ میں منتقل کرتی ہے، جو کہ قیامت سے قبل عالم ارواح میں پہلے سے موجود ہے۔ اس کی وضاحت میں کلبی کی روایت کی رو سے امام سمرقندی نے کی ہے۔[2]

اگر سورہ دخان کی مذکورہ آیت کے سیاق کو دیکھیں تو یہ قیامت کی علامت جو قریب قیامت میں ظاہر ہو گی اس سے زیادہ اس قحط کی تائید کرتی ہے جس میں مشرکین مکہ مبتلا ہوئے تھے جس کے نتیجے میں وہ مردار تک کھانے پر مجبور ہوئے تھے اور ابو سفیان نبی رحمت ﷺ کی خدمت میں دعا کے لیے حاضر ہوا تھا کیونکہ اس کی مابعد آیات میں ہے کہ ہم ان سے کچھ دنوں کے لیے اس عذاب کو ہٹا دیتے ہیں تو یہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم سب سے بڑی پکڑ کریں گے اور ان سے بدلہ لیں گے تو اس سے مراد قیامت کا دخان نہیں بلکہ اس سے مراد قریش پر قحط کا دخان مراد ہے اور بڑی پکڑ سے مراد قیامت ہے۔

خروج دجال اور نزول عیسیٰ علیہ السلام:

قیامت کی علامات میں سے دوسری علامت دجال کا خروج ہے۔ خروج دجال کا ذکر قرآن مجید میں موجود نہیں ہے البتہ قرآن مجید کی چند آیات میں علامات قیامت کے ذیل میں، بعض مفسرین[3] نے خروج دجال اور نزول عیسیٰ کا ذکر،

1۔ آل عمران: 185

2۔ السمرقندی، **بحرالعلوم**، 271/1

3۔ الزمخشري، جار الله محمود بن عمرو بن أحمد، **الكشاف**، (دار الكتاب العربي بيروت1985ء) 2/82

حدیث مذکور بالا کے ساتھ کیا ہے، ذیل کی آیت کی تشریح میں کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ابن عربی کے ہاں کوئی وضاحت نہیں ملتی۔

﴿هَلۡ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأۡتِيَهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ أَوۡ يَأۡتِيَ رَبُّكَ أَوۡ يَأۡتِيَ بَعۡضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَۗ يَوۡمَ يَأۡتِي بَعۡضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفۡسًا إِيمَٰنُهَا لَمۡ تَكُنۡ ءَامَنَتۡ مِن قَبۡلُ أَوۡ كَسَبَتۡ فِيٓ إِيمَٰنِهَا خَيۡرٗاۗ قُلِ ٱنتَظِرُوٓاْ إِنَّا مُنتَظِرُونَ﴾[1]

(کس کی انتظار کر رہے ہیں بجز اس کے کہ آئیں ان کے پاس فرشتے یا خود آئے آپ کا رب یا آئے کوئی نشانی آپ کے رب کی لیکن جس روز آئے گی آپ کے رب کی نشانی تو نہیں نفع دے گا کسی کو اس کا ایمان لانا جو نہیں ایمان لا چکا تھا اس سے پہلے یا نہ کی تھی نیکی اپنے ایمان کے ساتھ کوئی نیکی آپ (انہیں فرمایئے) تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کر رہے ہیں)

اس آیت میں آیات ربک کی ذیل میں تشریح کرتے ہوئے بعض مفسرین نے علامات قیامت والی حدیث کا حوالہ دیا ہے۔ علامہ طبری دجال کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا آنا قبل از قیامت مرفوع آحادیث سے ثابت ہے:

"وأخرج ابن جرير عن حذيفة بن اليمان مرفوعا أول الآيات الدجال "[2]

(ابن جریر نے حذیفہ بن یمان سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ (قیامت) کی ابتدائی علامات میں سے دجال کا آنا ہے)

دجال کے تعارف میں بھی کچھ تفصیل مفسرین نے دی ہے علامہ آلوسی تفسیر روح المعانی میں فرماتے ہیں:

وأما المسيح الدجال فعربي إجماعا وسمي به لأنه مسحت إحدى عينيه، أو لأنه يمسح الأرض أي يقطعها في المدة القليلة وفرق النخعي بين لقب روح الله [3]

(جہاں تک مسیح دجال کا ذکر ہے یہ عربی ہے اور اس پر اجماع ہے اور اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کی ایک آنکھ مسخ شدہ ہے اور یہ زمین پر بھی فساد کرے گا یعنی اس کو ایک قلیل مدت میں کاٹ ڈالے گا یہی فرق ہے جو نخعی نے کیا ہے عیسیٰ کے مسیح اور اس کے مسیح ہونے میں)

دوسری جانب احادیث میں اس کا ذکر کثرت سے موجود ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، «عَلَى أَنْقَابِ المَدِينَةِ مَلَائِكَةٌ لَا يَدْخُلُهَا الطَّاعُونُ، وَلَا الدَّجَّالُ»[4]

1۔ الانعام:158

2۔ الطبری، **جامع البیان** 117/13

3۔ الآلوسی، **روح المعانی** 55/2

4۔ البخاری، **صحیح بخاری** 22/3 الرقم 1880

(فرماتے ہیں نبی رحمت ﷺ نے فرمایا مدینہ کے تمام داخلی راستوں پر فرشتے مقرر ہیں اس میں طاعون اور دجال داخل نہیں ہوسکتے۔)

گویا، قرآن مجید میں تو دجال کا نام نہیں ہے مگر تفسیر میں اور آحادیث کی سب کتب میں موجود ہے کہ قرب قیامت خروج دجال ہو گا اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا ذکر ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کے وصال سے قبل آسمان پر اٹھالیا تھا اور قیامت سے قبل ان کا دوبارہ نزول بھی قیامت کی علامات کبریٰ میں سے ہے۔

قرآن مجید کی آیہ مقدسہ مذکورہ آیت کی وضاحت میں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول دجال کے بعد ہو گا اور ان کے زمانہ میں دنیا اور آخرت کی خیر وبرکت کی کثرت ہو گی۔ اور عیسیٰ کے ہاتھوں ہی دجال کا قتل ہو گا اللہ تعالیٰ ان کی جانب وحی فرمائے گا:

(ان الله تعالى يوحي إلى عيسى عليه السلام بعد أن يقتل الدجال))[1]

(بے شک اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کی جانب وحی فرمائے گا اور وہ دجال کو قتل کریں گے)

سورج کا مغرب سے طلوع ہونا:

قیامت کی علامات میں سے سورج کا مغرب سے طلوع ہونا بھی ہے جب سورج مغرب سے طلوع ہو گا تو اس وقت توبہ کا دروازہ بند کر دیا جائے گا، سورہ انعام کی آیہ مقدسہ مذکورہ بالا ہی کی روشنی میں مفسرین نے قیامت سے قبل سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کا ذکر بھی کیا ہے، تفسیر روح المعانی میں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"لا تقوم الساعة حتى تطلع الشمس من مغربها فإذا طلعت ورآها الناس آمنوا أجمعون وذلك حين لا ينفع نفسا إيمانها"[2]

(اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہو گی جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہو جائے اور اس کو سب اہل ایمان دیکھیں گے اس وقت کسی کو بھی ایمان لانا نفع نہیں دے گا)

جہاں تک سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی روایت میں تو قطعاً اختلاف نہیں ہے مگر کب طلوع ہو گا اور کتنی دیر ہو تا رہے گا، اس میں روایات مختلف ہیں۔ تمام مفسرین اس بات پر بھی متفق ہیں وہ یہ ہے کہ یہ کائنات کا اختتام بھی نہیں ہو گا اور نہ ہی اس کے بعد ہمیشہ سورج مغرب سے طلوع ہو گا بلکہ یہ عارضی طور پر ہو گا اس کے بعد سورج اپنے مطلع کی جانب لوٹ جائے گا۔

1۔ الآلوسی، **روح المعانی** 88/9

2۔ الآلوسی، **روح المعانی** 305/4

ابن عربی کا مؤقف:

آیت مذکورہ کی تفسیر کے ضمن میں، ابن عربی نے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کا ذکر تو نہیں کیا البتہ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَٰنُهَا--- کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

" لا ينفع نفساً ايمانها لم تكن آمنت من قبل فان الناس اما محجوبون مطلقاً اور ليسوا كذالک وہم اما مؤمنون لعرفانہم ببعض الصفات اوبكلہا والمومنون بہ العارفون اياہ او بكلہا اما محبون للذات واما محبون للصفات فاذا تجلىٰ الحق ببعض الصفات لا ينفع الايمان المحجوبين مطلقاً "[1]

(کسی نفس کو جو پہلے ایمان نہیں لایا تھا ایمان لانا کام نہیں دے گا کیونکہ لوگ یا تو محجوب مطلق ہیں یا ایسے نہیں اور یا تو مومن ہیں جن کا عرفان بعض صفات کے ساتھ ملے یا تمام صفات کے ساتھ اور وہ مومنین جو تمام صفات کے ساتھ پہچانتے ہیں یا ذات کے محب ہیں یا صفات سے محبت کرتے ہیں تو جب حقائق کی تجلی بعض صفات کے ساتھ ہو تو محجوبین کا ایمان مطلقاً فائدہ نہیں دے گا)

ابن عربی یہاں نفع ایمان سے محرومی سے مراد اللہ تعالیٰ سے دوری لی ہے کہ جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات کے شناساں اور عارف ہیں قیامت میں بھی انہیں کو دیدار ملے گا اور جو لوگ آج منکر ہیں تو جس دن یہ سب عیاں ہو گا تو اس دن ان کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ابن عربی اسے اللہ تعالیٰ کی تجلی سے دوری اور قرب کا نام دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات سے محجوب ہو گا وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی صفات سے محبت نہیں کرتا ہو گا اور اس کی صفات میں فنا ہو گا وہ اس دن کی مشکلات یعنی دیدار کی دوری اور حجاب سے محفوظ ہو گا۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا عرفان اور شناسائی رکھنے والوں کو تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے انعام ملے گا جو دیدار الٰہی ہے واور جو محجوب ہیں اس دن محروم رہیں گے کیونکہ ان کو ان کا کفران کے لیے آڑ بن جائے گا۔ گویا ابن عربی، سورج کے اپنے مطلع سے دوری کو دیدار الٰہی سے محرومی سے تعبیر کرتے ہیں۔

یاجوج ماجوج کا نکلنا:

علامات قیامت میں سے یاجوج ماجوج کا نکلنا بھی ہے، سورہ کہف میں ہے:

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 248/1

﴿قَالُواْ يَٰذَا ٱلۡقَرۡنَيۡنِ إِنَّ يَأۡجُوجَ وَمَأۡجُوجَ مُفۡسِدُونَ فِي ٱلۡأَرۡضِ فَهَلۡ نَجۡعَلُ لَكَ خَرۡجًا عَلَىٰٓ أَن تَجۡعَلَ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَهُمۡ سَدّٗا﴾[1]

(انہوں نے کہا اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے اس علاقہ میں تو کیا ہم مقرر کر دیں آپ کے لیے کچھ خراج تا کہ آپ بنادیں ہمارے درمیان ایک بلند دیوار)

تفسیر ابن عباس میں ہے:

"يأجوج كَانَ رجلا وَمَأْجُوج كَانَ رجلا وَكَانَا من بني يافث وَيُقَال سمي يَأْجُوج وَمَأْجُوج لكثرتهم"[2]

(یاجوج اور ماجوج دو آدمی تھے جو یافث بن نوح کی اولاد میں سے تھے ان کو ان کی کثرت کی وجہ سے یاجوج اور ماجوج کہا جاتا ہے)

مگر ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت ہے اس کے مطابق یہ یافث بن نوح کی اولاد سے ہیں نہ کہ یہ بغیر والدہ کے پیدا ہوئے ہیں ان کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے نبی رحمت ﷺ نے فرمایا حضرت حذیفہ بن یمان سے مروی ہے۔

"يَأْجُوجُ وَمأْجُوجُ أُمَمٌ كُلُّ أُمَّةٍ أَرْبَعَ مِائَةِ أَلْفٍ، لا يَمُوتُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ حتى يَرَى أَلْفَ عَيْنٍ تَطْرِفُ بَيْنَ يَدَيْهِ مِنْ صُلْبِهِ، وَهُمْ وَلَدُآدَمَ، فَيَسِيرُونَ إِلَى خَرَابِ الدُّنْيَا، يَكُونُ مُقَدِّمَتُهُمْ بِالشَّامِ وَسَاقَتُهُمْ بِالعِرَاقِ، فَيَمُرُّونَ بِأَنْهَارِ الدُّنْيا، فَيَشْرَبونَ الفُراتَ والدَّجْلَةَ وَبُحَيْرَةَ الطَّبَرِيَّةِ حَتَّى يَأْتُوا بَيْتَ المقْدِسِ، فَيَقُولُونَ قَدْ قَتَلْنَا أَهْلَ الدُّنْيَا"[3]

(یاجوج ماجوج کے کئی گروہ ہیں ہر گروہ چار لاکھ افراد پر مشتمل ہے کوئی آدمی بھی ان میں اس وقت تک نہیں مرتا جب تک وہ اپنی اولاد میں سے ایک ہزار افراد نہیں دیکھ لیتا وہ آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں یہ دنیا کی تباہی کے وقت نکلیں گے اور شام سے عراق تک سب پی جائیں گے وہ فرات دجلہ اور بحیرہ طبریہ تک سارا پانی پی جائیں گے اور بیت المقدس تک پہنچیں گے اور کہیں گے ہم نے اہل دنیا کو قتل کر دیا)

گویا، قیامت سے قبل یاجوج ماجوج نکلیں گے جو بہت تباہی لائیں گے زمین میں موجود ہر چیز کھا پی جائیں گے اور بالآخر اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے اور لوگوں کو ان سے خلاصی ملے گی اور اللہ تعالیٰ ان کی بوسیدگی سے زمین کو اپنی قدرت سے صاف فرمادے گا یہ بھی قیامت کی علامات کبریٰ میں سے ایک بڑی علامت ہے اس کی تفصیل آحادیث کی کتب میں کثرت سے ہے۔

1۔ الکھف:94

2۔ ابن عباس، **تنویر المقیاس** 252

3۔ الطبری، **جامع البیان** 526/18

ابن عربی کا موقف:

ابن عربی کی وضاحت یاجوج ماجوج کے حوالہ سے بالکل مختلف ہے ابن عربی اس کی حقیقت اور عملی صورت کے برعکس اپنی الگ رائے دیتے ہوئے قرآن مجید کی مذکورہ آیہ مقدسہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ان یاجوج الدواعی والهواجس الوہمیہ وماجوج الوساوس ولنوازع الخیالیہ "[1]

(یہ دواعی اور ہواجس وہمیہ کے یاجوج اور وساوس ونوازع خیالیہ کے ماجوج ہیں)

تفسیر ابن عربی میں ہے یہ انسان کی قوت وہمیہ کا اضطراب ہے انسان اپنے وہم میں الجھن اور مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے اور ان اوہام میں مسلسل مبتلا رہتا ہے اور دوسری جانب انسان مختلف وسوسوں میں الجھا رہتا ہے اور اپنے خیالات کے جھگڑے میں مبتلا ہو جاتا ہے تو ابن عربی کہتے ہیں کہ یہ کوئی حقیقی واقعہ نہیں بلکہ یہ انسان کے عمل کے نتیجہ میں انسان کا اپنا اضطراب ہے جس کو یاجوج اور ماجوج کہا گیا ہے۔

قرآن مجید کا یہ فرمانا کہ یاجوج ماجوج زمین پر فساد برپا کر دیں گے، اس کی تعبیر تفسیر ابن عربی میں یوں ہے:

" مفسدون فی ارض البدن باالتحریض علی الرزائل والشہوات المنافیۃ للنظام والحث علی الاعمال لموجبۃ الخلل فیہ وخراب قوانین الخیریۃ "[2]

(فساد برپا کرتے ہیں انسان کے جسم کی زمین میں برائی اور شہوات ابھارنے سے جو نظام کے منافی ہوتے ہیں اور ایسے اعمال کی جانب ابھارتے ہیں جو خلل کا سبب ہوتے ہیں اور بھلائی کے قوانین کو خراب کرتے ہیں)

گویا، ابن عربی کے خیال میں یہ یاجوج ماجوج بری قوتیں ہیں جو ارض بدن میں منفی تبدیلیاں پیدا کرتی ہیں جس کے اثرات سے انسان کی قوت خیالیہ اور وہمیہ متاثر ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں اگر جمہور مفسرین کی آراء کو دیکھیں تو وہاں ان کی ایک تاریخ نظر آتی ہے اور روایات سے ثابت کیا گیا ہے۔ ابن عربی کی بات، مصنف کے اپنے فلسفے اور خیالات تک محدود رہے اور سیاق کلام بھی تفسیر بالماثور کی تائید کرتا ہے۔

دابۃ الارض کا نکلنا:

قیامت کی علامات میں ایک علامت دابۃ الارض کا نکلنا بھی ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 433/1

2۔ ایضاً

﴿وَإِذَا وَقَعَ ٱلْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ ٱلْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ ٱلنَّاسَ كَانُوا۟ بِـَٔايَـٰتِنَا لَا يُوقِنُونَ﴾[1]

(اور جب ہماری بات کا ان پر پورا ہونے کا وقت آجائے گا تو ہم نکالیں گے ایک چوپایہ زمین سے جو ان سے گفتگو کرے گا کیونکہ لوگ ہماری آیتوں پر ایمان نہیں لاتے تھے)

اس آیہ مقدسہ میں قیامت کی علامت دابۃ الارض کے نکلنے کا ذکر ہے نبی رحمت ﷺ فرماتے ہیں کہ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا اور دابۃ الارض کا نکلنا ایک ساتھ ہو گا جو بھی پہلے ہوا دوسرا فوراً اس کے بعد ہو گا:

"أَوَّلُهَا طُلُوعُ الشَّمْسِ مِنَ الْمَغْرِبِ ثُمَّ الدَّابَّةُ ثُمَّ الدَّجَّالُ ثُمَّ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ ثُمَّ الدُّخَانُ"[2]

(قیامت کی پہلی علامت سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے پھر دابۃ الارض کا نکلنا پھر یاجوج ماجوج اور پھر دخان ہے)

ان علامات ترتیب مختلف احادیث میں مختلف آئی ہے دابۃ الارض کا نکلنا ہے قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ اس کی وضاحت میں قرآن مجید کی اس آیہ مقدسہ کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ طبری[3] اور جلال الدین سیوطی بھی روایت نقل کرتے ہیں۔[4] اور جہاں تک اس کے نمودار ہونے کی بات ہے اس میں بھی بہت سی روایات ہیں۔[5]

ابن عربی کا مؤقف:

ابن عربی کی وضاحت یہاں بھی دوسروں سے مختلف ہے ابن عربی اس اس آیہ مقدسہ میں اس دابۃ الارض سے کوئی جانور نہیں مراد لیتے بلکہ وہ کہتے ہیں:

من صورة نفس كل شقي مختلفة الهيئات والاشكال هائلة بعيدة النسبة بين اطرافها وجارها على ماذكر من قصتها بحسب تفاوت اخلاقها وملكاتها من ارض البدن قدام القيامة الصغرى التي هي من اشراطها تكلمهم بلسان حياتها وصفاتها [6]

1۔ النمل: 84

2۔ عبدالملك بن حبيب بن حبيب، **اشراط الساعة وذهاب الاخيار بقاء الاشرار**، (الناشر اضواء السلف 2005ء) 97/2

3۔ الطبری، **جامع البیان**، 499/10

4۔ السیوطی، **الدر المنثور** 383/6

5۔ الطبری، **جامع البیان** 497/19

6۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 107/2

(ہم ارض بدن سے ان کے اخلاق وملکات کے فرق کے اعتبار سے اس کا جو قصہ پہلے بیان ہو چکا ہے اس کے مطابق اس کے اطراف وجوارح کے درمیان دور کی نسبت سے خوفناک اشکال و ہیئات مختلفہ ہر شقی و بدبخت نفس کی صورت میں ان کے لیے چوپایہ پیدا کریں گے یعنی قیامت صغریٰ کے آگے جو ان کی اشراط سے ہے۔)

اس مقام پر ابن عربی اس سے کوئی حقیقی جانور مراد نہیں لیتے جو قیامت کے دن نکلے گا بلکہ اس سے مراد انسان کے نفس کے اثر سے وجود میں ہونے والی بری تبدیلیاں ہیں اور اس کے اثر سے اس کے اطراف میں اور اعضاء میں شقی اور بدبخت جانور پیدا کریں گے جو وجود انسانی میں ہی بے چینی پیدا کرے گا اور یہ سب قیامت صغریٰ یعنی موت میں آنے والے مراحل میں مشکل پیدا کریں گے جو انسان کو فکری اور حقیقی ااعتبار سے خوفزدہ کریں گے۔

اگر قرآن مجید میں اس آیت کے سیاق وسباق کو دیکھیں تو واضح طور پر یہ علامت قیامت ہی لی جائے گی، جس کو جمہور مفسرین نے بیان کیا ہے کیونکہ اس سے قبل مشرکین کا ذکر ہے جو ایمان نہیں لا رہے تو فرمایا جب قیامت آئے گی اور وہ اس دابۃ الارض کو دیکھیں گے اور ایمان لے آئیں گے۔ احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور جہاں تک ابن عربی کی بات ہے کہ یہ کوئی جانور نہیں بلکہ انسان کے برے اعمال کے وجود پر اثرات ہیں اور موت کے وقت کی پریشانی میں ہر برائی پر جانور کا پیدا ہونا نظر آئے گا۔ تاہم یہ ان کا اپنا فلسفہ ہے جس کا قرآن وحدیث سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ظہور مہدی:

احادیث مبارکہ میں قیامت کی علامات کبریٰ میں سے ایک علامت امام مہدی کا ظہور بھی ہے۔ قرآن مجید میں امام مہدی کا ذکر موجود نہیں ہے البتہ مفسرین کے مطابق، مختلف آیات میں اشارتاً اس کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً علامہ آلوسی نے، قرآن مجید میں آیہ درج ذیل کی تفسیر کے تحت لکھا ہے:

﴿وَلَقَدۡ كَتَبۡنَا فِي ٱلزَّبُورِ مِنۢ بَعۡدِ ٱلذِّكۡرِ أَنَّ ٱلۡأَرۡضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ ٱلصَّٰلِحُونَ﴾[1]

(اور بے شک ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں پند وموعظت کے (بیان کے) بعد کہ بے شک زمین کے مالک تو میرے نیک بندے ہوں گے)

امام آلوسی رحمۃ علیہ لکھتے ہیں:

"فمن الأرض ما لم يطأها المؤمنون كالأرض الشهيرة بالدنيا الجديدة وبالهند الغربي، وإن قلنا بأن جميع ذلك يكون في حوزة المؤمنين أيام المهدي رضي الله تعالى عنه"[2]

1۔ الانبیاء:105

2۔ الآلوسی، **روح المعانی** 98/9

(پس مومنین اس سرزمین تک پہنچیں گے جو جدید دنیا میں مشہور رہی مغربی ہند اور اگر یہ کہیں کہ ان سب مقامات پر مومنین کی کثرت ہو گی تو یہ اس زمانہ کی بات ہے جب امام مہدی کا ظہور ہو گا)

علامہ فخر الدین رازی نے سورہ نور کی آیت خلافت کی تفسیر سے ایسا مفہوم اخذ کیا ہے: ﴿وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مِنكُمۡ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ ---﴾[1] (وعدہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور نیک عمل کیے کہ وہ ضرور خلیفہ بنائے گا)

وہ لکھتے ہیں:

"فَقَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: «لَوْ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا يَوْمٌ وَاحِدٌ لَطَوَّلَ اللَّهُ ذَلِكَ الْيَوْمَ حَتَّى يَخْرُجَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ بَيْتِي يُوَاطِئُ اسْمُهُ اسْمِي وَكُنْيَتُهُ كُنْيَتِي يَمْلَأُ الْأَرْضَ عَدْلًا وَقِسْطًا كَمَا مُلِئَتْ جَوْرًا وَظُلْمًا"[2]

(نبی رحمت ﷺ نے فرمایا اگر دنیا میں ایک دن بھی باقی رہ گیا اللہ تعالیٰ اس کو اس قدر طویل فرمادے گا کہ ایک شخص میری اہل بیت سے نکلے گا اس نام میرے نام پر اور اس کی کنیت میری کنیت پر ہو گی وہ شخص زمین کو عدل سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وستم سے بھری ہو گی)

امام جلال الدین سیوطی، در منثور میں ذیل کی آیت سے ظہور مہدی کا مفہوم اخذ کرتے ہیں:

﴿فَهَلۡ يَنظُرُونَ إِلَّا ٱلسَّاعَةَ أَن تَأۡتِيَهُم بَغۡتَةً فَقَدۡ جَآءَ أَشۡرَاطُهَاۚ﴾[3]

(کیا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں کہ آجائے ان کے پس قیامت اچانک بے شک اس کی نشانیاں تو آہی گئی ہیں)

وہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں:

((لَا تقوم السَّاعَة حَتَّى يملك الأَرْض رجل من أهل بَيْتِي أَجلي أقنى وَلَفظ أبي دَاوُد: الْمهْدي مني أجلى الْجَبْهَة أقنى الْأنف يَمْلَأ الأَرْض قسطاً وعدلاً كَمَا ملئت قبله ظلما وجوراً يكون سبع سِنِين))[4]

(قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ میرے خاندان میں سے کوئی شخص زمین کا مالک نہ ہو جائے، ابو داؤد نے کہا: مہدی مجھ سے ہے، پیشانی والا، سب سے زیادہ راست باز، ناک والا، وہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گا جس طرح اس سے قبل ظلم اور زیادتی سے بھر چکی ہو گی ایسا سات سال تک رہے گا)

قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ ٱلَّذِيٓ أَرۡسَلَ رَسُولَهُۥ بِٱلۡهُدَىٰ وَدِينِ ٱلۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهُۥ عَلَى ٱلدِّينِ كُلِّهِۦ وَلَوۡ كَرِهَ ٱلۡمُشۡرِكُونَ﴾[1]

1۔ النور:55

2۔ الرازی، **مفاتیح الغیب** 274/2

3۔ محمد:18

4۔ السیوطی، **الدرالمنثور** 483/7

(وہی (قادر مطلق) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو (کتاب) ہدایت اور دین حق دے کر تا کہ غالب کر دے اسے تمام دینوں پر اگر چہ ناگوار گزرے (یہ غلبہ) مشرکوں کو)

اس آیہ مقدسہ کی روشنی میں امام رازی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت نقل کرتے ہیں:

"هَذَا وَعْدٌ مِنَ اللَّهِ بِأَنَّهُ تَعَالَى يَجْعَلُ الْإِسْلَامَ عَالِيًا عَلَى جَمِيعِ الْأَدْيَانِ. وَتَمَامُ هَذَا إِنَّمَا يَحْصُلُ عِنْدَ خُرُوجِ عِيسَى، وَقَالَ السُّدِّيُّ: ذَلِكَ عِنْدَ خُرُوجِ الْمَهْدِيِّ، لَا يَبْقَى أَحَدٌ إِلَّا دَخَلَ فِي الْإِسْلَامِ أَوْ أَدَّى الْخَرَاجَ"[2]

(یہ خدا کا وعدہ ہے کہ وہ اسلام کو تمام مذاہب پر برتر بنائے گا۔ اس کی تکمیل اسی وقت ہو گی جب عیسیٰ علیہ السلام نکلیں گے، اور السدی نے کہا یہ اس وقت ہو گا جب مہدی ظہور کرے گا، دن کے آخر تک)

اس روایت کی تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام سب ادیان پر غالب آئے گا اور اسلام کی ترقی کا یہ سلسلہ زمانے کے آخر تک جاری رہے گا حتیٰ کہ جب عیسیٰ کا ظہور ہو گا تو آج اگر چہ عیسائیوں کی تعداد زیادہ ہے مگر جس وقت عیسیٰ علیہ السلام ہی اس مذہب کے پیروکار بن کے آئیں گے تب اسلام روئے زمین پر سب سے بڑا مذہب ہو گا اور جب امام مہدی کا ظہور ہو گا تو زمین پر صرف اسلام ہی ہو گا۔

ابن عربی کی تعبیرات:

ابن عربی اپنی تفسیر میں دو مقامات پر امام مہدی کا ذکر کرتے ہیں، ایک سورۃ الزخرف کی آیت کی تشریح میں:

﴿ وَإِنَّهُۥ لَعِلۡمٞ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمۡتَرُنَّ بِهَا وَٱتَّبِعُونِۚ هَٰذَا صِرَٰطٞ مُّسۡتَقِيمٞ﴾[3]

(بے شک وہ ایک نشانی ہیں قیامت کے لیے پس اس میں ہر گز شک نہ کرو اور میری پیروی کیا کرو یہ سیدھا راستہ ہے)

اس مقام پر ابن عربی کہتے ہیں:

"لامہدی الا عیسیٰ بن مریم ان کان مہدی غیرہ فدخولہ بیت المقدس وصولہ الیٰ محل المشاہدۃدون مقام القطب الامام الذی یتاخر الذی ہوالمہدی انما یتاخر مع کونہ قب الوقت مراعاۃ لادب صاب الولایۃ مع صاحب النبوۃ وتقدیم عیسیٰ علیہ السلام ایاہ لعلمہ بتقدیمہ فی نفس الامر لمکان قطبیۃ وصلاتہ خلفہ علی الشریعۃ المحمدیۃ اقتداؤہ نہ تحقیقا الاستفاضۃ منہ ظاہراً وباطناً "[4]

1۔ التوبہ: 33

2۔ الرازی، **مفاتیح الغیب** 33/16

3۔ الزخرف: 61

4۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 228/2

(مہدی عیسیٰ بن مریم ہیں اگر مہدی اس کے علاوہ ہیں ان کا بیت المقدس میں داخل ہونا ان کا پہنچ جانا ہے یعنی مقام قطب کے علاوہ محل مشاہدہ اور امام جو تاخیر کے ساتھ آئے گا وہ امام مہدی علیہ السلام ہیں اور ان کا قطب وقت ہونے کے باوجود تاخیر سے آنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقدیم اور صاحب ولایت کے ساتھ آداب کی رعایت کی وجہ سے ہے اس لیے کہ انہیں ظاہراً اور باطناً اس سے استقامت کے لیے تحقیقاً اس کے ساتھ ان کی پیروی شریعت محمدیہ پر ان کے پیچھے اپنی نماز ادا کرنا ان کی قطبیت کے مقام کی وجہ سے نفس الامر میں ان کے تقدم کو جاننا ہے)

گویا، ابن عربی کے ہاں، ایک تو یہ کہ مہدی عیسیٰ بن مریم ہی ہے۔ سوال ہو گا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول پہلے کیوں ہے، تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نبوت ولایت پر مقدم ہوتی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام پہلے آئیں گے اور امام مہدی کیونکہ ولی ہیں اور اس میں بلند ترین مقام قطب کا ہے، اس لیے عیسیٰ علیہ السلام جب دوبارہ آئیں گے تو نبی رحمت ﷺ کے امتی بن کے آئیں گے، یہ ان کا مقام ولایت بطور قطب ہو گا۔

ابن عربی نے یہ دعویٰ کہ عیسیٰ علیہ السلام ہی مہدی ہیں، قابل قبول اس لیے نہیں کیونکہ یہ احادیث صریحہ کے خلاف ہے، تفسیر اشاری کی بھی کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ جہاں بات عیسیٰ کی آمد اور امام مہدی کی اقتداء کی ہے تو اس پر احادیث موجود ہیں۔ حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

((«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ»، قَالَ: " فَيَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَيَقُولُ أَمِيرُهُمْ: تَعَالَ صَلِّ لَنَا، فَيَقُولُ: لَا، إِنَّ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ أُمَرَاءُ تَكْرِمَةَ اللهِ هَذِهِ الْأُمَّةَ))[1]

(میری امت سے ایک گروہ غلبہ کے ساتھ حق پے جہاد کرتا رہے گا اور کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو گا پس ان کا امیر عیسیٰ علیہ السلام سے کہے گا آیئے جماعت کروایئے تو وہ کہیں گے نہیں یہ عزت اللہ تعالیٰ نے تم کو دی ہے تم ہی ایک دوسرے کی امامت کرو گے)

امام مہدی کے آنے کی خبر تفاسیر کی بہت سی کتب میں مفسرین نے لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی شان میں عظیم ہوتا ہے اس لیے عیسیٰ علیہ السلام کا آنا امام مہدی کی آمد پر مقدم ہے اور جب عیسیٰ علیہ السلام آجائیں گے اور امت میں شامل ہو جائیں گے۔

امام مہدی کب آئیں گے، اس کی وضاحت ابن عربی قرآن مجید کی ایک اور آیہ مقدسہ کی روشنی میں کرتے ہیں:

1۔القشیری، ابو الحسن مسلم بن حجاج، **الجامع الصحیح المسلم**، (المطبعة البابي الحلبي 1955ء) 137/1 الرقم 156

﴿ٱلنَّارُ يُعۡرَضُونَ عَلَيۡهَا غُدُوّا وَعَشِيّاۚ وَيَوۡمَ تَقُومُ ٱلسَّاعَةُ أَدۡخِلُوٓاْ ءَالَ فِرۡعَوۡنَ أَشَدَّ ٱلۡعَذَابِ﴾[1]

(دوزخ کی اگ ہے انہیں پیش کیا جاتا ہے انہیں اس پر صبح اور شام اور جس دن قیامت قائم ہو گی (حکم ہو گا) داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں)

اس مقام پر ابن عربی کہتے ہیں:

"ویوم تقوم الساعۃ بمحشر الاجساد او ظہو ر المہدی علیہ السلام قیل لہم ادخلوا اشدالعذاب لانقلاب ہیئاتہم وصوربہم وتراکم الظلمات وتکائف الحجب وضیق المجلس وضنک المضجع علی الاول وقہر المہدی علیہ السلام ایاہم وتعذیبہ لہم لکفربہم وبعدہم عنہ ومعرفتہ ایاہم بسیماہم علی لثانی "[2]

(اور جب جسموں کو اٹھایا جائے گا اور امام مہدی علیہ السلام کا ظہور ہو گا اور انہیں کہا جائے گا سخت ترین عذاب کی جانب چلو اس لیے کہ ان کی صورتیں اور ہئتیں تبدیل ہو جائیں گی اور تہہ بہ تہہ اندھیرے ہوں گے اور حجابات کھل جائیں گے اور اول پر قیدی کو لپٹنے والے کے لیے انتہائی ضیق اور تنگی ہو جائے گی اور حضرت امام مہدیؑ علیہ السلام کا ان پر غلبہ ہو گا اور انہیں آپ اپنا کفر اور انکار اور خود سے دوری کی وجہ سے عذاب دیں گے دوسروں کو آپ ان کے چہروں سے پہچان لیں گے)

ابن عربی کے اس تبصرہ سے تو یہ واضح ہوتا ہے جب انسانوں کی حشر اجساد کے لیے اٹھایا جائے گا تب امام مہدی کا ظہور ہو گا اور جیسے انسانوں کے عمل ہوں گے ویسی ان کی صورتیں تبدیل ہو جائیں گی اور اسی قدر گناہوں کی مقدار اور معیار کے اعتبار سے ان کے لیے گہرے اندھیرے ہوں گے اور ان کی اس حالت میں امام مہدی جب آئیں گے تو وہ ان پے غالب آجائیں گے اور لوگوں کو ان کے چہرے سے پہچان لیں گے تو امام کا اس مقام پر آنا ابن عربی کہتے ہیں کہ حشر کے دن ہے مگر یہ رائے ابن عربی کی اپنی رائے ہی کے خلاف ہے جو وہ اس سے قبل دے چکے ہیں کہ وہ زمین پر انصاف قائم کریں گے اور لوگوں کی امامت کریں گے کیونکہ وہ قطب الوقت ہوں گے اور قیامت میں تو کچھ نہیں ہو گا سوائے حساب اور سزا جزا کے تو ابن عربی کا یہ تبصرہ کہ مہدی قیامت کے دن آئیں گے قرائن اصول تفسیر کے مطابق نہیں ہے۔

امام مہدی قیامت برپا ہونے سے قبل آئیں گے اسکی تفصیل احادیث اور کتب تفاسیر میں موجود ہے۔ امام رازی روایت نقل کرتے ہیں:

"فَقَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: «لَوْ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا يَوْمٌ وَاحِدٌ لَطَوَّلَ اللَّهُ ذَلِكَ الْيَوْمَ حَتَّى يَخْرُجَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ بَيْتِي يُوَاطِئُ اسْمُهُ اسْمِي وَكُنْيَتُهُ كُنْيَتِي يَمْلَأُ الْأَرْضَ عَدْلًا وَقِسْطًا كَمَا مُلِئَتْ جَوْرًا وَظُلْمًا"[1]

1۔ غافر:46

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 203/2

(نبی رحمت ﷺ نے فرمایا اگر دنیا میں ایک دن بھی باقی رہ گیا اللہ تعالیٰ اس کو اس قدر طویل فرمادے گا کہ ایک شخص میری اہل بیت سے نکلے گا اس نام میرے نام پر اور اس کی کنیت میری کنیت پر وہ شخص زمین کو عدل سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وستم سے بھری ہوگی)

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ امام مہدی قیامت والے دن نہیں بلکہ اس سے قبل آئیں گے زمین پر عدل قائم کریں گے اسے ظلم سے پاک کریں گے اور اس پر حکومت کریں گے تو تفسیر ابن عربی کا یہ تبصرہ کہ امام مہدی حشر اجساد کے وقت آئیں گے اسکی کوئی تاریخی حقیقت نہیں ہے۔

خسف زمین اور آگ کا نکلنا:

قیامت سے قبل تین مقامات پر زمین دھنس جائے گی، اس علامت کو قرآن مجید کی سورہ انبیاء کی ذیل کی آیت سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے:

﴿ٱقۡتَرَبَ ٱلۡوَعۡدُ ٱلۡحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَٰخِصَةٌ أَبۡصَٰرُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ يَٰوَيۡلَنَا قَدۡ كُنَّا فِي غَفۡلَةٖ مِّنۡ هَٰذَا بَلۡ كُنَّا ظَٰلِمِينَ﴾[2]

(قریب آگیا ہے سچا وعدہ تو اس وقت تاڑے لگ جائیں گی نظریں ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا تھا(کہیں گے)صد حیف ہے کہ ہم تو غافل رہے اس امر سے بلکہ ہم تو ظالم تھے)

اس آیہ مقدسہ کی روشنی میں اکثر مفسرین نے بہت سی قیامت کی علامات کا ذکر کیا ہے جس میں خسف فی الارض کا بھی ذکر ہے۔ علامہ بغوی اس آیہ مقدسہ کے تحت لکھتے ہیں اور حضرت حذیفہ بن اسید غفاری کی روایت نقل کرتے ہیں ہم بیٹھے قیامت کا ذکر کر رہے تھے تو نبی رحمت ﷺ تشریف لائے تو چند علامات قیامت کا ذکر فرمایا اور اس میں خسف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

((ثَلَاثَةَ خسوف: خسف بالمشرق وخسف بالمغرب وَخَسْفٌ بِجَزِيرَةِ الْعَرَبِ))[3]

(تین مقامات پر زمین غرق ہوگی ایک مشرق میں ایک مغرب میں اور ایک جزیرہ عرب میں)

1۔ الرازی، **مفاتیح الغیب** 274/2

2۔ الانبیاء:97

3۔ البغوی، ابومحمد الحسین مسعود بن محمد الفرا، **معالم التنزیل فی تفسیر القرآن**، (دار الاحیاء التراث العربی بیروت 1998ء)، 317/3

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

((خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ فِي جَزِيرَةِ الْعَرَبِ)) [1]

(تین مقامات پر زمین دھنس جائے گی مشرق مغرب اور جزیرۃ العرب)

نبی رحمت ﷺ نے واضح انداز میں زمین کے خسف کا ذکر کیا یہ اتنا بڑا خسف ہو گا کہ جو دنیا میں ایک علامت کے طور پر پیش کیا جائے گا اتنا بڑا خسف اور کہیں نہیں ہو گا اس کی تباہی کو ہی قیامت کی علامت قرار دیا گیا۔ قیامت کی علامات میں سے آخری علامت ایک آگ ہے جو یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو میدان محشر میں جمع کر دے گی اس کی وضاحت میں بھی مفسرین کے بہت اقوال ہیں، جو قرآن مجید کی ذیل کی آیت کے ضمن میں آئے ہیں:

﴿وَٱسْتَغْفِرْ لِذَنۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتِ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوَىٰكُمْ﴾ [2]

(مغفرت طلب کریں مسلمان مردوں کے لیے اور مسلمان عورتوں کے لیے اور اللہ تعالیٰ جانتا تمہارے چلنے پھرنے کی اور آرام کرنے کی جگہوں کو)

علامہ سمعانی فرماتے ہیں:

"أَشْرَاط السَّاعَة نَار تخرج من الْمشرق فتسوق النَّاس إِلَى الْمغرب " [3]

(قیامت کی شرائط میں سے آگ کا نکلنا ہے جو مشرق سے نکلے گی اور لوگ مغرب کی جانب چلیں گے)

علامہ بغوی فرماتے ہیں:

"آخِرُ ذَلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ إِلَى مَحْشَرِهِمْ" [4]

(اس کی آخری علامت یہ ہے کہ آگ یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو محشر میں جمع کرے گی)

اور جہاں تک اس آگ کی اشاری تعبیرات کی بات ہے اس مقام پر تفسیر ابن عربی خاموش ہے اور اس کی وضاحت میں کچھ نہیں کہا البتہ اس آیہ مقدسہ کی تفسیر میں تفسیر ابن عربی میں ہے:

"انتقالاتکم فی السلوک من رتبۃ الیٰ رتبۃ ومن حال الیٰ حال ومثوٰ کم ومقامکم الذی انتم فیہ ففیض علیکم الانوار وینزل الامداد علیٰ حسبھا" [1]

1۔ القرطبی ،ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی ، **الجامع لاحکام القرآن** (دار لکتب المصریہ قاہرہ 1964ء 16/130

2۔محمد: 19

3۔ السمعانی ابو المظفر منصور بن محمد بن عبدالجبار بن احمد المروزی الشافعی **التفسیر السمعانی**(الناشر دار الوطن الریاض السعودیہ 1997ء) 117/5

4۔ البغوی، **معالم التنزیل**،355/5

(یہ تمہارا سلوک میں ایک مقام سے دوسرے مقام کی جانب انتقال ہوتا ہے اور تمہارا مقام اور ٹھکانا جس میں تم ہو تم پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے فیض اور انوار کا تمہاری حسب طاقت نزول ہوتا ہے۔)

گویا، ابن عربی اسے اپنی ذات میں تبدیلی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس سے مراد انسان کا اپنی روحانیت میں ایک مقام سے دوسر مقام کی جانب انتقال لیتے ہیں اور انسان کی حسب طاقت فیض نور الٰہی کا وصول مراد لیتے ہیں ابن عربی انسان کے وجود پر عبادات کے اثرات کو مادی طور پر محسوس کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں انسان کا وجود ہے برائی کا منبع اور اسی سے سزاوابستہ ہے جو نور اور فیض االٰہی سے محرومی ہے اور یہی جو وجوہر اچھائی کا مرکز ہے اور یہی وجود انوالر الٰہی سے متصل ہے اور اس سے اطمینان کی کیفیت جنم لیتی۔

اگر سیاق کلام کی بات کریں تو اس سے قبل سورۃ محمد کی آیت نمبر 18 میں قیامت کی اشراط کا ذکر ہے جس وجہ سے مفسرین نے ایسی روایات اس میں لکھ دی ہیں جن میں آگ کے نکلنے کا ذکر بھی ہے وگرنہ یہ آیت کسی بھی اعتبار سے قیامت کے قریب نکلنے والی آگ پر دلالت نہیں کرتی اور دوسری بات ٹھکانا، اس سے مراد میدان محشر ہے تو اس میدان میں جمع یہ آگ ہی کرے گی اور لوگ اس کے آگے دوڑیں گے اس لیے اس کی تفسیر میں اس آگ کا ذکر کیا گیا ہے۔

1۔ ابن عربي ، **تفسیر ابن عربي** 251/2

باب چہارم: قیامت اور آخرت سے متعلق ابن عربی کے نظریات

فصل اول: قیامت اور اس کے مراحل

فصل دوم: جنت اور دوزخ سے متعلق تصورات

فصل اول: قیامت اور اس کے مراحل

قیامت اور اس کے مراحل کا آغاز بعث بعد الموت اور حشر اجساد سے ہو گا یہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے جو انسان میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ اسے ہر حال میں ایک دن خالق جن و بشر کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ جو انسان نیک اعمال کا حامل ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے جزا کا حق دار ہو گا اور جو اعمال بد کا مرتکب رہا ہے اس کے لیے سزا کا سلسلہ جاری ہو گا۔ اس عقیدہ کی وجہ سے انسان نہ تو طاقت ور ہونے کی صورت میں حد سے گزرتا ہے اور نہ ہی کمزور ہونے کی صورت میں مایوسی کا شکار ہوتا ہے بلکہ انسان کو اس بات پے پختہ یقین ہوتا ہے کہ ایک ذات ایسی بھی ہے جس کے سامنے نہ بادشاہ کی کوئی اعلیٰ حیثیت ہے نہ ہی فقیر کمزور ہے۔

یہ عقیدہ بندے کو حدود و قیود میں زندگی بسر کرنے کا پابند بناتا ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس عقیدہ کی وضاحت فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ ٱلَّذِي يَتَوَفَّىٰكُم بِٱلَّيۡلِ وَيَعۡلَمُ مَا جَرَحۡتُم بِٱلنَّهَارِ ثُمَّ يَبۡعَثُكُمۡ فِيهِ لِيُقۡضَىٰٓ أَجَل مُّسَمّٗىۖ ثُمَّ إِلَيۡهِ مَرۡجِعُكُمۡ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمۡ تَعۡمَلُونَ﴾[1]

(وہ وہی ہے جو قبضہ میں لے لیتا ہے تمہیں رات کو اور جانتا ہے جو تم نے کمایا دن کو پھر اٹھاتا ہے تمہیں نیند سے تا کہ پوری کر دی جائے (تمہاری عمر کی) میعاد پھر اسی کی جانب تمہارا لوٹنا ہے پھر وہ بتائے گا تمہیں جو تم کیا کرتے تھے)

قرآن مجید کی اس آیہ مقدسہ میں بتایا کہ اچھے اور برے اعمال کی ساری تفصیل ہمارے پاس محفوظ ہے پھر ایک دن ہماری بارگاہ میں حاضر بھی ہونا ہے پھر انسان کو اپنا پورا حساب دینا ہے اور ہماری بارگاہ سے بدلہ پانا ہے اس کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں:

" يخبركم بما كنتم تعملون في حياتكم الدنيا، ثم يجازيكم بذلك، إن خيرًا فخيرًا وإن شرًّا فشرًّا"[2]

(تمہیں خبر دے گا جو تم عمل کیا کرتے تھے اپنی دنیا کی زندگی میں پھر تمہیں بدلہ دے گا اگر تو عمل اچھا ہوا تو اچھا اور اگر برا ہوا تو بدلہ بھی ویسا)

ابن عربی کے ہاں قیامت صغریٰ اور کبریٰ:

1۔ الانعام: 60

2۔ الطبری، **جامع البیان** 407/11

تفسیر ابن عربی کے مطابق قیامت کی دو اقسام ہیں صغریٰ اور کبریٰ دونوں کا تعلق انسان کے اعمال کے اختتام پر اس کائنات سے جدا ہونے سے ہے اگر اعمال اچھے نہ ہوئے تو موت کی سختی، فرشتوں کی جان قبض کرتے ہوئے تکلیف دینا یہ سب اس میں شامل ہیں قیامت صغریٰ ہو یا کبریٰ ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے احکامات کو مان لینے سے ہے ان کی سختی نافرمانی سے ہے اور آسانی فرمانبرداری سے ہے ان آیات قرآنی کا اگر سیاق وسباق کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو تفسیر بالماثور میں قیامت کی وضاحت عین سیاق و سباق کے مطابق ہے امر الساعۃ یوم البعث اور یوم الحساب سب سے مراد قیامت ہی ہے مگر تفسیر ابن عربی میں قیامت صغریٰ کا نام دے کر موت کو بھی اس کی قسم بنا دیا گیا ہے جب کہ سیاق کلام کے مطابق موت تو قبل از قیامت ہے بلکہ ہم ہر روز اس کا نظارہ مرنے والوں کی صورت میں دیکھتے ہیں اور باقی اس سے مراد دیدار کی محرومی جلال الٰہی یہ تعبیری اصطلاح ہے کہ قیامت میں جزا اور سزا تو ہو گی وہ یقیناً غضب اور رضا ہی ہے یوں اس کو الفاظ کی تبدیلی اور مراد ایک ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

قیامت کا آغاز:

قرآن حکیم کے مطابق عملی طور پر قیامت کا آغاز ہو گا جب صور پھونکا جائے گا زمین پر موجود سب کچھ ختم ہو جائے گا جس کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا:

﴿وَيَوْمَ يُنفَخُ فِي ٱلصُّورِ فَفَزِعَ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِي ٱلْأَرْضِ إِلَّا مَن شَآءَ ٱللَّهُ ۚ وَكُلٌّ أَتَوْهُ دَٰخِرِينَ﴾[1]

(اور جس دن صور پھونکا جائے گا اور گھبرا جائے گا ہر کوئی جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے مگر جنہیں خدا نے چاہا وہ نہیں گھبرائیں گے اور سب حاضر ہوں گے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزی سے)

دوسری مرتبہ کے نفخہ سے سب اٹھ کھڑے ہوں گے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿وَنُفِخَ فِي ٱلصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ ٱلْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ﴾[2]

(اور جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو فوراً اپنی قبروں سے نکل نکل کر اپنے پروردگار کی جانب تیزی سے جانے لگیں گے)

اور تیسرے نفخہ میں ان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچنے کا پیغام ہو گا یہ نفخہ پہلے نفخہ کی طرح نہیں ہو گا جس کو نبی رحمت ﷺ نے فرمایا کہ تیسرا نفخہ فرمایا تم کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لا کھڑا کرے گا اس کی وضاحت قرآن مجید کیا اس آیت مقدسہ سے ہوتی ہے:

1۔ النمل: 87

2۔ یٰسن: 51

﴿يَوۡمَئِذ يَتَّبِعُونَ ٱلدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُۥ وَخَشَعَتِ ٱلۡأَصۡوَاتُ لِلرَّحۡمَٰنِ فَلَا تَسۡمَعُ إِلَّا هَمۡسٗا﴾[1]

(اس دن سب لوگ پیروی کریں گے پکارنے والے کی اور روگردانی نہیں کریں گے اس سے اور خاموش ہو جائیں گی سب کی آوازیں رحمٰن کے خوف سے پست ہوں گی تو نہ سنے گا (اس روز) مگر مدھم آواز)

اس کا مطلب یہ ہے کہ سب اس دن اس قدر خوف زدہ ہوں گے کہ کسی کو بات کرنے کی ہمت نہ ہو گی سب کی سانس تک کی آواز بھی پیدا نہیں ہونے دیں گے۔

قیامت کا آغاز صور پھونکنے سے ہو گا جس کو نفخہ اولیٰ کہا جاتا ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے ﴿ فَإِذَا نُفِخَ فِي ٱلصُّورِ نَفۡخَةٞ وَٰحِدَةٞ﴾[2] (پھر جب پھونک مار دی جائے گی صور میں ایک بار) یہ پہلی مرتبہ کا نفخہ ہے جس سے سب کی موت ہو جائے گی اس کی وضاحت ابن عربی کرتے ہیں:

"ہی النفخۃ الاولیٰ التی للاماتۃ فی القیامۃ الصغریٰ اذ یمنع حملہ علیٰ الکبریٰ "[3]

(یہ پہلی پھونک ہے جو قیامت میں موت کے لیے پھونکی جائے گی اس لیے اسے قیامت کبریٰ پر محمول کرنا منع ہے)

ابن عربی چونکہ موت کو قیامت صغریٰ پر محمول کرتے ہیں اس لیے وہ کہتے ہیں پہلے نفخہ میں قیامت کبریٰ مراد نہیں لی جاسکتی بلکہ قیامت صغریٰ پر ہی محمول ہو گا یعنی نفخہ میں سب انسانوں کی موت ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ہر ایک ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے یہ وعدہ پورا ہو گا اور زمین پر موجود ہر چیز کو مٹا دیا جائے گا۔ اس کے بعد نفخہ ثانیہ ہو گا جس کو قرآن مجید کی اس آیہ مقدسہ میں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَيَوۡمَ يُنفَخُ فِي ٱلصُّورِ فَفَزِعَ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِي ٱلۡأَرۡضِ إِلَّا مَن شَآءَ ٱللَّهُۚ وَكُلٌّ أَتَوۡهُ دَٰخِرِينَ﴾[4]

دوسرے نفخہ میں سب دوبارہ زندہ ہوں گے پھر اس کے بعد سب کا نامہ اعمال ان کے ہاتھوں میں دیا جائے گا اس کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَأَمَّا مَنۡ أُوتِيَ كِتَٰبَهُۥ بِيَمِينِهِۦ فَيَقُولُ هَآؤُمُ ٱقۡرَءُواْ كِتَٰبِيَهۡ﴾[5]

(پس جس کو دے دیا گیا اس کا نامہ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں پس وہ (فرط مسرت سے) کہے گا لو پڑھ لو میرا نامہ عمل)

1۔ طہ:108

2۔ الحاقہ:13

3۔ ابن عربی **تفسیر ابن عربی** 345/2

4۔ النمل: 87

5۔ الحاقہ:19

ابن عربی فرماتے ہیں:

"ہذا لنفخ عبارة عن تاثیر الروح القدسی بتوسط الروح الاسرافیلی الذی ہو موکل بالحیاة فی الصورة الانسانیة عندالموت لازہاق الروح فیقبضہ الروح العزرائیلی"[1]

(یہ نفخہ حقیقت میں روح اسرافیلی کے ذریعے روح قدسی کی تاثیر ہو گی کیونکہ اسرافیل موت کے وقت انسانی صورت میں زندگی کے مؤکل ہیں چونکہ یہ روح کی ہلاکت کا وقت ہوتا ہے تو روح عزرائیلی اسے قبض کر لیتی ہے)

اس میں ابن عربی کہتے ہیں کہ نفخہ اور یہ آواز نکالنے والے تو بظاہر اسرافیل ہی ہیں مگر حقیقت میں یہ آواز اللہ تعالیٰ کی ہے جو پہنچانے کی ذمہ داری اسرافیل ادا کر رہے ہیں کیونکہ یہ اس کے مؤکل ہیں اور روح کے اختتام کا وقت ہوتا ہے تو اسے عزرائیل قبض کر لیتے ہیں تو حقیقت میں نفخہ یہ روح قدسی (اللہ تعالیٰ) کی آواز ہے جس سے انسان کی روح قبض ہو گی مگر یہ ہو گی عزرائیل کے ذریعے۔ اور دوسرے نفخہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے ابن عربی فرماتے ہیں:

" وکل اتوہ الی المحشر للبعث صاغرین ازلاء لا قدرة لہم ولا اختیار ، اواتوہ منقادین قابلین لحکمہ بالموت"[2]

(سب اس کے حضور عاجزی کرتے ہوئے داخل ہوں گے یعنی محشر کی طرف اٹھنے کے لیے اہل پستی ذلت سے آئیں گے نہ انہیں کچھ قدرت حاصل ہو گی اور نہ اختیار یا یہ مطیع اور منقاد ہو کر موت کے ساتھ حکم خداوندی کے لیے حاضر ہوں گے)

نفخہ ثانیہ کے بعد سب حساب کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس حال میں حاضر ہوں گے کہ ان کی کوئی ہمت اور طاقت نہیں ہو گی مطیع اور مجبور ہوں گے اور اپنے فیصلہ کے لیے منتظر ہوں گے یہ سب روداد میدان محشر کی ہے۔

ابن عربی کہتے ہیں کہ نفخہ اولیٰ یہ قیامت صغریٰ ہے اور فنخہ ثانیہ یہ روح قدسیہ ہے جو اسرافیل پہنچائیں گے اور عزرائیل روح کو واپس لے جائیں گے اس روح قدسیہ سے ابن عربی کی مراد امر الٰہی ہے مگر یہ منفرد تفسیر ابن عربی سے خاص ہے اور آخری بار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ابن عربی اور باقی سب مفسرین میں متفق علیہ ہے اور تفسیر اشاری بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

قیامت کی احوال میں سے آسمان کا پھٹنا بھی ہے اسے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے:

﴿ إِذَا السمآء انشقت﴾[3]

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 345/2

2۔ ایضاً 108/2

3۔ الانشقاق:1

(جب آسمان پھٹ جائے گا)

تفسیر میں، آسمان کے پھٹنے کو دو صورتوں میں بیان کیا ایک یہ کہ آسمان قیامت کے خوف سے پھٹ جائے گا اور دوسرا آسمانوں کی مخلوقات کے اترنے سے دروازے ہی دروازے بن جائے گا۔ مگر ابن عربی اس کی توجیہ مختلف ہے، وہ لکھتے ہیں:

"انفطرت اى انقادت لامره بانفراجها عن الروح الانسانى انقيادالسامع المطيع لآمره المطاع "[1]

(اپنے رب کا حکم سننے کے یعنی روح انسانی سے مراد انفراج اور کھلنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع کرے اور مطیع سامع اور مطاع جس بات کا حکم دے اس کی اطاعت کرے)

گویا ابن عربی آسمان کے پھٹنے سے اس کے حقیقی معانی نہیں لیتے بلکہ اس کی تاویل کر کے اسے انسان کی روح کا کشف ا اور ترقی لیتے ہیں کہ انسان جب اللہ تعالیٰ کے احکام کو سن کر اس پر عمل کرتا ہے تو روح کو وسعت ملتی ہے اور وہ آسمان کی مثل وسیع ہو جاتی ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم ماننے کا نتیجہ ہوتا ہے۔

تفسیر ماثور میں بعث بعد الموت:

قرآن حکیم کے مطابق دونوں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے مگر دونوں کی حالت مختلف ہو گی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿يَوۡمَ نَحۡشُرُ ٱلۡمُتَّقِينَ إِلَى ٱلرَّحۡمَٰنِ وَفۡدا وَنَسُوقُ ٱلۡمُجۡرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرۡدا﴾2

(اس دن جب ہم اکٹھا کریں گے پرہیز گاروں کو رحمٰن کے حضور میں معزز و مکرم مہمان بنا کر اس روز ہانک کر لائیں گے مجرموں کو جہنم کی طرف)

قیامت کے دن کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے معزز مہمان ہوں گے اور عزت پائیں اور کچھ مجرم اور ندامت سے سزا پائیں گے تفسیر ابن عباس میں ہے "ركباناً على النوق"[3](سوار ہو کر اونٹنیوں پر) قیامت کے دن متقی لوگوں معزز مہمانوں کی طرح آئیں گے اور ان کے لیے سواریاں ہوں گی۔ علامہ ابن جریر سیدنا علی المرتضیٰ سے نقل کرتے ہیں:

" والله ما يحشر الوفد على أرجلهم، ولا يساقون سوقا، ولكنهم يؤتون بنوق لم ير الخلائق مثلها، عليها"[1]

1۔ابن عربي ، **تفسیرابن عربي** 391/2

2۔مريم ،85،86

3۔ابن عباس ، **تنوير المقياس** 259

(اللہ کی قسم نہ تو پیدل اور نہ ہی اپنی پنڈلیوں پر چل کر آئیں گے لیکن ایسی سواریوں پر سوار ہوں گے کہ مخلوق نے اس سے قبل ایسی سواریاں دیکھی نہیں ہوں گی)

جہاں متقین کو اتنی عزت مل رہی ہو گی وہیں مجرم کو پیاسے جانوروں کی طرح ہانکا جائے گا تفسیر ابن عباس میں ہے :

"وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ كما تساق البهائم إِلى جَهَنَّمَ وِرْداً أي عطاشا"[2] (ہم مجرموں کو ہانکیں گے جس طرح جانوروں کو جہنم کی جانب دھکیلا جاتا ہے یعنی پیاسا)

قیامت میں مجرموں کی حالت کو بیان کیا گیا ہے کس قدر ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رسوائی کا سلوک ہو گا اور اس دن سوائے پشیمانی اور پریشانی کے ان کو کچھ نہیں ملے گا اس دن وہ اپنے ماضی پر کف افسوس ملنے کے اور کچھ نہیں کر سکیں گے۔ پھر اس آیت مقدسہ کی تفسیر میں مومن کی عزت جو اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے دن عطا فرمائے گا اس کا ذکر ہے علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں حضرت ابو امامہ سے روایت ہے نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

"بشر المدلجين فِي الظُّلم بمنابر من نور يَوْم الْقِيَامَة يفزع النَّاس وَلَا يفزعونوَأخرج عَن أبي الدَّرْدَاء قَالَ: سَمِعت رَسُول الله صلى عَلَيْهِ وَسلم يَقُول: المتحابون فِي الله فِي ظلّ الله يَوْم لَا ظلّ إِلَّا ظله على مَنَابِر من نور يفزع النَّاس وَلَا يفزعون"[3]

(کہ مشقت اٹھانے ولوں کو اندھیروں میں نور کے ممبروں کی بشارت ہے قیامت کے دن سب سہمے ہوں مگر یہ خوف زدہ نہیں ہوں گے اور ابو درداء سے روایت ہے فرماتے ہیں میں نے نبی رحمت ﷺ سے سنا جو اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرتے ہیں ان کو اللہ تعالی اپنا سایہ عطا فرمائے گا جب کوئی سایہ نہیں ہو گا وہ نور کے ممبروں پر ہوں گے جب دوسرے لوگ گھبراہٹ میں ہوں گے مگر یہ نہیں گھبرائیں گے)

یہ شان تو سب مومنین کی ہو گی کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کی عزت افزائی فرمائے گا مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ منفرد شان عطا فرمائے گا اور ان کا مقام اور مرتبہ بہت بلند ہو گا اس کی وضاحت نبی رحمت ﷺ اس روایت سے ہوتا ہے حضرت ابو سعید خدری روایت فرماتے ہیں۔

((قَالَ رَسُول الله صلى عَلَيْهِ وَسلم: إِن للمهاجرين مَنَابِر من ذهب يَجْلِسُونَ عَلَيْهَا يَوْم الْقِيَامَة قد أمنُوا من الْفَزع))[4]

1۔ الطبری، **جامع البیان**، 254/18

2۔ الآلوسی، **روح المعانی** 451/8

3۔ السیوطی، **الدر المنثور** 142/4

4۔ الطبری، **جامع البیان** 442/18

(نبی رحمت ﷺ نے فرمایا مہاجرین کے لیے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سونے کے ممبر رکھے گا وہ اس پر بیٹھیں گے وہ ہر طرح کی گھبراہٹ سے مامون ہوں گے)

یہ ساری عزت اور مقام ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ ہو گا اور قیامت کے خوفناک دن میں بھی ایسے لوگوں کو کس قدر اہمیت دی جائے گی اور ان کی عزت افزائی ہو گی اس کا اندازہ اس سے ہو جاتا ہے۔

"وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ كما تساق البهائم إلى جَهَنَّمَ وِرْداً أي عطاشا"[1]

(ہم مجرموں کو ہانکیں گے جس طرح جانوروں کو جہنم کی جانب دھکیلا جاتا ہے یعنی پیاسا)

ابن عربی کے خیال میں بعث بعد الموت:

علامہ ابن عربی اس کیفیت و حالت کو عین الجمع کہتے ہیں:

"يوم يبعثكم فيه اى فيما جرحتم من صواب اعمالكم ومكاسبكم للجزاء ليقضى اجل عينه للبعث والاحياء ثم الى ربكم ترجعون فى عين الجمع المطلق فينبئكم باظهار اعمالكم وجزائكم"[2]

(پھر تمہیں اٹھایا جائے گا جو تم نے اعمال کمائے اور اس عمل کی جزا کے لیے تاکہ تمہیں تمہارے کسب کا بدلہ دیا جائے اور مقررہ میعاد سے مراد بعث اور احیاء کے لیے اس کی عین ہے پھر عین الجمع میں تمہیں اپنے رب کی جانب لوٹایا جائے گا اور تمہیں تمہارے اعمال کے اظہار اور جزا کی خبر دی جائے گی)

انسان کی حالت یہ ہو گی کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کا سب نامہ اعمال موجود ہو گا اور انسان میں انکار کی ہمت نہیں ہو گی اسے اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دی جائے گی۔ یہ عین الجمع کیا ہے؟ اس کی وضاحت میں امام ابو القاسم قشیری فرماتے ہیں:

"الاستهلاك بالكلية وفناء الإحساس بِمَا سِوَى اللَّه عَزَّ وَجَلَّ عِنْدَ غلبات الحقيقة"[3]

(یہ فنائے کلی اور غلبہ ہائے حقیقت کے موقع پر ماسوی اللہ کے احساس کے فنا ہونے کا نام ہے)

ان کے خیال میں یہ فنائیت دونوں صورتوں میں ہوتی ہے فرط محبت میں ہر غیر سے بے خبر ہو کر انسان یاد محبوب میں گم ہوتا ہے اور جب خوف ہوتا ہے تو بھی اس ذات کے علاوہ کی جانب انسان متوجہ نہیں ہوتا صرف اسی کا خیال ہوتا ہے۔ ابن عربی کہتے ہیں اس ذات سے محبت میں انسان مکمل اس کی جانب متوجہ ہوتا اور اسے توجہ بھی ملتی ہے یہ اس کے اعمال صالحہ کا اجر ہے اور اگر وہ ذات ان سے محبت نہیں بلکہ ان کے اعمال سیئہ پر انہیں سزا دیتی ہے تو یہی حقیقت میں سزا ہے جو

1۔ الآلوسی، **روح المعانی** 451/8

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 226/1

3۔ القشیری، عبدالکرین بن ہوازن، **الرسالہ القشیریہ**، **(دار المعارف القاہرہ 2009ء)** 168

اس کا غضب ہے جو انسان کو اس طرح مایوس کرے گا کہ وہ ہر غیر سے بے خبر ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے بھی مردود قرار پائے گا، ابن عربی کے نزدیک یہی سزا اور جزا ہے۔

(ان کو قیامت صغریٰ میں موت کی گھبراہٹ نہیں ہو گی اور نہ ہی قیامت کبریٰ میں اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی تجلی کی گھبراہٹ ہو گی)

ابن عربی وجود کے لرزنے اور موت کو قیامت صغریٰ سے تعبیر کرتے ہیں وہ وجود انسانی کو ایک کائنات قرار دیتے ہیں جب انسان کی جان نکلتی ہے یہ قیامت سے کم نہیں ہوتی اور عذاب قبر بھی قیامت سے کم نہیں ہے اور مسلسل عالم برزخ میں عذاب میں مبتلا رہنا اور اس ناکامی کا علم مرنے سے قبل ہی ہو جانا یہ بہت بڑی ہلاکت ہے جو کسی بھی اعتبار سے قیامت سے کم نہیں یہاں انسان کا سامنا فرشتوں سے ہوتا ہے۔

مگر قیامت کبریٰ میں اس کا سامنا خالق کائنات سے ہو گا جسے وہ قیامت کبریٰ قرار دیتے ہیں جس میں تجلی الٰہی سے محرومی ہو گی اور اللہ تعالیٰ کے جلال کا سامنا ہو گا قیامت صغریٰ میں فرشتوں کی سختی ہے اور کبریٰ میں دیدار سے محرومی اور مالک کی ناراضگی ہے جو اس ناکامی سے بہت بڑی ناکامی ہے۔

اس کی مزید وضاحت میں ابن عربی فرماتے ہیں کہ قیامت صغریٰ نفس کی جہت سے ہے یعنی عمل اور کردار کی ناکامی پر سزا ہے اور قیامت کبریٰ حق کی طرف سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور سزا کا فیصلہ ہے اس کی وضاحت قرآن مجید کی اس آیہ مقدسہ کی روشنی میں کی جاتی ہے:

﴿إِذَا قِيلَ لَهُمُ ٱتَّقُواْ مَا بَيۡنَ أَيۡدِيكُمۡ وَمَا خَلۡفَكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُونَ﴾[1]

(جب ان سے کہا جاتا ہے ڈرو (اس عذاب) سے جو تمہاتے سامنے ہے اور جو تمہارے پیچھے ہے تاکہ تم پر رحم کیا جائے)

اس کی وضاحت میں ابن عربی فرماتے ہیں:

"اتقو مابين ايديكم من احوال القيامة الكبرىٰ وماخلفكم من احوال القيامة الصغرىٰ فان اولىٰ تاتى من جهة الحق والثانيةتاتى من جهة النفس بالفناء فى الله فى الاولىٰ والتجرد عن ہيئات البدنيہ فى الثانيہ والنجاةمنہا بوقوع مقدماتہا"[2]

1۔ یٰس:45

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 167/2

(یعنی قیامت کبریٰ اور قیامت صغریٰ کے احوال سے ڈرو کیونکہ قیامت کبریٰ حق تعالیٰ کی جانب سے ہے اور صغریٰ نفس کی جہت سے اول میں فناءفی اللہ اور دوسری میں ہیئات بدنیہ سے تجرد اور اس سے نجات پانا ہے اور دونوں ہی درست ہیں)

تفسیر ابن عربی میں ہے کہ قیامت صغریٰ موت ہے لیکن قیامت کبریٰ یہ ہے کہ انسان کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیشی ہے یہ فناء فی اللہ سے عبارت ہے فناء فی اللہ اپنی ذات سے اپنی خواہشات کو ختم کرکے اللہ کے احکامات کے تابع ہو جانا اور انسان کا بغیر سوچے اچھائی کے راستہ پر گامزن ہونا ہے نیکی اس کی فطرت میں شامل ہو جاتی ہے تو قیامت کبریٰ انسان کے لیے باعث اطمنان ہو گی وگرنہ ایسی سزا ہو گی کہ انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

تفسیر ابن عربی کے مطابق جو لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے اعمال اور حال کو ٹھیک نہیں کرتے ان کے لیے سوائے مصائب کے کچھ نہیں۔ ان کا عذاب موت کے بعد سے ہی شروع ہو جاتا ہے:

" ای القیامۃالصغریٰ ووقوعہم فی العذاب الابدی بزوال الاستعداد وقلب الوجود الی اسفل وہی اشد وامر من عذاب القتل والہزیمۃ ان ا لمجرمین الذین اجرمو ا بکسب الہیات المظلمۃالردئیۃ الجسمانیۃ وہی ضلال عن طریق الحق "[1]

(ان سے قیامت صغریٰ کا وعدہ ہے اور وہ زوال استعداد اور قلب کے منہ نیچے ہونے کی وجہ سے ابدی عذاب میں واقع ہوں گے یہ ان کے لیے قتل اور شکست سے شدید تر عذاب ہے بے شک وہ مجرمین جنہوں نے ہیئات مظلمہ ردیہ اور روئیہ جسمانیہ کے اکتساب کا جرم کیا وہ حق کے راستہ سے گمراہ ہو گئے)

ابن عربی اعمال کی کمی اور گناہوں کی کثرت کو موت میں سختی اور عذاب کے سبب سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں دائمی اور بڑا عذاب تو ہو گا جب انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جائے گا۔ قیامت کبریٰ کی سختی اور شدت کا تصور کرنا بھی مشکل ہے ۔ موت کو جھٹلانا اس دنیا میں اس قدر انہماک کی وجہ سے ہے کہ اس کی لذت میں آخرت کو بھلا بیٹھا۔ برے اعمال کے تسلسل اور آخرت سے بے خبری اس قدر خطرناک ہیں کہ یہ مجرموں کو پیس کر رکھ دیں گی۔

"وکلتاالقیامتین تفرع الناس تہلکہم وتفنیہم وتستاصلہم بالشدۃ والقہر "[2]

(یہ دونوں قیامتیں صغریٰ اور کبریٰ لوگوں کو پیس ڈالیں گی انہیں ہلاک اور فنا کر دیں گی اور لوگ سختی اور قہر کا شکار ہو جائیں گے)

مگر ابن عربی کی توجیہ یہاں بھی جمہور مفسرین سے مختلف ہے وہ کہتے ہیں کہ متقی لوگوں کے اپنے مقامات ہیں:

1۔۔ ابن عربی، تفسیر ابن عربی 282/1

2۔ ایضاً 344/2

"فان المتقی عن المعاصی والرزائل وصفات النفس الذی ہو فی اول درجۃ التقویٰ قد یحشر الیٰ الرحمٰن فی جنۃ الافعال ثم الصفات ثم بعد وصول الی اللہ فی جنۃ الصفات لہ سیر فی اللہ بحسب تجلیات الصفات واذا انتہی السیر الیٰ الذات یکون السیرسیر اللہ"[1]

(پس جو شخص معاصی رزائل اور صفات نفس سے بچتا ہے وہ تقویٰ کے پہلے درجہ پر ہوتا ہے اسے جنات افعال میں رحمٰن کی جانب لے جایا جائے گا پھر صفات کی طرف پھر وصول الی اللہ کے بعد جنت صفات میں لے جایا جائے گا اس کے حسب تجلیات سیر فی اللہ ہے اور جب سیر ذات کی طرف منتہی ہوتی ہے سیر سیر الی اللہ ہو جائے گی)

ابن عربی کہتے ہیں انسان گناہوں سے بچے تو اسے متقی کہتے ہیں اس کے اعمال اللہ تعالیٰ بدل دیتا ہے اور اس سے افعال خیر کا صدور ہوتا ہے یہ افعال کی جنت اس کی اپنی ذات میں ہوتی ہے پھر افعال سے نکل کر اس جنت صفات کی جانب عروج کرتا ہے تو اس کی اپنی صفات بھی بدل جاتی ہیں اب وہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات میں آجاتا ہے اب اس کی سیر سیر الیٰ اللہ ہو جاتی ہے۔

جہاں تک مجرموں کی جسمانی اور حقیقی سزا کا تعلق ہے، ابن عربی کہتے ہیں:

"نسوق المجرمین لاعمالہم الخبیثہ الیٰ الجہنم الطبیعہ "[2]

(اعمال خبیثہ کی وجہ سے طبیعت کے جہنم کی جانب دھکیلے جائیں گے۔)

میزان کا قائم ہونا:

آخرت کے مراحل میں سے ایک مرحلہ میزان کا ہے جس میں سب کے اعمال کا وزن کیا جائے گا اور اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی بیان کیا ہے:

﴿وَٱلۡوَزۡنُ يَوۡمَئِذٍ ٱلۡحَقُّۚ فَمَن ثَقُلَتۡ مَوَٰزِينُهُۥ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُفۡلِحُونَ﴾[3]

(اور اعمال کا تولنا اس دن برحق ہے پس جن کے اعمال بھاری ہوئے ترازو میں پس وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں)

علامہ طبری نقل کرتے ہیں عبداللہ بن عمر سے روایت ہے:

قال: يُؤْتى بالرجل يوم القيامة إلى الميزان، فيوضع في الكِفّة، فيخرج له تسعة وتسعون سِجِلا فيها خطاياه وذنوبه. قال: ثم يخرج له كتاب مثل الأنْمُلة، فيها شهادة أن لا إله إلا الله، وأن محمدًا عبده ورسوله ﷺ. قال: فتوضع في الكِفّة، فترجح بخطاياه وذنوبه"[1]

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 13/2

2۔ ایضاً 13/2

3۔ الاعراف: 8

(ایک آدمی کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور اسے میزان کے پلڑے میں رکھا جائے گا پس اس کے نناوے رجسٹر گناہوں کے لائے جائیں گے پھر اس کی ایک کتاب جو چیونٹی کے برابر ہو گی لائی جائے گی اس میں کلمہ شہادت ہو گا اسے دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا جو سب گناہوں اور خطاؤں پر غالب آجائے گی)

نبی رحمت ﷺ کی احادیث اور اقوال صحابہ میں اس کی بہت سی امثلہ موجود ہیں علامہ طبری نقل کرتے ہیں:

"عن حذيفة قال: صاحب الموازين يوم القيامة جبريل عليه السلام، قال: يا جبريل، زِن بينهم! فردَّ من بعضٍ على بعض. قال: وليس ثم(ذخيره) ذهبٌ ولا فضة. قال: فإن كان للظالم حسنات، أخذ من حسناته فترد على المظلوم، (1) وإن لم يكن له حسنات حُمِل عليه "[2]

(حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ وزن کرنے والے قیامت کے دن جبرائیل علیہ السلام ہوں گے کہا اے جبرائیل ان میں وزن کرو پس وہ بعض میں بعض کا انکار کریں گے ان کا جمع شدہ مال سونا چاندی نہ ہو گا اگر تو ظالم کے پاس نیکیاں ہوئیں تو اس سے لے لی جائیں گی اور مظلوم کو دے دی جائیں گی اگر نیکیاں نہ ہوئیں تو اس پر گناہ ڈال دیئے جائیں گے)

اس سے مراد یہ ہے کہ جیسے جیسے نیکیوں کا وزن ہو گا ساتھ ہی ساتھ حساب بھی پورا کر دیا جائے گا سب مظلوم ظالم سے حساب لینے کے لیے موقع پر موجود ہوں گے اور اپنے اوپر کیئے جانے والے مظالم کا بدلہ پا رہے ہوں گے اس کو یوم حساب اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ ہر کسی کو اس کے اعمال کی جزا اور سزا پوری پوری دی جائے گی۔

ابن عربی یہاں بھی اس کی توجیہ مختلف پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

"الوزن وہو الاعتبار ، ای: اعتبار الاعمال حین قامت القیامۃ الصغریٰ ہو الحق ای العدل او الثابت او الوزن العدل"[3]

(اس دن وزن کا اعتبار ہو گا اعمال کے اعتبار سے جب قیامت صغریٰ ہو گی حق ہے یعنی عدل ثابت ہے یا عدل سے وزن)

میزان کی وضاحت میں ابن عربی کہتے ہیں قیامت کے دن نہیں ہو گا بلکہ ان کے نزدیک جو قیامت صغریٰ یعنی موت ہے وہی یوم عدل و حساب ہے اسی دن سب اعمال کا فیصلہ کر دیا جائے گا جبکہ دوسری جانب میزان کا قرآن و حدیث میں تفصیلاً ذکر موجود ہے اور مفسرین نے اس پر تفصیلی وضاحتیں کی ہیں تو یہ بھی ابن عربی کی اپنی توجیہ ہے جو قرائن اور اصول کے

1۔ الطبری۔ **جامع البیان** 313/12

2۔ ایضاً، 12/ 310

3۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 253/1

مطابق نہیں میزان میں اعمال تولا جانا یہ حق ہے اور جہاں تک ان آیات کے سیاق وسباق کی بات ہے سیاق کلام میں تسلسل اسی امر کا ہے کہ قیامت کے دن کا میزان برحق ہے اور سورہ القارعہ بھی اس کی موئید ہے:

﴿فَأَمَّا مَن ثَقُلَتۡ مَوَٰزِينُهُۥ فَهُوَ فِي عِيشَةٖ رَّاضِيَةٖ ٧ وَأَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَٰزِينُهُۥ فَأُمُّهُۥ هَاوِيَةٞ﴾[1]

پھر جس کی (نیکیوں کے) پلڑے بھاری ہوں گے تو وہ دل پسند عیش (و مسرت) میں ہوگ اور جس کی (نیکیوں کے) پلڑے ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھاکان اہاویہ ہو گا۔

اعضاء کی گواہی:

اس دن انسان کو اپنے اعمال پر انکار کی طاقت نہیں ہو گی اللہ تعالیٰ انسان کے اعمال پر ایسی ایسی گواہیاں قائم کرے گا کہ انسان کے پاس انکار کی کوئی صورت نہیں ہو گی اسکے اعضاء اس کے خلاف گواہی دیں گے انسان کے اعمال دو فرشتے جن کو کراماً کاتبین کہا جاتا ہے یہ تحریر کرتے ہیں مگر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کے اعضاء بھی اس پر گواہی دیں گے۔

﴿حَتَّىٰٓ إِذَا مَا جَآءُوهَا شَهِدَ عَلَيۡهِمۡ سَمۡعُهُمۡ وَأَبۡصَٰرُهُمۡ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ﴾ [2]

(یہاں تک کہ جب وہ دوزخ کے قریب آئیں گے (تو حساب شروع ہو جائے گا اس وقت) گواہی دیں گے ان کے خلاف ان کے کان ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں اس بارے میں جو وہ کرتے تھے)

اس آیہ مقدسہ کی تفسیر میں علامہ سیوطی فرماتے ہیں جب لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھگڑا کریں گے تو ان کی زبانوں پر مہر لگ جائے گی اور انکے اعضاء کلام کریں گے۔

"فيجحد الجاحد بشركه بِاللَّه تَعَالَى فَيحلفُونَ لَهُ كَمَا يحلفُونَ لكم فيبعث الله عَلَيْهِم حِين يجحدون شُهُودًا من أنفسهم جُلُودهمْ وأبصارهم وأيديهم وأرجلهم وَيخْتم على أَفْوَاههم ثمَّ تفتح الأفواه فتخاصم الْجَوَارِح فَتَقول أنطقنا الله الَّذِي أنطق كل شَيْء وَهُوَ خَلقكُم أول مرّة وَإِلَيْهِ ترجعون فتقر الْأَلْسِنَة بعد"[3]

(انکار کرنے والا انکار کرے گا کہ اس نے شرک نہیں کیا وہاں بھی ایسے ہی قسمیں کھائے گا جیسے یہاں کھاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ ان پر گواہی لائے گا ان کی آنکھوں سے ان کی کھالوں سے اور ان کے ہاتھوں اور پاؤں سے اور ان کے منہ پر مہر کر دی جائے گی پھر ان کے منہ کھلیں گے اور اپنے اعضاء سے جھگڑا کریں گے تو وہ کہیں گے ہم نے بیان کر دی

1۔ القارعة: 6۔7۔8

2۔ فصلت:20

3۔السیوطی، **الدرالمنثور** 31/7

ہر چیز اس ذات کے سامنے جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا اسی کی جانب لوٹ کر جانا ہے اس کے بعد زبانیں کلام کریں گی
(

اللہ تعالیٰ نے اس میں وضاحت فرمائی ہے کہ انسان کو قیامت کے دن ایک عظیم اور قدیر ذات کے سامنے پیش کیا جائے گا تو ان کو سارا کچھ سچ سچ بتانا ہو گا اگر اس میں غلط بیانی کو کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اس کے اعضاء کو حکم ہو گا وہ حق پر گواہی دیں گے اور انسان کچھ کر نہیں سکے گا۔

مگر ابن عربی اس گواہی کو بھی بہت ہی منفرد انداز میں لیتے ہوئے کہتے ہیں:

"ای غیرت صور اعضائہم وصورت اشکالہا علی ہیئۃ الاعمال التی ارتکبوہا وبدلت جلودہم وابشارہم فتنطق بلسا ن الحال وتدل علی ما کانوا یعملون"[1]

(یعنی بدل دی جائیں گی ان کے اعضاء کی صورتیں جیسے ان کے اعمال تھے اور ان کی کھالیں بھی اور بشری صورتیں بھی بدل جائیں گی اور وہ زبان حال سے گفتگو کریں گے یہ ان کے اعمال پر دلالت ہو گی)

ابن عربی کی یہ توجیہ بھی تفسیری اصولوں کے مطابق نہیں ہے اعضاء کا بدلنا اور دوسری شکل میں چلے جانا تفسیر کے کسی اصول کے مطابق نہیں ان کی اپنی رائے ہے جو قرین قیاس نہیں ہے اور اعضاء کا کلام کرنا اور زبان پر مہر کا لگ جانا یہ آحادیث اور اقوال صحابہ سے ثابت ہے اور آیات کا سیاق وسباق بھی اس کی تائید کرتا ہے اور اس کی تائید سورہ یٰسین کی اس آیت:

﴿ٱلۡيَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلَىٰٓ أَفۡوَٰهِهِمۡ وَتُكَلِّمُنَآ أَيۡدِيهِمۡ وَتَشۡهَدُ أَرۡجُلُهُم بِمَا كَانُواْ يَكۡسِبُونَ﴾[2]

(آج ہم ان کے منہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ اور پاؤں گواہی دیں گے جو وہ کماتے تھے۔

عقیدہ صراط اور ابن عربی:

پل صراط سے گزرنا بھی احوال قیامت میں سے ایک مرحلہ ہے۔ مفسرین اس کا کا ذکر قرآن مجید کی ذیل کی آیت کے سلسلہ میں کیا ہے:

﴿ وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا وَّنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا﴾[3]

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 209/2

2۔ یسین: 65

3۔ مریم 71۔72

(تم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر سے ہو گا یہ آپ کے رب پر لازم ہے اور اس کا فیصلہ ہو چکا ہے پھر ہم نجات دیں گے پرہیز گاروں کو اور رہنے دیں گے ظالموں کو دوزخ میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں)

اس کی وضاحت میں علامہ سمرقندی فرماتے ہیں اس سے مراد پل صراط ہے:

" داخلها، المؤمن والكافر يدخلون على الصراط، وهو ممدود على متن جهنم، ويقال: وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وارِدُها "[1]

(مومن اور کافر دونوں پل صراط پر داخل ہوں گے جو جہنم کے اوپر بچھائی جائے گی اور کہا گیا ہے تم میں سے ہر کوئی اس پر آئے گا)

جنت میں داخلہ کے لیے اس کو عبور کرنا ضروری ہے اس کی وضاحت میں علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

إن الوصول إلى الجنة بالعبور على الصراط وهو منصوب على متن جهنم كما نطقت به الأخبار فالوصول إلى جهنم أولا وإلى الجنة آخرا بواسطة العبور[2]

(جنت میں داخلہ اس پل صراط کو عبور کرنے کے بعد ہو گا جو جہنم کے اوپر نصب ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے پہلے جہنم میں پہنچیں گے پھر جنت میں اس پل کو عبور کرنے کے بعد جنت میں)

ينطق بحقية الصراط وهو جسر ممدود على متن جهنم أدق من الشعر واحد من السيف يعبره اهل الجنة وتزل به أقدام اهل النار[3]

(صراط کی حقیقت بیان کی جاتی ہے یہ ایک حد ہے جو جہنم کے اوپر بچھائی گئی ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے جس کو اہل جنت عبور کریں گے اور اہل جہنم کے قدم اس سے پھسل جائیں گے)

پل صراط کی وضاحت میں بہت سی آحادیث اور مفسرین کے اقوال ہیں جو قیامت کے احوال میں سے ایک حال ہے جنت میں منتقل ہونے کے لیے سب کو اس سے گزرنا ہو گا مومن بجلی کوندنے کی تیزی سے گزر جائے گا اور منافق کافر کٹ کے جہنم میں گر جائے گا۔

ابن عربی کہتے ہیں اس سے مراد وہ پل صراط نہیں جو جہنم کے اوپر رکھی جائے گی بلکہ کہتے ہیں۔

"لا بد لكل احد عند البعث والنشور ان يرد عالم الطبيعة لكونها مجاز عالم القدس "[4]

1۔ السمرقندی ۔ **بحر العلوم** 383/2

2۔ الآلوسی، **روح المعانی** 100/10

3۔ الحقی، **روح البیان** 454/7

4۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 11/2

(ہر ایک کے لیے لازم ہے کہ بعث اور نشور کے وقت عالم طبعیت کی طرف وارد ہو اس لیے کہ یہ عالم طبعیت عالم قدس کا مجاز ہے)

اس وضاحت میں بھی ابن عربی پل صراط کو عالم ناسوت اور اس جہان کی جانب منسوب کرتے ہیں جبکہ عالم حشر میں صراط کا معاملہ قیامت کا حصہ ہے مگر ابن عربی اسے بھی اس طبعی عالم سے جوڑتے ہیں جو تفسیر کے صریح اصولوں کے خلاف ہے جہاں تک آیات کے سیاق وسباق کی بات ہے تو صراط یہ قیامت کے دن کا ہی معاملہ ہے سورہ مریم کی ان آیات سے قبل انسان کی قیامت کے دن کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور پھر صراط کا ذکر ہے جو اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس سے مراد پل صراط ہی ہے اور ابن عربی کا فلسفہ ان کی اپنی فکر ہے جو کسی بھی اصول تفسیر کے اصول کے مطابق نہیں ہے۔

عقیدہ شفاعت اور ابن عربی:

قیامت میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو اذن شفاعت عطا فرمائے گا اور نبی رحمت ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ میری شفاعت میری امت کے حق میں قبول فرمائے گا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ عَسَىٰٓ أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا﴾[1]

(آپ کے لیے تہجد کی نماز نفل ہے عنقریب آپ کا رب آپ کو مقام محمود عطا فرمائے گا)

قرآن مجید کی اس آیہ مقدسہ میں تہجد کا حکم بھی ہے اور مقام محمود کا عطا کیا جانا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تہجد کی نماز کے بدلہ میں مقام محمود عطا فرمایا اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عاجزی اور انکساری کے بدلہ میں مجھے یہ مقام عطا فرمایا نبی رحمت ﷺ فرماتے ہیں حضرت ابو قتادہ سے روایت ہے:

"وقد ذُكر لنا أن نبيّ الله ﷺ خير بين أن يكون نبيّا عبدا، أو ملكا نبيّا، فأومأ إليه جبرائيل عليه السلام: أن تَوَاضَعْ، فاختار نبيّ الله أن يكون عبدا نبيّا، فأُعْطِي به نبيّ الله ثنتين: إنه أوّل من تنشقّ عنه الأرض، وأوّل شافع"[2]

(نبی رحمت ﷺ فرماتے ہیں مجھے اختیار دیا گیا کہ میں نبی اور عبد بنوں یا نبی اور بادشاہ بنوں تو جبرائیل علیہ السلام نے مجھے اشارہ کیا کہ عاجزی اختیار کروں تو میں نے نبی اور عبدیت کو اختیار کیا تو اللہ نے مجھے اس پر نبوت کے ساتھ دو مزید چیزیں عطا فرمائیں کہ سب سے پہلے میرے لیے زمین کھلے گی اور سب سے پہلے میں شفاعت کرنے والا ہوں گا)

1۔ الاسرا: 79

2۔ الطبری، **جامع البیان** 258/17

اس آیت میں اور اس حدیث میں جہاں نبی رحمت ﷺ کی عظمت میں مقام شفاعت کو بیان کیا گیا ہے وہیں دو اعمال کی عظمت اور مقام بھی واضح کیا گیا ہے جن میں ایک کا حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے دیا گیا ہے وہ تہجد ہے اور دوسرا جس میں نبی رحمت ﷺ کو اختیار دیا گیا ہے وہ عاجزی ہے فرمایا کہ جب میں نے بادشاہی پر بندگی کو ترجیح دی تو اللہ تعالیٰ کو عاجزی پسند آئی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے مقام شفاعت بھی دے دیا اور میرے لیے سب سے پہلے زمین سے نکلنے کا حق بھی دے دیا حقیقت میں اس میں امت کے لیے تعلیم ہے کہ عاجزی اور تہجد میں اللہ تعالیٰ نے کس قدر برکت اور فضیلت رکھی ہے۔

یہ مقام محمود کیا ہے اس کی مفسرین وضاحت فرماتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں نبی رحمت ﷺ کھڑے ہو کر امت کے لیے دعا کریں گے اور ان کی بخشش کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے سفارش کریں گے:

" اختلف أهل التأويل في معنى ذلك المقام المحمود، فقال أكثر أهل العلم: ذلك هو المقام الذي هو يقومه ﷺ يوم القيامة للشفاعة للناس ليريحهم ربهم من عظيم ما هم فيه من شدّة ذلك اليوم"

(اہل تاویل نے مقام محمود کے معنیٰ میں اختلاف کیا ہے اکثر اہل علم کے نزدیک یہ وہ مقام ہے جہاں نبی رحمت ﷺ قیامت کے دن کھڑے ہو کر لوگوں کی سفارش کریں گے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو اس عظیم سختی کے دن راحت عطا فرمائے)

تو مقام محمود ہی مقام شفاعت ہے اس مصائب بھرے قیامت کے دن میں جب کوئی پرسان حال نہ ہو گا اور اس دن کی سختی بچوں کو بوڑھا کر دے گی اس دن امت کو اپنے نبی ﷺ کی شفاعت ملے گی اور نبی رحمت ﷺ کی حقیقی عظمت اور امت سے محبت آشکار ہو گی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مقام شفاعت پر ہماری نبی ﷺ کو ایک خاص مقام عطا فرمائے گا اور عزت کا حلہ اور لباس عطا فرمائے گا حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((أن رسول الله ﷺ قال: " يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَكُونُ أَنَا وَأُمَّتِي عَلَى تَلّ، فَيَكْسُونِي رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ حُلَّةً خَضْرَاءَ، ثُمَّ يُؤْذَنُ لِي فَأَقُولُ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ أَقُولَ، فَذَاكَ الْمَقَامُ الْمَحْمُودُ))[1]

(حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں نبی رحمت ﷺ نے فرمایا لوگوں کو قیامت کے دن جمع کیا جائے گا تو میں اور میری امت بلند مقام پر کھڑے ہوں گے تو میرا رب مجھے سبز حلہ پہنائے گا پھر مجھے حکم ہو گا محبوب جو چاہیں کہیں یہ مقام محمود ہو گا۔)

قیامت میں اللہ سب انسانوں میں سب سے زیادہ جس ذات کو عزت اور عظمت عطا فرمائے گا وہ ہمارے نبی ﷺ ہیں قیامت میں سب خوف زدہ ہوں گے مگر آپ کو اللہ تعالیٰ اس قدر عظمتیں اور رفعتیں عطا فرمائے گا کہ عظمت بھی دنگ رہ

1۔ الطبری، **جامع البیان** 529/17

جائے گی اور صرف یہی نہیں جب سب انسانیت قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو گی تو اللہ سب سے پہلے جس ذات کا نام لے کر ان کو پکاریں گے وہ ہمارے نبی ﷺ ہوں گے:

" عن حُذيفة، قال: يُجْمع الناس في صعيد واحد. فلا تكَلَّم نفس، فأوّل ما يدعو مُحَمَّد النبيّ صلى الله عليه وسلم، فيقوم مُحَمَّد النبيّ ﷺ، فيقول: لبيك[1]

(حضرت حذیفہ بن یمان فرماتے ہیں سب لوگ زمین کے ایک ٹکڑے پر جمع ہوں گے کوئی کلام نہیں کرے گا سب سے پہلے جن کو پکارا جائے گا وہ ہمارے نبی ﷺ ہوں گے تو آپ ﷺ کھڑے ہوں گے اور لبیک کہیں گے)

میدان محشر میں اللہ تعالیٰ سب سے پہلے ہمارے نبی ﷺ سے گفتگو فرمائے گا اور نہ کسی کو بولنے کی ہمت ہو گی اور نہ ہی کسی کو اجازت ہو گی اور نہ ہی کسی کو خطاب کیا جائے گا۔ پھر نبی رحمت ﷺ اپنی امت کے لیے اللہ تعالیٰ سے شفاعت مانگیں گے حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں میں نے نبی رحمت ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ عنقریب مجھے مقام شفاعت عطا فرمائے گا اور میں اپنی امت کو جہنم سے نکال لوں گا:

"يُخْرِجُ الله أقْوَاماً مِنَ النَّارِ مِنْ أهْلِ الإيمانِ بِشَفَاعَةِ مُحَمَّدٍ صلّى الله عليه وسلّم، فذلك المَقَامُ المَحْمُودُ، فَيُؤْتَى بِهِمْ نَهَراً يُقَالُ لَهُ الحَيَوَانُ، فَيُلْقَوْنَ فِيهِ، فَيُنْبَتُونَ كَمَا ينبتُ التَّقَاريرُ. ثم يُخْرَجُونَ فَيُدْخَلُونَ الجَنَّةَ، فَيُسَمَّوْنَ فيها الجهنّميّون، ثم يطلبونَ إلى الله تعالى أَنْ يُذْهِبَ عَنْهُمْ هذا الاسم، فيذهب به عَنْهُمْ"[2]

(اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو جہنم سے نبی ﷺ کی شفاعت سے نکال لے گا پس یہ مقام محمود ہو گا پس ان کو ایک نہر میں داخل کیا جائے گا جس کو حیوان کہتے ہیں پس وہ اس میں اگ پڑیں گے جیسے نباتات اگتی ہیں پھر وہ اس نہر سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہو جائیں گے اور جنت میں ان کو جہنمی کا نام ملے گا پھر وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے یہ نام ختم فرمادے گا)

وہ لوگ جو اپنے عمل سے جہنم میں چلے جائیں گے نبی رحمت ﷺ کی شفاعت سے جہنم سے نکلیں گے مگر جہنم میں مسلسل جلنے کی وجہ سے ان کی حالت غیر ہو گی جل کر کوئلہ ہو چکے ہوں گے ان کو اللہ تعالیٰ نہر حیوان میں داخل کرے گا جہاں وہ ایسے اگیں جیسے زرخیز زمین کے کنارے پر بیج پھر اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل فرمائے گا مگر جہنم میں رہنے کی وجہ سے ان کا نام جہنمی پڑ جائے گا تو وہ اس شناخت کی وجہ سے شرمندہ ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے یا اللہ ہم سے یہ شناخت ختم فرما پھر اللہ تعالیٰ ان سے یہ شناخت بھی ختم فرمادے گا۔

1۔ الطبری، **جامع البیان** 527/17

2۔ السمرقندی، **بحر العلوم** 325/2

"فی مقام یجب علی الکل حمده وہو مقام ختم الولایۃ بظہور المہدی فان خاتم النبوۃ فی مقام محمود من وجہ ہو جہۃ کونہ خاتم الولایۃ فہو من ہذالوجہ فی مقام الحامدیۃ فاذا تم خاتم الولایۃ یکون فی مقام محمود من کل وجہ "[1]

(اس مقام پر سب پر لازم ہے کہ اس کی تعریف کریں یہ مقام ختم ولایت کا ہے اور ولایت کا اختتام امام مہدی پر ہو گا پس بے شک خاتم نبوۃ مقام محمود پر فائز ہونے کی وجہ سے ہے اور دوسری وجہ آپ کی خاتم ولایت ہونے کی وجہ سے تو اس وجہ سے آپ مقام حامدیت پر ہیں پھر جب ولایت تمام ہو گی آپ ہر وجہ سے مقام محمود پر فائز ہوں گے)

یہاں ابن عربی ایک فلسفہ بیان کرتے ہیں کہ مقام حامدیت یہ مقام ولایت ہے مقام ولایت کی انتہا مقام حامدیت ہے اور ہر زمانہ میں لوگ اس مقام پر فائز رہیں گے مگر اس کی انتہا امام مہدی پر ہو گی اور اسی طرح مقام نبوت کی انتہا مقام محمود پر ہے تو نبی ﷺ آپ مقام حامدیت پر بھی فائز ہیں مگر جب آخری ولی امام مہدی آئیں گے تو یہ مقام اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا اب ایک ہی مقام رہے گا جو مقام محمود ہے تو آپ اس پر فائز ہوں گے۔

تفسیر بالماثور میں مقام محمود مقام شفاعت ہے جہاں نبی رحمت ﷺ امت کی شفاعت کریں گے مگر ابن عربی اس کو مقام ختم نبوت قرار دیتے ہیں لیکن اس مقام پر نبی رحمت ﷺ کے مقام شفاعت کا کوئی ذکر نہیں کرتے ہیں اور ابن عربی کا فلسفہ سیاق آیات کی روشنی میں بالکل بھی صائب نہیں ہے اور تفسیر بالماثور اور جمہور مفسرین کی روشنی میں اس سے مراد مقام شفاعت ہی ہے۔

موت کو ذبح کیا جانا:

اس کائنات کا اختتام قیامت پر ہو گا انسان کو اس کے اعمال کا پورا پورا اجر دیا جائے گا۔اس دن جہاں مومنین کو ان اپنی منشاء اور اللہ تعالیٰ کی رضا ملے گی وہیں مشرکین اور نافرمانوں کو بہت بڑی ناکامی اور شکستگی کا سامنا ہو گا اور اس دن جہاں مومنین کی خوشی دیدنی ہو گی وہیں مشرکین اور نافرمان کی حالت غیر ہو گی کہ اس سے بڑھ کر پریشانی کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کافر جہنم میں موت کی خواہش کریں گے اور اس امید پر جہنم کے ایام کاٹیں گے کہ انہیں جلد یا بدیر موت آجائے گی مگر ان کی امیدوں پر پانی اس وقت پھر جائے گا جب موت کو بھی جنت اور جہنم کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا ابن جریج نے کہا:

.": قال ابن جریج، قوله (لا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الأَكْبَرُ) قال: حین یطبق جهنم، وقال: حین ذبح الموت"[2]

(ابن جریج نے کہا اس دن کی پریشانی ان کو مغموم نہیں کرے گی جب جہنم کا فیصلہ ہو گا اور موت کو ذبح کیا جائے گا)

1۔ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 408/1

2۔الطبری، **جامع البیان** 442/18

اس مقام پر جہاں مومنین کو خوشی ملے گی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم سے آزاد ہو گئے ہیں وہیں نافرمانوں کو غم بھی ہو گا کیونکہ ان کے لیے جہنم سے نکلنے کی ساری صورتیں ختم ہو جائیں گی اس آیہ مقدسہ میں جہاں مومنین کو خوشی ہے وہیں اس آیت کا مفہوم ایک غم کا بھی بتارہا ہے کہ یہ دن خوف اور غم کا دن ہے مگر مومن مامون ہوں گے اور کفار مصائب میں مبتلا ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جائیں گے اور ان کی اس حالت کی وضاحت علامہ سمرقندی فرماتے ہیں۔

"اذا ذبح الموت بين الجنة والنار، فيأمن أهل الجنة من الموت ويفزع أهل النار، فيفزعون حين أيسوا من الموت"[1]

(جب موت کو جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا اس وقت جنتی موت کی موت کی وجہ سے امن پا جائیں گے اور جہنمی اس وقت گھبرائیں گے جب موت سے مایوس ہو جائیں گے)

انسان شائد یہ خیال کرتا ہے کہ موت سب سے بڑی آزمائش ہے مگر جب جہنم کی گرمی اور عذاب سے اس کا موازنہ کیا جائے تو موت راحت محسوس ہو گی اسی وجہ سے جہنمیوں کو جہنم میں تکلیف تو ہو گی البتہ وہ امید لگا کے بیٹھے ہوں گے کہ شائد اب ان کا اختتام ہو جائے گا مگر ان کی حالت غیر تب ہو گی جب موت کو بھی موت آجائے گی اب سوائے مایوسی کے ان کو کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا اور مایوسی بھی فائدہ نہیں دے گی۔

اس کی وضاحت میں سب مفسرین نے تقریباً موت کے اختتام کا ذکر کیا ہے کہ موت کو جنتیوں اور دوزخیوں کے سامنے لا کر مقام اعراف پر ذبح کر دیا جائے گا اس دن جنتیوں کی خوشی دیدنی ہو گی اور جہنمیوں کی جزع وفزع اور واویلا اور شوراور غم اس قدر ہو گا کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا یہ اختتام قیامت ہو گا۔

یہاں ابن عربی یہ واضح کرتے ہیں کہ مومن کو اللہ تعالیٰ اطمنان کی دولت عطا فرمائے گا وہ موت ہو یا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیشی ہو جہاں ان کی موت اطمنان کی ہو گی وہیں فرشتے قیامت کے دن بھی ان کو کامیابی کی نوید سنائیں گے۔

"تتلقاہم الملٰئکۃ عند الموت بالبشارۃ اوعندالبعث النفسانی بالسلامۃ والنجاۃ "[2]

(موت کے وقت فرشتے ان کے ساتھ بشارت کے ساتھ ملاقات کریں گے یا بعث نفسانی کے وقت سلامتی اور نجات سے)

1۔ السمرقندی ، **بحرالعلوم** 443/2

2۔ ابن عربی ، **تفسیرابن عربی** 46/2

اس مقام پر ابن عربی نے تفسیر بالماثور کا سارا تبصرہ ہی بدل دیا ہے یہاں موت کی موت کے بجائے انسان کی اپنی موت کا ذکر کیا ہے کہ انسان کی موت سے ہی اس کو اچھے عمل کی وجہ سے خوشخبری مل جاتی ہے اور جب دوبارہ اٹھے گا تو فرشتے اسے سلامتی اور نجات کی خبر دیں گے یہی کامیابی ہے اور تفسیر بالماثور سے ابن عربی نے مختلف مفہوم مراد لیا ہے۔

مراحل قیامت میں تفسیر بالماثاور اور تفسیر ابن عربی میں بہت اختلاف ہے ابن عربی اصلاح اعمال، احوال اور تہذیب نفس کی بات کرتے ہوئے اسے ہی جسمانی جنت اور جہنم کا نام دیتے ہیں جب کہ تفسیر بالماثور میں ہر چیز کی ایک مادی اور حقیقی صورت بتاتے ہیں اور مراحل قیامت سے گزرنا لازم قرار دیتے ہیں اور قیامت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری پر تفسیر بالماثور اور ابن عربی میں اتفاق ہے۔

ابن عربی اس مقام پر موت کے وقت فرشتے کی سختی کا ذکر کیا ہے اور تفسیر بالماثور میں موت کو ذبح کرنے کا ذکر ہے مگر سیاق کلام نہ تفسیر ابن عربی کی تائید کرتا ہے نہ موت کے ذبح ہونے کا بلکہ اس آیت سے قبل اچھا عمل کرنے والوں کی تعریف ہے اور بعد میں آسمان کے لپیٹنے کا ذکر ہے جو صاف ظاہر قیامت کے دن کی جانب اشارہ ہے اس اعتبار سے سیاق کلام نہ تو ابن عربی کے مطابق ہے اور نہ ہی جمہور کے مطابق بلکہ سیاق کلام تو قیامت کے دن پر ہی دلالت کرتا ہے اس دن فرشتے ان کو پریشانی کی اس حالت میں خبر دیں گے کہ یہ ہے وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

فصل دوم:

جنت اور دوزخ سے متعلق تصورات

قرآن حکیم کے عطا کردہ فلسفہ حیات و ممات کے تحت، دنیا کی زندگی ایک قانون ابتلا کے ساتھ منسلک ہے جب کہ اخروی زندگی میں اعمال صالحہ کی جزا اور انعام کا ایک ابدی نظام قائم ہو گا۔ اس نظام کا بنیادی حصہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت جنت الفردوس ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حصول جنت کو اپنی رضا اور خوشنودی سے متصل قرار دیا گیا ہے اور انسانوں کو اس کے حصول کی جانب متوجہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُم مِّنَ ٱلۡجَنَّةِ غُرَفٗا تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَاۚ نِعۡمَ أَجۡرُ ٱلۡعَٰمِلِينَ﴾[1]

(وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے انہیں ہم ٹھہرائیں گے جنت کے بالا خانوں میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے اس میں کتنا عمدہ صلہ ہے نیک کام کرنے والوں کا)

انسانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ اس جنت کے حصول کے لیے اپنے آپ کو تقویٰ سے آراستہ کر لے:

﴿وَسَارِعُوٓاْ إِلَىٰ مَغۡفِرَةٖ مِّن رَّبِّكُمۡ وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلۡأَرۡضُ أُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِينَ﴾[2]

(اور دوڑو بخشش کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے ہے اور (دوڑو) جنت کی طرف جس کی چوڑائی زمین و آسمان کے برابر ہے جو تیار کی گئی ہے پرہیز گاروں کے لیے)

تو جنت اور دوزخ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہیں اسی کامیابی کی فکر انسان کو اس مادی زندگی کی بے ثباتی اور کمزوری کا احساس دلاتی ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جنت کی چوڑائی کو بیان فرمایا کہاس کی چوڑائی مین و آسمان کے برابر ہے اگر جنت کی چوڑائی کا یہ عالم ہے تو اس کی لمبائی اور طول کا کیا عالم ہو گا۔

اسی آیہ مقدسہ میں جنت کو پیدا کرنے کا مقصد بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ اسے متقین کے لیے بنایا گیا ہے۔

"أعدت للمتقين"، أي: دارًا لمن أطاعني وأطاع رسولي. "[3]

(یہ جنت متقین کے لیے ہے یعنی یہ ان لوگوں کا گھر ہے جنہوں نے میری اور میرے رسول ﷺ کی اطاعت کی)

1۔ العنکبوت:58

2۔ آل عمران:133

3۔ الطبری، **جامع البیان** 213/7

اس آیہ مقدسہ کی تفسیر میں متقی کی وضاحت بھی ہو گئی کہ تقویٰ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت میں ہے اور جنت اللہ تعالیٰ نے متقین کے لیے پیدا کی ہے اللہ تعالیٰ قیامت میں نہ صرف متقین کو جنت عطا فرمائے گا بلکہ ان کو عزت کے ساتھ جنت میں معزز مہمانوں کی طرح گروہ در گروہ منتقل بھی فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا۔

﴿وَسِيقَ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوْا۟ رَبَّهُمْ إِلَى ٱلْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَٰبُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَٱدْخُلُوهَا خَٰلِدِينَ﴾[1]

(اور لے جایا جائے گا انہیں جو ڈرتے رہے تھے اپنے رب سے (عمر بھر) جنت کی جانب گروہ در گروہ حتیٰ کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو جنت کے دروازے پہلے ہی کھول دیئے گئے ہوں گے تو کہیں گے ان سے جنت کے محافظ تم پر سلام ہو تم خوب رہے پس اندر تشریف لے چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے)

اس آیہ مقدسہ کی وضاحت میں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

((أول زمرة تدخل الجنة من أمتي على صورة القمر ليلة البدر ثم الذين يلونهم على أشد نجم في السماء إضاءة ثم هم بعد ذلك منازل))[2]

(میری امت کا سب سے پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہو گا ان کے چہرے چودہویں کے چاند کی طرح روشن ہوں گے پھر ان سے متصل جو لوگ داخل ہوں گے ان کے چہرے جو سب سے زیادہ روشن آسمان میں ستارے ہوں گے کی طرح ہوں گے پھر بعد میں درجہ بدرجہ ہوں گے)

﴿ وَسَارِعُوٓا۟ إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾[3]

(اور دوڑو بخشش کی طرف وہ تمہارے رب کی طرف سے ہے اور (دوڑو) جنت کی طرف جس کی چوڑائی زمین و آسمان کے برابر ہے جو تیار کی گئی ہے پرہیز گاروں کے لیے)۔

اس آیت کی وضاحت میں کثیر آیات اور احادیث موجود ہیں جبکہ ابن عربی کا تصور جنت اصلاح اور انسانی ذات کے گرد گھومتا ہے اور جنت کی تعبیر انسان کے اعمال کے مطابق کرتے ہیں اگر برائی کو خود میں ختم کرتا ہے تو جنت نفس اگر اپنی صفات کو بدلتا ہے تو جنت صفات اور اگر فنا فی اللہ کے مقام تک پہنچتا ہے تو جنت ذات ہے ابن عربی قرآن مجید کی اسی آیت مقدسہ کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

1۔ الزمر:73

2۔ الآلوسی، **روح المعانی** 287/12

3۔ آل عمران:133

" عن التوكل وجنت عالم الملک التی ہی تجلی الافعال برؤیۃ افعالکم ای: الیٰ مایوجب ستر افعالکم بافعالہ وجنۃ الافعال من ا لطا عات بعد کما ورد ((اعوذبعفوک من عقابک)) ولان المراد بالجنۃ ھنا جنۃ الافعال [1]"

توکل اور عالم ملک کی جنت سے آنا ہے جو تمہارے اعمال کی رؤیت کے ساتھ ہے یہی تجلی افعال الٰہی کے ساتھ تمہارے افعال کے پردے کا موجب ہے اور جنت افعال اطاعت سے دوری ہے جیسا کہ حدیث نبوی ﷺ میں ہے میں تیرے عفو کے ساتھ تیری سزا سے پناہ مانگتا ہوں کیونکہ جنت سے یہاں مراد جنت افعال ہے

انسان اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی بادشاہی اور ملکیت میں ہے یہ جہاں ہمیں نظر آتا ہے تو اس میں انسان کے افعال بھی نظر آنے والے ہیں ابن عربی کہتے ہیں اس میں انسان کے افعال اطاعت الٰہی کی صورت میں ہونے چاہئیں جس کے بدلہ میں انسان کو طبیعت کا اطمنان ملتا ہے اور نافرمانی کی صورت میں عذاب اسی کو نبی رحمت ﷺ نے فرمایا میں تیرے غضب سے عفو کی پناہ میں آتا ہوں۔

اس مقام پر تفسیر بالماثور میں جنت سے مراد ایک حقیقی جہاں ہے جو نعمتوں سے لبریز اور رضائے الٰہی کی حقیقی صورت ہے اور سب نعمتیں انسان کو حقیقی شکل میں ملیں گی مگر ابن عربی اسے اسی جہاں میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے منسوب کرتے ہیں اور اسے جنت افعال، ذات اور صفات کا نام دیتے ہیں جو بدل جاتی ہیں جنت کی حقیقی وضاحت میں قرآن مجید کی بہت سے آیات اور اتنی کثرت سے صحیح آحادیث موجو ہیں کہ اس کے لیے دلائل سے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

مفسرین نے اپنی تفاسیر میں جنت کی مختلف اقسام بیان کی ہیں علامہ سمرقندی فرماتے ہیں کہ جنت کے درج ذیل نام اور اقسام ہیں۔

"الجنان أربع: جنة عدن وهي الدرجة العليا، وجنة المأوى، وجنة الفردوس، وجنة النعيم. كل جنة منها كعرض السموات والأرض لو وصل بعضها إلى بعض"[2]

(جنتیں چار ہیں جنت عدن یہ بلند مقام ہے جنت الماویٰ جنت الفردوس اور اور جنت نعیم اور ہر جنت کا دوسری جنت سے فاصلہ زمین وآسمان کے برابر ہے اگر اس کے بعض سے بعض تک پہنچا جائے)

علامہ سمرقندی فرماتے ہیں کل جنتیں چار ہیں اور سب کی وسعت زمین وآسمان کے برابر ہے قرآن مجید میں کئی مقامات پر جنت کا اور جنت کی نعمتوں کا ذکر ہوا ہے اب ان کی بتدریج تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

1۔ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 145/2

2۔السمرقندی، **بحرالعلوم** 246/1

جنت الفردوس:

جنت الفردوس کا قرآن مجید میں کئی مقامات پر ذکر آیا ہے ایک مرتبہ سورہ کہف میں اور ایک مرتبہ سورہ مؤمنون میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ كَانَتۡ لَهُمۡ جَنَّٰتُ ٱلۡفِرۡدَوۡسِ نُزُلًا﴾[1]

یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل (بھی) کرتے رہے تو فردوس کے باغات ان کی رہائش گاہ ہوں گے)

جنت الفردوس کیا ہے۔ علامہ سمرقندی فرماتے ہیں:

"الفردوس ربوة خضراء من الجنة هي أعلاها وأحسنها"[2]

(فردوس سبز رنگ کا جنت میں ٹیلہ ہے اور انتہائی خوبصورت ہے)

تفسیر ابن عباس میں ہے:

" الفردوس هُوَ الْبُسْتَان بِلِسَان الرومية {هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ} فِي الْجَنَّة مقيمون لَا يموتون وَلَا يخرجُون مِنْهَا"[3]

(فردوس رومی زبان میں باغ کو کہتے ہیں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے نہ تو ان کو اس میں موت آئے گی اور نہ ہی اس سے نکالے جائیں گے)

اس کی وضاحت میں عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں یہ انسان کو اس کے اعمال کے بدلہ میں ملے گا:

"إِن الَّذين آمنُوا} بِمُحَمد صلى الله عَلَيْهِ وَسلم وَالْقُرْآن {وَعَمِلُواْ الصَّالِحَات} الطَّاعَات فِيمَا بَينهم وَبَين رَبهم {كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الفردوس} أَعْلَاهَا دَرَجَة {نزلا} منزلا"[4]

(بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے محمد ﷺ پر اور قرآن پر اور نیک عمل کیے فرمانبرداری کی جو اللہ اور ان کے درمیان تھا اس کی ان کے لیے جنت فردوس ہے جو سب سے بلند درجہ ہے جہاں یہ سب اتریں گے)

تو جنت الفردوس ان لوگوں کا مسکن ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں ان کو جنت الفردوس میں رہنا نصیب ہو گا۔ اسی آیہ مقدسہ کی وضاحت میں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل فرماتے ہیں نبی رحمت ﷺ نے فرمایا۔

1۔ الکھف:107

2۔ السمرقندی، **بحر العلوم** 365/2

3۔ ابن عباس، **تنویر المقیاس** 285

4۔ ایضاً 253

" إذا سألتم الله تعالى فاسألوه الفردوس فإنه وسط الجنة وأعلى الجنة وفوقه عرش الرحمن ومنها تفجر أنهار الجنة»وروي عن كعب أنه ليس في الجنة أعلى من جنة الفردوس وفيها الآمرون بالمعروف والناهون عن المنكر وصح أن أهل الفردوس ليسمعون أطيط العرش"[1]

(تم جب بھی اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو جنت الفردوس کا سوال کرو جو جنت کا وسط اور سب سے اعلیٰ جنت ہے اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عرش ہے اس سے جنت کی نہریں بہتی ہیں اور حضرت کعب سے روایت ہے کہ جنت الفردوس سے اعلیٰ کوئی جنت نہیں اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے رہیں گے اور یہ بھی حق ہے کہ وہ عرش کے چرچرانے کی آواز بھی سنیں گے)

اس روایت سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہ جنت سب سے بلند اور سب سے اعلیٰ اور اس میں مکینوں کی صفت بھی بیان کر دی گئی کہ وہ امر بالمعروف کرنے والے اور نہی عن المنکر کرنے والے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی فرمایا کہ یہ جنت کن کو ملے گی سورہ مومنون میں فرمایا:

﴿ٱلَّذِينَ يَرِثُونَ ٱلْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُون﴾[2]

(یہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے)

علامہ طبری اس آیہ مقدسہ کی تفسیر میں روایت لائے ہیں:

" قال مجاهد: غرسها الله بيده، فلما بلغت قال: (قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ) ثم أمر بها تغلق، فلا ينظر فيها خلق ولا ملك مقرب، ثم تفتح كل سحر، فينظر فيها فيقول: (قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ) ثم تغلق إلى مثلها"[3]

(مجاہد فرماتے ہیں اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے سجایا جب مکمل ہوئی تو فرمایا بے شک فلاح پا گئے مومنین پھر حکم دیا کہ اسے مقفل کر دو نہ تو اسکو کوئی مخلوق دیکھے اور نہ ہی کوئی مقرب فرشتہ پھر اسے ہر سحری کو کھولا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ کر فرماتا ہے قد افلح المومنون پھر اسے بند کر دیا جاتا ہے)

اس روایت سے بھی جنت الفردوس کی عظمت اور بلند مرتبت کا علم ہوتا ہے اور جن کو جنت الفردوس میں منتقل کیا جائے گا ان کو کبھی بھی نکالا نہیں جائے۔

جنت الفردوس سب سے بلند مقام ہے جو انسان کو ایمان اور عمل صالح کے نتیجہ میں ملے گا یہ اس لیے سب سے بلند ہے کہ یہ عرش کے سب جنتوں سے زیادہ قریب ہے اور اسی مقام کا نبی رحمت ﷺ نے مانگنے کا بھی حکم دیا اور جب یہ جنت کسی کو مل جائے گی تو پھر اسے اس سے نکالا نہیں جائے گا۔

1۔ الآلوسی، **روح المعانی** 370/8

2۔ المومنون: 11

3۔ الطبری، **جامع البیان** 13/19

جنت الفردوس کی اشاری تعبیر اور تجزیہ:

ابن عربی نے آیت مبارکہ:﴿ٱلَّذِينَ يَرِثُونَ ٱلۡفِرۡدَوۡسَ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ﴾[1] (یہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے) سے متعلق کہتے ہیں: "الذین یرثون الفردوس جنۃ الروح فی حظیرۃ القدس[2]" (یہی لوگ حظیرہ قدس میں جنت روح کے فردوس کی میراث کے وارث ہیں)

ان کے خیال میں حظیرہ قدس جنت کے ایسے مقام کو کہتے ہیں جو سب کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور جنت الفردوس کے بارے میں نبی رحمت ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا تو اس کو چھپا دیا اور اسے خاص لوگوں کے لیے ہی کھولا جائے گا جب لوگ اس میں داخل ہوں گے اور دوسری آیت:

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ كَانَتۡ لَهُمۡ جَنَّٰتُ ٱلۡفِرۡدَوۡسِ نُزُلٗا﴾[3]

(یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل (بھی) کرتے رہے تو فردوس کے باغات ان کی رہائش گاہ ہوں گے)

کے تحت ابن عربی لکھتے ہیں:

جناتہم جنات الفردوس یدلان ان المراد بہم بہم الموحدون الکاملون الاستعداد الذین لا کمال فوق کمالہم فلایبقی شیء وراء بہم مراتبہم یریدون التحول الیہ [4]

(ان کی جنتیں فردوس کی جنتیں ہیں جو ان کی مراد پر دلالت کرتی ہیں اور یہ وہ کامل استعداد والے موحد ہیں کہ ان کے کمال کے اوپر کوئی کمال نہیں اور ان کے مرتبہ سے اوپر کوئی مرتبہ نہیں جس کی طرف وہ تبدیل اور تحویل ہونا چاہیں)

فردوس سے مراد حظیرۃ القدس، جنت کا ایسا مقام ہے جہاں عرش کا سایہ پڑتا ہے۔[5] اس کی مزید وضاحت میں خواجہ شمس الدین عظیمی لکھتے ہیں کہ حظیرۃ القدس میں فرشتوں اور نیک روحوں کی ایک جماعت جمع ہو جاتی ہے اس میں صرف اعلیٰ درجہ کی نیک روحیں ہی شامل ہوتی ہیں اور ایک جماعت بن جاتی ہے پھر کسی پاکیزہ شخص کا انتخاب ہوتا ہے اور اس کی

1۔ المومنون:11

22۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 60/2

3۔ الکھف:107

4۔ ابن عربی **تفسیر ابن عربی** 424/1

5۔//www.urduban.com/urdu_to_urdu/ .8:20/22/13/6

پیروی کے لیے لوگوں کو اشتیاق دلایا جاتا ہے پھر اچھائی کو اس نیک بندے کی جانب مختلف طریقوں سے خواب، الہام اور مختلف طریقوں سے اصلاح کی بات پہنچائی جاتی ہے [1]

اگر تفسیر بالماثور اور تفسیری اشاری کو مد مقابل لا کر دیکھیں تو جنت الفردوس جنت کا سب سے بلند مقام ہے اور اس میں دونوں اقسام تفسیر میں اتفاق ہے اور جب اس کی تعبیرات کو دیکھیں تو یہ جنت تفسیر بالماثور کے مطابق حشر کے بعد ملے گی اس کو مقفل کیا گیا ہے جو آحادیث سے ثابت بھی ہے مگر ابن عربی اس کو حظیرۃ القدس بتاتے ہیں جس کا مقام بالماثور اور اشاری دونوں اقسام تفسیر میں عرش کے نیچے ہے مگر اشاری میں یہ مقام نیک روحوں اور فرشتوں کا مسکن ہے اور وہاں سے یہ روحیں انسانیت کے لیے ہدایت کا الہام کرتی ہیں تفسیر بالماثور کی توجیہات تو آحادیث سے ثابت ہے مگر اشاری کی تعبیر یہ ابن عربی کی اپنی اختراع ہے۔ جو قرین قیاس نہیں ہے کہ اس مقام پر نیک روحیں اور فرشتے اکٹھے ہوتے ہیں اور انسانیت کی اصلاح کے لیے الہام کرتی ہیں۔

اگر سیاق و سباق آیات کو دیکھا جائے تو سیاق کلام بھی جنت الفردوس کی بالماثور روایات کی ہی تائید کرتا ہے کہ سورہ کہف کی آیت سے قبل جہنم کا ذکر ہے اور سورہ مؤمنون کی آیت نمبر 11 سے قبل بھی مومنین کی عملی سعی کا بیان ہے اور اس کے انعام کے طور پر ان کو جنت کی نعمت ملے گی تو قرین قیاس اور سیاق جنت الفردوس سے مراد یہی جنت کی حقیقی صورت ہی ہے نہ کہ ابن عربی کی بیان کردہ۔

جنت نعیم:

جنت نعیم یہ جنت کا دوسرا درجہ ہے قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اس کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ فَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ ٱلْمُقَرَّبِينَ فَرَوْح وَرَيْحَان وَجَنَّتُ نَعِيم﴾ [2]

(پس اگر وہ (مرنے والا) اللہ کے مقرب بندوں سے تو اسکے لیے راحت خوشبودار غذائیں اور سرور والی جنت ہو گی)

اس جنت وضاحت کرتے ہوئے حضرت عبد اللہ بن عباس اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

"{فَرَوْحٌ} فراحة لَهُم فِي الْقَبْر وَيُقَال رَحْمَة إِن قَرَأت بِضَم الرَّاء {وَرَيْحَانٌ} إِذا خَرجُوا من الْقُبُور وَيُقَال رزق {وجنة نَعِيمٍ} يَوْم الْقِيَامَة لَا يفنى نعيمها" [3]

1۔ اعظمی، شمس الدین، **تصوف و احسان**، خواجہ شمس الدین ریسرچ سوسائیٹی (س ن) ص 127

2۔ الواقعہ:88۔89

3۔ ابن عباس، **تنویر المقیاس**455

(پس راحت ہو گی ان کے لیے قبر میں اور رحمت بھی کہا جاسکتا ہے جب ر کے ضمہ کے ساتھ ہو اور راحت جب وہ قبروں سے نکلیں گے اسے رزق کہا گیا ہے اور جنت نعیم قیامت کے دن یہ نعمتیں فنا نہیں ہوں گی)

حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں جو لوگ جنت نعیم کے مالک بنیں گے ان کی راحت قبر سے ہی شروع ہو جائے گی قبر میں انتہائی راحت میں رہیں گے اور جب قیامت کے لیے قبروں سے اٹھیں گے اس وقت بھی عزت کا رزق پائیں گے اوراس دن کی سختی بھی ان سے نعمتوں کو دور نہیں کرے گی۔

اور سورہ المائدہ میں فرمایا۔

﴿وَلَوۡ أَنَّ أَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ ءَامَنُواْ وَٱتَّقَوۡاْ لَكَفَّرۡنَا عَنۡهُمۡ سَيِّـَٔاتِهِمۡ وَلَأَدۡخَلۡنَٰهُمۡ جَنَّٰتِ ٱلنَّعِيمِ﴾[1]

(اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیز گار بنتے تو ہم ضرور دور کر دیتے ان سے ان کی برائیاں اور ہم ضرور ان کو داخل کرتے نعمت کے باغوں میں)

علامہ سیوطی حضرت مالک بن دینار سے روایت کرتے ہیں

" قَالَ {جنَّات النَّعيم} بَين جنَّات الفردوس وجنات عدن وفيهَا جوَار خُلِقْنَ من ورد الْجَنَّةقيل فَمن سكنها قَالَ: الَّذين هموا بِالْمَعَاصِي فَلَمَّا ذكرُوا عَظمَة الله جلّ جَلَاله راقبوه"[2]

(فرماتے ہیں جنات نعیم جنت فردوس اور جنت عدن کے درمیان ہے اس کا صحن جنت کے پھولوں کا ہو گا اور یہ بھی کہا گیا ہے جو اس میں جو سکونت اختیار کریں گے وہ ایسے لوگ ہوں گے کہ جب گناہ کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کی یاد اور خوف آ گیا)

اس روایت میں جنت نعیم کا مقام بتایا گیا کہ یہ جنت عدن اور فردوس کے درمیان میں ہے اور اس میں وہ افراد رہیں ہوں گے جو گناہوں سے اس وجہ سے رک گئے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا خوف آ گیا تو ایسے افراد کو اللہ تعالیٰ جنت نعیم عطا فرمائے گا۔

ایک چیز جو سب اہل جنت کو ملے گی وہ یہ کہ ان کو ہمیشہ کا خلود ملے گا اور ان کو کبھی بھی جنت میں سے جانے کے بعد نکالا نہیں جائے گا اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا

﴿ يُبَشِّرُهُمۡ رَبُّهُم بِرَحۡمَةٖ مِّنۡهُ وَرِضۡوَٰنٖ وَجَنَّٰتٖ لَّهُمۡ فِيهَا نَعِيمٞ مُّقِيمٞ﴾[3]

(خوشخبری دیتا ہے انہیں ان کا رب اپنی رحمت اور اپنی خوشنودی کی اور ایسے باغات کی جس میں ان کے لیے دائمی نعمتیں ہوں گی)

1۔ المائدہ:65

2۔ السیوطی، **الدرالمنثور** 115/3

3۔ التوبہ:21

یہاں بھی جنت نعیم کی عطا کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے علامہ طبری اس کی وضاحت میں حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت نقل کرتے ہیں۔

((إذا دخل أهل الجنة الجنة، قال الله سبحانه: أُعطيكم أفضل من هذا، فيقولون: ربَّنا، أيُّ شيء أفضل من هذا؟ قال: رِضْوان))[1]

(جب اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں تم کو اس سے افضل چیز عطا فرماتا ہوں تو وہ عرض کریں گے یا اللہ اس سے افضل کیا ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا وہ میری رضا ہے)

جنت نعیم یہ جنت فردوس اور عدن کے درمیان میں ہے اس میں جانے والے لوگ قبر اور حشر میں بھی پریشان نہیں ہوں گے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مستفیض اور مستفید ہوں گے ان کو یہ جنت گناہوں سے خوف خدا کی وجہ سے الگ ہونے کی سے ملے گی اور جب یہ جنت میں جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے خطاب کر کے فرمائے گا کہ تم کو آج عظیم نعمت دیتے ہیں یہ عرض کریں گے مولا وہ کیا ہے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا میری رضا اس کے بعد میں تم سے ناراض نہیں ہوں گا

جنت نعیم کی اشاری تعبیرات :

﴿ فَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ ٱلْمُقَرَّبِينَ فَرَوْح وَرَيْحَان وَجَنَّتُ نَعِيم﴾[2]

(پس اگر وہ (مرنے والا) اللہ کے مقرب بندوں سے ہے تو اس کے لیے راحت خوشبودار غذائیں اور سرور والی جنت ہو گی)

اس آیت کے تحت فرماتے ابن عربی فرماتے ہیں۔

"من جملة الاصناف الثلٰثة فله روح الوصول الى الجنة الذات وريحان جنة الصفات وتجلياته البهيجة المبهجة وجنة النعيم الافعال ولذاتها "[3]

(یعنی جملہ تینوں اصناف میں سے ہے تو اس کے لیے وصول کی راحت جنت ذات کی طرف ہے اور ریحان جنت صفات کی طرف ہے اور اس کی تجلیات و لذات، تازگی اور سرور جنت افعال کی طرف ہے)

یہ افراد ایسے ہیں جن کو مرنے سے جنت میں پہنچنے تک راحت ملے گی اس دنیا میں ان کی ساری کوشش اللہ تعالیٰ کی صفات کی جانب تھی جس کے بدلہ میں انہیں قبر اور حشر میں راحت ملی مگر ان کا سفر جا کر ذات پر ختم ہو گا جو جنت افعال ہے جس میں ان کو تازگی اور راحت ملے گی۔

1۔ الطبری، **جامع البیان** 174/14

2۔ الواقعہ:88۔89

3۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 297/2

اور قرآن مجید کی دوسری آیت مقدسہ

﴿ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَٰنٍ وَجَنَّٰتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ﴾[1]

(خوشخبری دیتا ہے انہیں ان کا رب اپنی رحمت اور اپنی خوشنودی کی اور ایسے باغات کی جس میں ان کے لیے دائمی نعمتیں ہوں گی)

کی روشنی میں ابن عربی کہتے ہیں۔

"ثواب الاعمال ورضوان الصفات وجنا ت من الجنان الثلٰثۃ لہم فیہا نعیم شہود الذات مقیم ثابت ابداً"[2]

(ان کے عمل کا ثواب اور صفات کی تبدیلی پر اللہ تعالیٰ کی رضا ان کے لیے تین جنتیں ہیں اور ان کے لیے ان میں شہود ذات کی دائمی نعمت ثابت ہے)

اس آیت کے تحت ابن عربی کہتے ہیں کہ جو افراد اپنے اعمال اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر کاربند رہتے ہیں اوراس سے اپنی صفات کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ ان کو تین جنتیں ملیں گی اور ان کو اس سے کبھی بھی نکالا نہیں جائے گا جبکہ تفسر بالماثور میں ان کے لیے ایسی جنت ہے جس کو جنت نعیم کا نام دیا گیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے بقیہ کی دو بالماثور میں شامل نہیں ہیں اور ماثور میں یہ راحت موت کے ساتھ شروع ہو جائے گی اور جنت نعیم پر ختم ہو جائے گی جب کہ ابن عربی کہتے ہیں یہ مسلسل جنت صفات سے جنت ذات یعنی فردوس کی جانب منتقل ہوتے رہیں گے یہ ایک واضح فرق ہے بالماثور اور اشاری تفسیر کا کہ بالماثور میں جس مقام میں انسان پہنچ گیا اسی میں ہمیشہ رہے گا اور اشاری میں منتقل ہوتا رہے گا حتیٰ کہ منتقل ہوتا ہوا جنت الفردوس میں پہنچ جائے گا۔

جہاں تک ان آیات کی مراد اور سیاق وسباق کی بات ہے تو اس سے مراد کوئی خیالی جہان نہیں جیسا کہ ابن عربی کہتے ہیں بلکہ قرآن مجید میں تین مقامات پر سورہ توبہ کی آیت نمبر 21 میں ہجرت کا ذکر ہے اس کے بعد جنت نعیم میں داخل ہونے کا اور سورہ توبہ کی آیت میں 65 سے قبل رہبان کے ایمان نہ لانے کا اور جنت النعیم نہ ملنے کا اور مومنین کو عطا ہونے کا اور سورہ الواقعہ میں موت میں انسان کی بے بسی کا اور اللہ تعالیٰ کے قرب کی صورت میں جنت نعیم میں داخلہ تو ہر اعتبار سے یہ جنت حقیقی ہے۔

جنت عدن:

قرآن مجید میں جنت عدن کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا۔

1۔ التوبہ: 21

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 287/1

﴿وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ وَٱلۡمُؤۡمِنَٰتِ جَنَّٰت تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا وَمَسَٰكِنَ طَيِّبَة فِي جَنَّٰتِ عَدۡن وَرِضۡوَٰن مِّنَ ٱللَّهِ أَكۡبَرُۚ ذَٰلِكَ هُوَ ٱلۡفَوۡزُ ٱلۡعَظِيمُ ﴾[1]

(وعدہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں سے اور مومن عورتوں سے باغات رواں دواں ہیں ان کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہیں گی ان میں نیز (وعدہ کیا) پاکیزہ مکانات کا سدا بہار باغوں میں اور رضائے خداوندی اس سب نعمتوں سے بڑی ہے یہی تو بڑی کامیابی ہے)

اس آیت مقدسہ میں جنت عدن کا ذکر ہے اس کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں۔

عمران بن حصین سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ سے سوال کیا کہ قرآن مجید کی اس آیت ﴿ وَمَسَٰكِنَ طَيِّبَة فِي جَنَّٰتِ عَدۡن﴾[2]﴾

سے کیا مراد ہے۔ تو حضرت ابو ہریرہ فرمانے لگے اس کا ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا

((قصرٌ في الجنة من لؤلؤ، فيه سبعون دارًا من ياقوتة حمراء، في كل دار سبعون بيتًا من زمردة خضراء، في كل بيت سبعون سريرًا))[3]

(جنت میں ایک موتی کا محل ہے جس میں سرخ یاقوت کے ستر گھر ہیں ہر گھر میں ستر کمرے سبز زمرد کے ہیں ہر کمرے میں ستر بستر ہیں)

علامہ سیوطی نقل فرماتے ہیں نبی رحمت ﷺ نے فرمایا اس کے درجات سو ہیں۔

"الجَنَّة مائَة دَرَجَة: فأولها من فضَّة أرْضهَا فضَّة ومساكنها فضَّة وآنيتها فضَّة وترابها مسك"[4]

(جنت کے سو درجات ہیں پہلا چاندی کا اس کی زمین بھی چاندی کی ہے اور اس کے برتن بھی چاندی کے اور اس کی مٹی مسک کی ہے)

تفسیر روح المعانی میں علامہ آلوسی ایک روایت نقل فرماتے ہیں حضرت ابو درداء سے روایت ہے نبی رحمت ﷺ فرماتے ہیں

((عدن دار الله تعالى لم ترها عين ولم تخطر على قلب بشر لا يسكنها غير ثلاثة: النبيون والصديقون والشهداء يقول الله سبحانه طوبى لمن دخل))[5]

1۔ التوبہ 72

2۔ التوبہ 72

3۔ الطبری، **جامع البیان** 349/14

4۔ السیوطی، **الدرالمنثور** 237/4

5۔ ایضاً

(عدن اللہ تعالیٰ کا گھر ہے جس کو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا نہ ہی کسی دل میں اس کا خیال بھی پیدا ہوا ہے ان میں صرف یہ تین قسم کے افراد رہیں گے انبیاء شہداء اور اصدقاء اللہ تعالیٰ نے فرمایا مبارک ہو اس کو جو اس میں داخل ہوا)

اس مقام کا مسکن بھی بتا دیا کہ کون ہوں گے اور اس کی عظمت کو بھی واضح کر دیا کہ آج تک اسے کسی آنکھ نے دیکھا نہیں اور نہ ہی کسی دل میں اس کا خیال بھی پیدا ہوا ہے یہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عطا فرمائے گا۔ جو انبیاء شہید اور صدیق ہوں گے۔ اس کے علاوہ علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ جنت میں ان تین قسم کے افراد کے علاوہ بھی کچھ لوگ جائیں گے وہ کون ہوں گے۔

قَالَ: قَالَ رَسُول الله صلى الله عَلَيْهِ وَسلم: إن فِي الْجنَّة قصراً يُقَال لَهُ عدن حوله البروج والمروج لَهُ خَمْسَة آلَاف بَاب عِنْد كل بَاب خَمْسَة آلَاف حيرة لَا يدْخلهُ أَو لَا يسكنهُ إِلَّا نَبِي أَو صديق أَو شَهِيد أَو امام عَادل"[1]

جنت عدن یہ خاص انبیاء شہداء اور صدیقین کا مقام ہے اس جنت کو اللہ تعالیٰ نے چھپا رکھا ہے کوئی اس کے حسن کا تصور بھی نہیں کر سکتا اس کو چاندی سے سجایا گیا ہے اس کی زمین بھی چاندی کی، برتن اور اس کی مٹی خالص مشک کی ہے جب جنتی اس میں جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے خطاب فرمائے گا سب کو مبارک ہو جو اس میں داخل ہوئے ہیں۔

جب کہ ابن عربی اپنی تفسیر میں جنت عدن کی توجیہ اس آیت کی روشنی میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

﴿وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتِ جَنَّٰتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا وَمَسَٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَٰنٌ مِّنَ ٱللَّهِ أَكْبَرُۚ ذَٰلِكَ هُوَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ﴾[2]

((وعدہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں سے اور مومن عورتوں سے باغات رواں دواں ہیں ان کے نیچے ندیاں ہمیشہ بہیں گی ان میں نیز (وعدہ کیا) پاکیزہ مکانات کا سدا بہار باغوں میں اور رضائے خداوندی اس سب نعمتوں سے بڑی ہے یہی تو بڑی کامیابی ہے)

اس آیت مقدسہ کی وضاحت میں ابن عربی فرماتے ہیں۔

"هی جنات النفوس ومساكن طيبة مقامات ارباب التوكل فی جنا ت الافعال بدليل قوله تعالیٰ وَرِضْوَٰنٌ مِّنَ ٱللَّهِ أَكْبَرُۚ ان الرضوان من جنات الصفات ذالک ای ارضوان هو الفوزالعظيم لكرامة اهله عندالله وشدة قر بتهم "[3]

1۔السیوطی ، **الدرالمنثور** 638/4

2۔ التوبہ : 72

3۔ابن عربي، **تفسیر ابن عربي** 292/1

(ان کے لیے افعال ااور صفات کی جنتیں تیار کر کے رکھی ہیں جن کے نیچے توکل اور رضا اور جو ان کے مناسب ہے کے علوم کی نہریں جاری ہیں اور یہ سابقین کی دوسری جنت یعنی جنت ذات کے منافی نہیں اور وہ اس میں کلی اشتراک کی بناء پر اس کے ساتھ مختص ہیں)

جنت عدن کو ابن عربی جنت نفوس کا نام دیتے ہیں کہ انسان اپنے اعمال اور اپنی عادات کے بدلنے پر حاصل کرے گا یہ صبر توکل اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے پر ہی انسان کو ملے گی ابن عربی کہتے ہیں کہ جن کو جنت ذات ملے گی ان کو جنت صفات بھی ملے گی وہ اس میں شریک ہوں گے اور مزید اس کی وضاحت میں ابن عربی کہتے ہیں یہ جنت مختلف قسم کے افراد کو مختلف آزمائشوں کے بعد ملے گی۔ اور اس آیت مقدسہ

﴿جَنَّٰتُ عَدۡنٖ يَدۡخُلُونَهَا وَمَن صَلَحَ مِنۡ ءَابَآئِهِمۡ وَأَزۡوَٰجِهِمۡ وَذُرِّيَّٰتِهِمۡۖ وَٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ يَدۡخُلُونَ عَلَيۡهِم مِّن كُلِّ بَابٖ﴾[1]

(صدا بہار باغات جن میں داخل ہوں گے جو صالح ہوں گے ان کے باپ دادا ان کی بیویوں اور ان کی اولاد سے (وہ بھی داخل ہوں گے) اور فرشتے یہ کہتے ہوئے داخل ہوں گے ان پر ہر دروازے سے کہ ان پر سلامتی ہو)

کی وضاحت میں ابن عربی کہتے ہیں۔

"یدخلون جنۃ الذات مع من صلح من آباء الارواح وجنۃ الصفات بالقلوب و جنۃ الافعال بمن صلح من ازواج النفوس وذریات القویٰ والملٰئکۃ من اہل الجبروت والملکوت یدخلون علیہم من کل باب من ابواب الصفات المسلمین محیین ایاہم من بتحایا الاشراقات النوریۃ والامدادات القدسیۃ کل ذالک بسبب صبرہم علیٰ اللذات الحسیۃ "[2]

(وہ جنت ذات میں داخل ہوتے ہیں ان کے ساتھ جو کہ ان کی اصلاح والی آباء کی ارواح ہیں اور صفات کی جنت میں داخل ہوتے ہیں دلوں کے ساتھ افعال کی جنت میں ان چیزوں کے ساتھ جن کا تعلق نفوس کے ساتھ ہے اور جو انسانی قویٰ سے پیدا ہوتی ہیں اور فرشتے جو جبروت ملکوت والوں سے ہیں ہر دروازے سے جو مسلمانوں صفات کے نام سے ہیں جو اشراقات نوریہ اور امدادات قدسیہ سے روشن ہیں فرشتے ان کو سلام کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں یہ سب کچھ ان کی حسی لذات پر ان کے صبر کی وجہ سے ہے)

ابن عربی کے نزدیک جنت عدن انسان کو اپنے جسمانی لذات پر صبر کی صورت میں ملے گی اور اس جنت میں ان کے ساتھ ان کے صالح آباء اور اور اولاد بھی ہو گی جب یہ جنت میں داخل ہوں گے تو جس دروازہ سے داخل ہوں گے فرشتے ان کو

1۔ الرعد:23

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی**، 365/1

سلام کریں گے مگر یہ اپنی حسی لذتوں پر صبر کی صورت میں ہی ملے گی کیونکہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے اپنی لذتوں پر صبر کر لیا اور اس مشقت کو برداشت کر لیا۔

ابن عربی کہتے ہیں کہ لوگوں کو مختلف مراتب ان کے تقویٰ کے سبب ملیں گے اس آیت مقدسہ

﴿جَنَّٰتِ عَدۡنٍ ٱلَّتِي وَعَدَ ٱلرَّحۡمَٰنُ عِبَادَهُۥ بِٱلۡغَيۡبِۚ إِنَّهُۥ كَانَ وَعۡدُهُۥ مَأۡتِيا﴾[1]

(صدا بہار چمن (جن کا وعدہ) خداوند رحمٰن نے اپنے بندوں سے غیب میں کیا یقیناً اس کا وعدہ پورا ہو کر رہنے والا ہے) کی وضاحت میں ابن عربی کہتے ہیں۔

دائماً بکرۃفی جنۃ القلب وقت ظہور شمس الروح وعشیاً ً فی جنۃ النفس وقت غروبہ[2]

(ہمیشہ جنت قلب میں شمس روح کے نور کے ظہور کے وقت صبح کو اور جنت نفس میں شمس روح کے غروب کے وقت شام کو ان کو روزی ملے گی)

اس روزی سے کیا مراد ہے حقیقت میں یہ جنت کے مقامات ہیں جو سب جنتیوں کو ان کے تقویٰ کے مطابق ملیں گے ابن عربی لکھتے ہیں۔

"ان اتقی الرذائل والمعاصی نورثہ جنۃ النفس ای جنۃ الآثار وان اتقی افعالہ بالتوکل فلہ جنۃ القلب وحضور تجلیات الافعال وان اتقی صفاتہ فی مقام القلب فلہ جنۃ الصفات ان اتقی ذاتہ ووجودہ بالفناء فی الہہ جلہ جنۃ الذات "[3]

(اگر وہ رزائل اور معاصی سے پرہیز کرتا ہے تو وہ جنت نفس یعنی جنت کے آثار کا مالک ہو گا اگر توکل کے ساتھ اپنے افعال سے بچتا ہے تو جنت اس کے لیے جنت قلب ہے اور حضور تجلیات افعال ہے اور اگر مقام قلب میں اپنی صفات سے پرہیز کرتا ہے اور اپنے وجود کو فنا فی اللہ کر لیتا ہے تو اس کے جنت ذات ہے)

اس مقام پر ابن عربی جنت کی ساری تفصیل جنت عدن کے تحت لکھتے ہیں کہ اگر انسان گناہوں سے بچتا ہے تو جنت کے آثار اور علامات تک جائے گا اگر توکل اختیار کر کے خود کو خدا کے سپرد کرتا ہے تو جنت قلب میں اللہ کی تجلی ملے گی اور اگر فنا فی اللہ میں پہنچ جائے تو جنت ذات تک پہنچ جائے گا۔

تفسیر بالماثور میں جنت عدن جنت کا تیسرا مقام ہے جہاں نبی شہید صدیق اور عادل حاکم رہیں گے جبکہ ابن عربی اس جنت کو جنت صفات کا نام دیتے ہیں جو اپنی بری صفات کو اچھی صفات سے بدل دیتا ہے اسے جنت عدن ملے گی جس میں جنت

1۔ مریم: 61

2۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 10/2

3۔ ایضاً

کے آثار اور علامات ہوں گی اس کا مطلب ابن عربی بیان کرتے ہیں کہ یہ ذات سے دور ہو گی تو صاف ظاہر جہاں پر ذات کی تجلیات ہوں گی وہ جنت یقیناً دوسری جنتوں سے زیادہ خوبصورت اور پر سکون ہو گی۔

جنت عدن سے کیونکہ اپنی صفات اور وجود کو رزائل سے بچایا تھا تو وجود کا سکون ہو گا مگر اس کے دل میں زیادہ اثرات نہیں ہوں گے دل میں اثرات توکل اور اللہ تعالیٰ پر یقین کامل سے آئے گا اور اگر اپنی ذات سے سب ختم کر کے خدا کی ذات میں فنا ہوتا ہے تو اس سے جنت ذات ملے گی وہ جنت جس میں اللہ تعالیٰ کی بلاوسطہ ملاقات اور تجلیات ملیں گی۔

اس آیت کا سیاق بھی جنت کی حقیقی صورت پر دلیل ہے کہ سررہ توبہ کی آیت نمبر 72 سے قبل کی آیت میں امر بالمعروف نہی عن المنکر قیام نماز ادائے زکوٰۃ اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کا ذکر ہے جس کے نتیجہ میں ویسی ہی نعمتوں بھری جنت کا ذکر ہے جو ایک نعمتوں کا جہان ہے نہ خیالات کا۔

جنت الماویٰ:

قرآن مجید میں کئی مقامات پر جنت الماویٰ کا ذکر آیا ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا۔

﴿أَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ فَلَهُمۡ جَنَّٰتُ ٱلۡمَأۡوَىٰ نُزُلَۢا بِمَا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ﴾[1]

(پس جو لوگ ایمان لائے اور اچھے اعمال کرتے رہے تو ان کے لیے جنت ہمیشہ کا ٹھکانا ہے بطور ضیافت ان (نیکیوں) کے عوض جو وہ کرتے تھے)

اس آیت مقدسہ میں لفظ جنت الماویٰ کا ذکر ہے اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ اس جنت کو جنت ماویٰ کیوں کہتے ہیں اس کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں۔

"جنات المأوى: يعني بساتين المساكن التي يسكنونها في الآخرة ويأوون إليها. وقوله: (نزلا بِما كانُوا يَعْمَلُونَ) يقول: نزلا بما أنزلوها جزاء منه لهم بما كانوا يعملون في الدنيا بطاعته"[2]

(رہنے کے دو ایسے باغ جس میں آخرت میں لوگ رہیں گے اس کی جانب کھینچے آئیں گے یہاں اتریں گے اپنے اعمال کی وجہ سے اور کہیں گے یہ ٹھہرنا اور اترنا ان کے ان اعمال کی جزا ہے جو وہ عمل کرتے تھے دنیا میں اطاعت سے)

جنت الماویٰ یہ ایسے باغات ہیں جہاں لوگ اپنے اعمال کے سبب پہنچیں گے اور یہ ان کو جزا ہو گی اس اطاعت کی جو وہ اپنی زندگی میں کرتے رہے اور اس کے علاوہ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں یہ جنت کا وہ مقام ہے جہاں شہداء کی روحوں کو شہادت کے بعد رکھا جاتا ہے

1۔ السجدہ: 19

2۔ الطبری، **جامع البیان** 188/20

أنها تأوي إليها أرواح الشهداء، وروي أنها عن يمين العرش"[1]

(یہاں تک شہداء کی روحیں آتی ہیں اور یہ جنت اللہ تعالیٰ کے عرش کی دائیں جانب ہے)

جنت ماویٰ ایسے باغات ہیں جہاں شہداء کی روحوں کو شہادت کے بعد منتقل کر دیا جاتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے عرش کی دائیں جانب ہے۔

تو ابن عربی نے اس مقام پر محض ٹھکانہ کے معنیٰ میں ماویٰ کو لیا ہے جب کہ دوسرے مقام پر اس آیت یا

﴿عِندَهَا جَنَّةُ ٱلْمَأْوَىٰٓ﴾[2]

(اس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے)

اس کی وضاحت میں ابن عربی فرماتے ہیں

"التی یاوی الیها ارواح المقربین "[3]

(اس مقام پر مقربین کی ارواح پہنچتی ہیں)

مقربین صرف شہداء نہیں ہوتے اولیاء بھی مقربین میں شامل ہوتے ہیں تفسیر بالماثور اور تفسیر ابن عربی میں فرق یہ ہے کہ بالماثور میں یہ مقام خاص ارواح انبیاء کے لیے ہے اور ابن عربی کہتے ہیں کہ یہ مقام مقربین کے لیے ہے اور دونوں تفاسیر میں اس بات پر اتفاق ہے کہ اس میں ارواح ہی ہوں گی اور جسم سے نکلتے ہی اس جنت میں منتقل ہو جائیں گی اور۔

یہاں سیاق کلام کے اعتبار سے ماویٰ محض ٹھکانے کے معنیٰ میں ہے نہ کہ یہ جنت کا کوئی الگ سے مقام ہے کیونکہ اس ک ے بعد کفار کا ذکر ان ہے کے لیے ماویٰ جہنم کا ذکر ہے جو ٹھکانا کے معنی میں ہے او راس سے قبل بھی مؤمنین اور کفار دونوں کا ذکر ہے جس میں مؤمنین کے لیے امید اور کفار کے لیے نہ امیدی ہے۔ جہاں تک تفسیر بالماثور کی وضاحت وہ بھی اسی جانب ہی اشارہ کرتی ہے اور اشاری ابن عربی کا اپنا فلسفہ ہے جس کی کوئی دلیل ناطق نہیں ہے۔

جہنم کی بالماثور تعبیرات:

قرآن مجید میں لفظ جہنم کا استعمال کئی مقامات پر کئی ناموں سے ہوا ہے جہنم در حقیقت اللہ تعالیٰ کے غضب کی عملی صورت ہے جو نافرمانوں کو ان کے گناہوں کی سزا کے طور پر ملے گی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُ ٱتَّقِ ٱللَّهَ أَخَذَتْهُ ٱلْعِزَّةُ بِٱلْإِثْمِ فَحَسْبُهُۥ جَهَنَّمُ ۖ وَلَبِئْسَ ٱلْمِهَادُ﴾[1]

1۔ الآلوسی، **روح المعانی** 131/11

2۔ النجم:15

3۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 277/2

(اور جب کہا جائے اسے کہ خدا سے توڈر تو اور اکساتا ہے اسے غرور گناہ پر پس اس کے لیے جہنم کافی ہے اور بہت ہی برا ٹھکانا ہے)

اس آیت مقدسہ میں جہنم کو بطور سزا مقام بتایا گیا ہے جہنم کی وضاحت میں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

"وجَهَنَّمُ علم لدار العقاب أو لطبقة من طبقاتها ممنوعة "[2]

(جہنم سزا کے گھر کا نام ہے یا یہ طبقات ممنوعہ میں سے ایک طبقہ ہے)

جہنم کے سات طبقات ہیں جن کو قرآن مجید کی اس آیہ مقدسہ کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

﴿لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَٰب لِّكُلِّ بَاب مِّنْهُمْ جُزْء مَّقْسُومٌ ﴾[3]

(اس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کا مقررہ حصہ ہے) اس کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں۔

" عن ابن جريج، قوله (لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ) قال: أولها جهنم، ثم لظى، ثم الحطمة، ثم السعير، ثم سقر، ثم الجحيم، ثم الهاوية والجحيم فيها أبو جهل ،"[4]

(ابن جریج سے روایت ہے ان کا قول ہے اس کے سات دروازے ہیں پہلا جہنم، پھر حطمہ پھر لظی، پھر سعیر پھر سقر، پھر جحیم، پھر ھاویہ اور جحیم میں ابو جہل ہو گا)

مگر ابن عربی کا تصور ابواب جہنم دوسروں سے مختلف ہے قرآن مجید کی اس آیت مقدسہ

﴿لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَٰب لِّكُلِّ بَاب مِّنْهُمْ جُزْء مَّقْسُومٌ ﴾[5]

(اس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کا مقررہ حصہ ہے)

کی وضاحت میں ابن عربی فرماتے ہیں۔

"هی حواس الخمسه والشهوة والغضب لكل باب منهم جزءمقسوم عضو خاص به او بعض من الخلق يختصو بالدخول منه لغلبة قوة ذالک البا ب عليهم"[6]

"یہ حواس خمسہ ہیں اور شہوۃ اور غضب ہے ہر ایک دروازے کے لیے مقررہ حصہ ہے یا اس کے لیے خاص عضو ہے مخلوق سے جو اس میں داخل ہونے کے لیے مختص ہے جس قوت کا غلبہ ہو گا اسی باب میں داخل ہو گا"

1۔ البقرہ:206

2۔ الآلوسی، **روح المعانی** 491/1

3۔ الحجر:44

4۔ الطبری، **جامع البیان** 107/17

5۔ الحجر:44

6۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 377/1

ابن عربی نے ان پانچ حواس اور قوت غضبیہ اور قوت شہوانیہ کو جہنم کے دروازے قرار دیا ہے ان حواس کو حدود و قیود میں رکھنا اور اپنے غضب اور شہوت پر غلبہ حاصل نہ کرنا ان کا غیر مناسب استعمال ہی باعث سزا ہے جس قدر ان قوتوں اور حواس کو منفی مقاصد کے لیے استعمال کریں گے اس قدر جہنم کا حصہ بنیں گے۔

جبکہ تفسیر بالماثور میں یہ قطعاً مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ حقیقی سات دروازے اور سات طبقات ہیں جب کہ ابن عربی اپنی اس توجیہ میں بھی منفرد ہیں اور اسے انسان کے حواس اور قوتوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ تفسیر بالماثور میں جہنم کا پہلا طبقہ جہنم ہے۔

جہنم کی وضاحت میں قرآن مجید کی متعدد آیات ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا

﴿ثُمَّ مَأۡوَىٰهُمۡ جَهَنَّمُۖ وَبِئۡسَ ٱلۡمِهَادُ﴾[1]

(پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور کیا ہی برا ٹھکانہ ہے)

اس کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں

" وبئس المهاد". وبئس الفراش والمضجع جهنم"[2]

(بہت برا ٹھکانہ اور بچھونا اور لیٹنے کی جگہ)

جہنم کسی بھی اعتبار سے سکون اور آرام کا مقام نہیں ہے نہ بیٹھنے میں نہ سونے میں نہ چلنے میں اتنی سزا اور عذاب ہے کہ انسان کے لیے اس کا تصور بھی ممکن نہیں اگر انسان دنیا میں اپنی مرضی اور منشاء سے کچھ خواہشات کی تکمیل چاہے جس کا انجام سزا پر ہو تو ایسی خواہشات سے اجتناب کرنا ہی باعث کامیابی ہے نہ کہ عارضی سکون پر اپنی دائمی زندگی کو داؤ پر لگا کر بیٹھ جائے علامہ رازی فرماتے ہیں۔

"النِّعْمَةُ الْقَلِيلَةُ إِذَا كَانَتْ سَبَبًا لِلْمَضَرَّةِ الْعَظِيمَةِ لَمْ يُعَدَّ ذَلِكَ نِعْمَةً، وَهُوَ كَقَوْلِهِ: إِنَّما نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدادُوا إِثْماً"[3]

(جب ایک چھوٹی نعمت بہت بڑے نقصان کا سبب بنے تو اس کو نعمت شمار ہی نہیں کیا جاتا جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے ہم ان کو مہلت دیتے ہیں تاکہ اپنے گناہوں میں اور بڑھ جائیں)

امام رازی فرماتے ہیں اگر چھوٹی خواہش بڑی سزا کا باعث بنے تو اس پر صبر کرنا مستقبل کو بچانا عقل مندی اور دانائی ہے نہ کہ اپنی چھوٹی خواہش کو پورا کرنے میں خود کو بڑی مصیبت میں مبتلا کر دیا جائے تو بہتر یہی ہے کہ دنیا کی عارضی لذتوں سے

1۔آل عمران: 197

2۔الطبری **جامع البیان** 494/7

3۔الرازی، **مفاتیح الغیب**، 472/9

پہلو تہی اختیار کی جائے اور دائمی راحتوں کو اختیار کیا جائے یعنی جہنم سے بچنے والے کاموں میں مصروف رہے جہنم میں انسان کو کن حالات کا سامنا ہو گا اس کی وضاحت میں تفسیر ابن عباس میں نبی رحمت ﷺ کا فرمان ہے

" {لَهُمْ مِّن جَهَنَّمَ مِهَاد} فرَاش من نَار {وَمِن فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ} غاشية من نَار {وَكَذَلِكَ} هَكَذَا {نَجْزِي الظَّالِمين} الْمُشْرِكين[1]

(ان کے لیے جہنم سے اوڑھنا اور بچھونا ہو گا یعنی آگ سے ہی اوڑھنا اور آگ کا ہی بچھونا ہو گا یہ بدلہ ہے ظالموں کے شرک کا)

جبکہ دوسری جانب جب تفسیر اشاری کی وضاحتوں کو دیکھیں تو وہ بالماثور کی تعبیرات سے بہت مختلف ہیں اور جن آیات اور اقسام کے تحت تفسیر بالماثور میں جہنم اور اس کی اقسام بیان کی گئی ایسی تفصیل سے ان آیات کو ابن عربی نے بیان نہیں کیا ہے۔

صاحب تفسیر ابن عربی قرآن مجید کی اس

﴿إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَداۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرا﴾[2]

(بجز جہنم کی راہ کے ہمیشہ رہیں گے اس میں ابد تک یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے)

آیت مقدسہ میں لفظ جہنم کی وضاحت میں کہتے ہیں۔

"الا طريق جهنم نيران اشواق نفوسهم الى ملاذها مع حرمانهم عنها "[3]

(باوجود اپنی لذتوں اور ملاذ کی طرف حرمان اور محرومی کے اپنے نفس کے شوق کی آگ میں رہیں گے)

ابن عربی کہتے ہیں جہنم ایسی لذت اور سکون کی تلاش ہے جس کی انسان کو خواہش ہو مگر اس تک انسان کی رسائی نہ ہو اس سے محرومی کا یقین بھی ہو اور اس کی طلب میں بھی مسلسل اضافہ ہو تا جائے اسی کا نام جہنم ہے یہ ایسی خواہشات کا نتیجہ ہے جو انسان کو عظمت اور بلندی سے پستی کی جانب لاتی ہیں یہ انسان ہی کی ذات میں موجود ہیں ابن عربی اس آیہ مقدسہ

﴿قَالَ ٱخۡرُجۡ مِنۡهَا مَذۡءُوما مَّدۡحُوراۖ لَّمَن تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ لَأَمۡلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكُمۡ أَجۡمَعِينَ﴾[4]

(فرمایا نکل جا یہاں سے ذلیل (اور) راندہ ہوا جس کسی نے پیروی کی تیری ان سے تو یقیناً میں بھر دوں گا جہنم کو تم سب سے) آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں۔

1۔ ابن عباس ، **تنوير المقياس**،128

2۔النساء:169

3ابن عربي، **تفسير ابن عربي** 186/1

4۔الاعراف:18

"الطبیعۃ التی ہی اسفل مراتب الوجود منکم اجمعین محجوبین من لذۃ النعیم الابدی السرمدی والکمالات الروحانیۃ والکمالات الحقانیۃ معذبین بنیران الحرمان عن المراد فی انقلابات عالم التضاد وتقلبات الکون والفساد "[1]

(یہ وہ طبیعت ہے جو مراتب وجود میں سب سے نیچے ہے نعیم ابدی کی لذت بقاء سرمدی کے کمالات روحانیہ اور کمالات حقانیہ سے محجوب اور عالم تضاد کے انقلابات اور کون وفساد کے تقلبات میں مراد سے محرومی کی آگ میں معذب ہونے والے)

تفسیر ابن عربی کے مصنف کے نزدیک یہ بے قراری اور اضطراب انسان میں مادیت اور نفس کوشی کی وجہ سے ہوتا ہے انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے دور اور ہر کمال سے محرومی کی آگ میں جلتا ہے اور کمالات روحانیہ اور حقانیہ سے محجوب اور محروم ہو جاتا ہے اس کی طبیعت کمالات روحانیہ کے خلاف فسادات کی آماجگاہ بن جاتی ہے وہ حقیقی لذت سے دور اور تضادات وفسادات کا شکار ہو جاتا ہے۔

جہنم کے تصور کی مزید وضاحت میں ابن عربی اس آیت مقدسہ

﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ فَتَنُواْ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ وَٱلۡمُؤۡمِنَٰتِ ثُمَّ لَمۡ يَتُوبُواْ فَلَهُمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمۡ عَذَابُ ٱلۡحَرِيقِ﴾[2]

(بے شک جن لوگوں نے ایذا دی مومن مردوں کو اور مومن عورتوں کو پھر توبہ بھی نہ کی تو ان کے لیے جہنم کی سزا ہے اور جلانے کا عذاب ہے)

کی وضاحت میں فرماتے ہیں۔

"فلہم عذاب جہنم ای : تاثیر نار الطبیعۃ السفلیہ ولہم عذاب الحریق القہر من نار الصفات فوق نار الآثار وذالک لشوقہم عند خراب البدن الیٰ انوار الصفا ت فی عالم القدس و حرمانہم وطردہم بقہر الحق فعذبوا بالنارین جمیعاً "[3]

(ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور دیکھتے نہیں تو وہ اپنی طبیعت سفلیہ کی آگ کی تاثیر سے عذاب کی طرف لوٹ جائیں گے اور ان کے آثار کی آگ سے اوپر صفات کی آگ ہے جس کے ساتھ انہیں جلانے کا عذاب دیا جائے گا اور عالم قدس میں انوار صفات کی طرف بدن کی بربادی کے وقت ان کے شوق کی وجہ سے ہے اور انہیں قہر حق کے ساتھ دور اور محروم کیا جائے گا تو وہ دو آگوں کے معذب ہوں گے)

2۔ البروج: 10

3۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 394/2

عادات کی برائی سے آثار کی جہنم ہے اور آثار علامات ہیں جس سے انسان شکوک وشبہات کا شکار ہوتا ہے اور جب صفات ہی بدل جاتی ہیں اور نیکی کی طاقت ختم ہو جاتی ہے اور عالم قدس کے انوار سے انقطاع ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے ان پر خدا کا قہر ہوتا ہے ان کو دوہرا عذاب ہوتا ہے ایک آثار کا دوسرا صفات کا اور اس کا انجام اللہ تعالیٰ سے دوری اور اللہ تعالیٰ کے قہر کی صورت میں ہوتا ہے۔

ابن عربی کی اس ساری وضاحت میں جہنم سے مراد انسان کی چاہت کی انتہا ہے جس کے بغیر اس کو سکون نہیں ہے مگر اس کی چاہت کے پورا ہونے میں مکمل مایوسی ہے وہ طلب مراد پر صبر بھی نہیں کر سکتا مگر اپنی مراد کو کبھی حاصل بھی نہیں کر سکتا اس کی طلب اور عطا میں تضاد ہے انسان اپنی طبیعت کی اعلیٰ حالت کو چھوڑ کر ادنیٰ اور سفلی حالت کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور اس کا سوال اپنی عادات کے مخالف ہے جو اس کو کبھی ملنے والا نہیں اس کی ان بری عادات کے دو مراحل ہیں ایک شکوک وشبہات کی وجہ سے غلطی کرنا دوسرا اپنی بری عادات کا اس قدر پختہ ہو جانا کہ ان کا انسان سے ورود ہونے لگے یعنی انسان کی صفات ہی تبدیل ہو جائیں ان دونوں صورتوں میں عذاب مختلف ہو گا آثار کی صورت میں تپش اور گرمی محسوس کرے گا اور جب اس کی صفات ہی بدل جائیں گی تو وہ اللہ تعالیٰ کے انوار سے مکمل محجوب ہو جائے گا اور خدا کے قہر کا شکار ہو گا۔

اور اس کو عذاب بھی دوہرا ہو گا ایک آثار کی تباہی کی وجہ سے دوسرا اپنے صفات کو تبدیل کرنے کی وجہ سے تو ابن عربی کے نزدیک جہنم یہ انسان کی ذات میں ہی ہے اس کی الگ سے توجیہ نہیں ہے جب انسان کی عادات بری ہوتی ہیں تو اس سے انسان کی طبیعت سے سکون رخصت ہو جاتا ہے اور اس کا تعلق عالم انوار سے کٹ کر سفلی دنیا سے ہو جاتا ہے اور یوں انسان کی ذات کا سب سے کم تر پہلو جس کی اتنی اہمیت نہیں تھی وہ طاقتور ہوتا ہے اور سفلی جہت کی جانب توجہ زیادہ ہوتی ہے اسی سے وجود بوجھل ہوتا ہے اسے جہنم کہا گیا ہے۔

دوسری جانب تفسیر بالماثور میں جہنم یہ مقام سزا جو آگ سے گھرا ہو چاروں جانب سے بند اور انسان کے عملی گناہوں کی عملی سزا ہے ان دونوں میں فرق واضح ہے ابن عربی اسے محض اضطراب نفس سے تعبیر کرتے ہیں اور بالماثور میں یہ حقیقی سزا ہے جس سے انسان کا پورا وجود متاثر ہو گا اور انسان کو آگ کے جہان میں اترنا ہو گا جسے قرآن وآحادیث اور اقوال مفسرین کی روشنی میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔

2۔ لظیٰ

یہ جہنم کا دوسرا طبقہ ہے قرآن مجید میں اس کا ذکر دو مقامات پر آیا ہے سورہ معارج میں اور سورہ اللیل میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿كَلَّآ إِنَّهَا لَظَىٰ﴾[1]

(بے شک آگ بھڑک رہی ہو گی)

جہنم کا یہ مقام جس کو لظیٰ کہا گیا ہے اس کی وضاحت میں ابن عباس فرماتے ہیں

"{إِنَّهَا لظى} يَعْنِي اسْما من أَسمَاء النَّار"[2]

(یہ جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے)

۔اوراس کی وضاحت میں امام آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جہنم کا دوسرا طبقہ ہے۔

وهي علم لجهنم أو للدركة الثانية من دركاتها منقول من اللظى بمعنى اللهب الخالص[3]

(یہ جہنم کا نام ہے یا جہنم کا دوسرا طبقہ ہے جو لظیٰ سے منقول ہے جس کا معنیٰ ہے خالص انگارا)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا جو انتہائی بد بخت ہو گا وہ جو اس میں جائے گا

﴿فَأَنذَرْتُكُمْ نَارا تَلَظَّىٰ لَا يَصْلَىٰهَآ إِلَّا ٱلْأَشْقَى﴾[4]

(پس میں نے خبر دار کر دیا ہے تمہیں ایک بھڑکتی آگ سے اس میں نہیں جلے گا مگر انتہائی بد بخت)

جو جہنم کے اس طبقہ میں جائے گا وہ بد بخت اور شقاوت کا شکار ہو گا اس کی علامت بیان فرمائی کہ جھوٹا ہو گا اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلاتا ہو گا اس کی وضاحت میں علامہ آلوسی حضرت عبد اللہ بن عباس کی روایت نقل فرماتے ہیں۔

" نَزَلَتْ فِي أُمَيَّةَ بْنِ خَلَفٍ وَأَمْثَالِهِ الَّذِينَ كَذَّبُوا مُحَمَّدًا وَالْأَنْبِيَاءَ قَبْلَهُ، وَقِيلَ: إِنَّ الْأَشْقَى بِمَعْنَى الشَّقِيِّ "[5]

(یہ امیہ بن خلف کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کی مثال وہ جس نے محمد ﷺ کے پیغام کو جھٹلایا اور اس سے قبل انبیاء کو اور کہا گیا ہے کہ یہاں اشقیٰ بمعنیٰ شقی ہے)

جہنم کا یہ مقام بد بخت ترین انسان کا مقام ہے یہاں علامتی طور پر امیہ بن خلف کا نام لیا البتہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو جھٹلاتا ہے وہ اس میں جائے گا۔

1۔ المعارج:15

2۔ ابن عباس، **تنویر المقیاس**485

3۔الآلوسی، **روح المعانی**68/15

4۔ اللیل:14۔15

5۔ الآلوسی، **روح المعانی** 186/31

مگر ابن عربی لظیٰ کو طبیعت سفلیہ کی آگ قرار دیتے ہیں جو حق سے دوری اور جناب قدس سے اعراض کی وجہ سے گمراہی کے اندھیروں میں پڑی ہے انسان کے وجود کی یہ تبدیلی جو خواہشات نفس کے اثرات سے پیدا ہوتی ہے یہ اپنے وطن کی جانب رغبت رکھتی ہے جب انسان کا دل اس جنسیت اور نفسانی خواہشات کی آگ سے جل جاتا ہے تو اس کی کشش بھی ایسی ہی آگ کی جانب ہو جاتی ہے تو اب اس آگ سے نجات ممکن نہیں کیونکہ اس نے اسی استعداد سے اسے بلایا ہے ۔ابن عربی اسے انسان کے برے اعمال کی وجہ سے وجود پر اثرات سے تعبیر کرتے ہیں کہ انسان کی بری خواہشات اور برے اعمال سے وجود میں ویسے ہی اثرات پیدا ہوتے ہیں۔

دوسرے مقام پر ابن عربی نے کہا۔

ناراً عظیمۃ یبلغ لظاہا جمیع مراتب الوجود وہی النار الکبریٰ الشاملۃ للحجاب والقہر والسخط والتعذیب بالآثار ولہٰذا قال لا یصلٰہا الاالاشقی العدیم الاستعداد الخبیث الجوہر المشرک باللہفی المواقف الاربعۃ [1]

یعنی تمام مراتب وجود میں بھڑکنے والی آگ اور یہ بہت بڑی آثار کے ساتھ تعذیب اور قہر وناراضگی اور حجاب کو شامل ہے اسی لیے فرمایا یہ نہیں پہنچے گی مگر بد بخت کو جو چاروں مواقف میں عدیم الاستعداد خبیث الجوہر اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والا ہے۔

لظیٰ تفسیر ابن عربی کی اس وضاحت کے مطابق بھی وجود کے غلط استعمال کی وجہ سے انسان کی ذات میں بھڑکنے والی آگ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا قہر اور ناراضگی شامل ہے جس کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی ذات سے حجاب میں ہوتا ہے جو سوائے بد بختوں کے اور کسی کو نہیں پہنچے گی اور اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جو مثبت فکر و عمل سے عاری بری عادات کا منبع اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والا ہے اس کے وجود میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے آثار ہیں جس کی وجہ سے اس کی کشش اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والی چیزوں کی جانب ہے جس سے کبھی بھی طبیعت میں سکون نہیں آسکتا ابن عربی کے نزدیک لظیٰ یہ وجود کا ضطراب جو برے اعمال کا نتیجہ ہے اور تفسیر بالماثور کے مطابق یہ جہنم کا دوسرا مقام ہے جو خالص انگاروں پر مشتمل ہے۔

قرآن مجید میں دو مقامات پر لظیٰ کا ذکر ہے اور دونوں پر ہی اس کے قبل اور بعد جہنم ہی کا تصور ایک بار سورہ معارج کی آیت نمبر 15 سے قبل اس آگ سے بچنے مجرم کے بچنے کی ہر قسم کی نفی ہے اور اس میں بھڑکتی آگ کا ذکر ہے جو کھال اتار دے گی اور لیل کی آیت نمبر 14 میں اس کا ذکر ہے اور اس سے اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ اس میں بد بخت ہی جائے گا جو اس جہنم کے طبقہ پر ہی دال ہے۔نہ صرف وجود کا اضطراب جو ابن عربی نے کہا ہے۔

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 410/2

3۔ حطمہ:

حطمہ یہ جہنم کے ایک دروازے کا نام ہے قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر موجود ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِي ٱلۡحُطَمَةِ وَمَآ أَدۡرَىٰكَ مَا ٱلۡحُطَمَةُ﴾ [1]

(ہر گز نہیں وہ یقیناً حطمہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ حطمہ کیا ہے)

حطمہ کی وضاحت میں علامہ سیوطی نقل فرماتے ہیں۔

"الحطمة بَاب من أَبْوَاب جَهَنَّم"[2]

(حطمہ جہنم کے دروازے کا نام ہے)

اس کی وضاحت میں مزید قرآن مجید میں ہے۔

﴿ نَارُ ٱللَّهِ ٱلۡمُوقَدَةُ ٱلَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى ٱلۡأَفۡـِٔدَةِ﴾ [3]

(یہ اللہ کی آگ ہے خوب بھڑکائی ہوئی جو دلوں تک جا پہنچے گی)

اس کی وضاحت میں علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث رقم کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جن لوگوں کو جہنم کے اس حصہ میں ڈالا جائے گا ان کے ساتھ فرشتے یہ سلوک کریں گے۔

"إن الْمَلَكَ لَيَأْخُذُ الْكَافِرَ فَيَكْسِرُهُ عَلَى صُلْبِهِ كَمَا تُوضَعُ الْخَشَبَةُ عَلَى الرُّكْبَةِ فَتُكْسَرُ ثُمَّ يُرْمَى به في النار"[4]

(بے شک فرشتہ کافر کو پکڑے گا اور اس کی پشت سے اس کو توڑے گا جیسے تم اپنے گھٹنے پر لکڑی کو توڑتے ہو پھر اس کو جہنم میں پھینک دے گا)

جہنم کے اس حصہ میں جانے والے کے ساتھ ایسا نفرت آمیز سلوک کیا جائے گا اور مزید حطمہ کی وضاحت میں علامہ سیوطی فرماتے ہیں۔

"تَأْكُل كل شَيْء مِنْهُ حَتَّى تَنْتَهِي إِلَى فُؤَاده فَإِذا بلغت فُؤَاده ابتدئ خلقه"[5]

1۔الھمزہ:4۔5

2۔ السیوطی ، **الدرالمنثور**625/8

3۔ الھمزہ:6۔7

4۔الرازی ، **مفاتیح الغیب**285/32

5۔السیوطی ، **الدرالمنثور**625/8

(آگ ان کی ہر چیز کھاجائے گی یہاں تک کہ ان کے دلوں تک پہنچ جائے گی جب دل تک پہنچے گی تو دوبارہ ان کی تخلیق ہو جائے گی)

یہی سزا اس جہنم میں رہنے والوں کی ہو گی کہ بار بار ان کو جہنم کی آگ جلاتی رہے گی اور بار بار وہ دوبارہ تخلیق ہوتے رہیں گے۔

الحطمة التی عادتها کسر کل ماوقع فی رتبتها باستیلاء قوتها علیه وہی النار الروحانیة المنافیة لجوہر القلب لمؤلمة له ایلاء لا یوصف کنہه المستعلیة علیه النافذة فی اشرف وجهه وباطنه واعلاالذی هو الفؤاد المتصل الروح [1]

یہ وہ حطمہ ہے جو اس پر اپنی قوت کے غلبہ کے ساتھ اپنے رتبہ میں واقع ہونے والے ہر عمل کو توڑنے کی طرف لوٹتی ہے اور یہ جوہر قلب کو آلام سے درد دینے والی آگ کے منافی روحانی آگ ہے اس کی کنہ کو روح کے ساتھ متصل فواد کی بلندی اور اس کے باطن کے اسرار اس کے اشرف چہرے میں نافذ غالب اس کی کنہ سے موصوف نہیں ہے۔

حطمہ کی وضاحت میں ابن عربی کہتے ہیں ایک تو یہ آگ بہت سخت اور شدید ہے یہ اپنے احاطہ میں ہونے والی ہر تبدیلی کو مغلوب کر کے اس پر غالب آجاتی ہے اور انسان زندگی میں درد کی دو اقسام بتاتے ہیں ایک سے انسان کا دل درد محسوس کرتا ہے اور دوسرے سے روح متاثر ہوتی ہے ابن عربی کہتے ہیں کہ حطمہ سے روح شدت کی تکلیف محسوس کرتی ہے روح یہ فواد سے متصل ہوتی ہے فواد یہ دل کی ایک کیفیت ہے مگر یہ درد دل کے باہر والے حصہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کے باطن سے تعلق رکھتا ہے۔

ابن عربی حطمہ سے جہنم کا کوئی وہ مطلب مراد نہیں لیتے جو تفسیر بالماثور میں مذکور ہے بلکہ صاحب تفسیر ابن عربی اس سے روح کی تکلیف مراد لیتے ہیں۔

اگر سورہ ھمزہ کی آیات کا سیاق وسباق دیکھا جائے تو یہ بھی جہنم کے طبقہ پر ہی دلالت کرتی ہیں اس کی آیت نمبر 4 میں اس آگ کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ وہ روند ڈالے گی اور دسری آیت میں صورت بیان کی بیان ک گئی ہے کہ وہ بھڑکتی ہوئی ہے اور جو دلوں پر چڑھ جائے گی تو اس سے مراد جہنم کی آگ ہی ہے اور اس کا طبقہ۔

4۔ سقر:

1۔ ابن عربی، **تفسیر ابن عربی** 2/429

جہنم کے ایک طبقہ کا نام سقر ہے قرآن مجید میں یہ لفظ کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا۔

﴿يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي ٱلنَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُواْ مَسَّ سَقَرَ﴾[1]

(اس دن ان کو گھسیٹا جائے گا آگ میں منہ کے بل (انہیں کہا جائے گا) اب چکھو آگ میں جلنے کا مزہ)

سقر کے بارے میں مختلف اقوال ہیں کہ یہ جہنم کے کون سے طبقہ کا نام ہے اس بارے میں دو اقوال ہیں ایک قول حضرت عبداللہ بن عباس س ہے آپ فرماتے ہیں۔

﴿"سَقَرَ اسْمٌ لِلطَّبَقَةِ السَّادِسَةِ مِنْ جَهَنَّمَ﴾"[2]

(سقر جہنم کے چھٹے طبقہ کا نام ہے)

اور دوسری روایت علامہ طبری نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے۔

{سَأُصْلِيهِ} سأدخله فِي الْآخِرَة يَعْنِي الْوَلِيد بن الْمُغيرَة {سَقَرَ} وَهُوَ الْبَاب الرَّابِع سَقَرُ فإنها اسم باب من أبواب جهنم[3]

(عنقریب اسے آخرت میں جہنم میں داخل کیا جائے گا یعنی ولید بن مغیرہ کو "سقر" یہ جہنم کا چوتھا دروازہ ہے)

جہنم کے اس طبقہ میں کون داخل ہوں علامہ طبری محمد بن کعب القرظی سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا

مَا" نزلت هَذِه الْآيَة إِلَّا تعييراً لأهل الْقدر {ذوقوا مس سقر إِنَّا كل شَيْء خلقناه بِقدر"[4]

(یہ آیت اہل قدر کی تعبیر میں نازل ہوئی چکھو تم جہنم کا عذاب ہم اپنی تخلیق پر قدرت رکھتے ہیں)

اہل قدر سے مراد جو تقدیر کا انکار کرتے ہیں اور اس کے علاوہ حضرت حذیفہ بن یمان سے مروی ہے نبی رحمت ﷺ نے فرمایا یہ میری امت کے مجوس ہیں اور ان کے لیے وعید فرمائی۔

" إِن لكل أم مجوساً وَإِن مجوس هَذِه الْأمة الَّذين يَقُولُونَ لَا قدر فَمن مرض فَلَا تعوده وَإِن مَاتَ فَلَا تشهدوه وهم من شيعَة الدَّجَّال حق على الله أَن يلحقهم بِهِ "[5]

1۔ القمر:48

2۔الرازی ،**مفاتیح الغیب** 707/30

3۔ الطبری ،**جامع البیان**604/22

4۔ایضاً685/6

5۔السیوطی ، **الدرالمنثور**686/7

(ہر امت کے مجوس ہوتے ہیں اور میری امت کے مجوس وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ تقدیر کچھ نہیں ہے پس اگر ان میں سے کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کو نہ جاؤ اگر مر جائے تو اس کے جنازہ میں نہ جاؤ یہ دجال کے لشکر میں سے ہوں گے اور ان کا اللہ پر حق یہی ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ ان سے ملادے)

حضرت عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے کہ اس طبقہ میں جو جہنمی ہوں گے ان کی حالت کیا ہو گی فرماتے ہیں۔

"من النَّار {لَا تُبْقِي} لَهُم لَحْمًا إِلَّا أَكلته {وَلَا تَذَرُ} إِذا أعيدوا خلقا جَدِيدا أكلتهم "[1]

(جہنم کی آگ ان کے جسم پر گوشت نہیں چھوڑے گی سب کھا جائے گی اور جب چھوڑے گی وہ نئے سرے سے پیدا ہوں گے اور جہنم پھر کھا جائے گی)

جہنم کے اس طبقہ میں تقدیر کے منکر جائیں گے ان کو سزا یہ ہو گی کہ جہنم کی آگ ان کا گوشت کھا جائے گی اور جب ان کا سارا گوشت جل جائے گا ان کو نئے سرے سے مکمل کیا جائے گا اور مسلسل اس عذاب میں ہی وہ مبتلا رہیں گے۔

اس طبقہ کے بارے میں تفسیر ابن عربی میں کوئی وضاحت نہیں اور آیات کا سیاق وسباق بھی اس پر دلالت کرتا ہے لفظ سقر سورہ القمر کی آیت نمبر 48 میں آیا ہے اس آیت کا ابتدائیہ بھی ایسے مفہوم پر مشتمل ہے جس دن آگ میں منہوں کے بل گھسیٹے جائیں گے اس دن ان کو کہا جائے سقر کی کی آگ کا مزہ چکھو تو یہ بھی جہنم کا ہی طبقہ ہے۔

5۔ سعیر:

سعیر یہ جہنم کا نام ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

﴿كَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لِّتُنذِرَ أُمَّ ٱلْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ ٱلْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ فَرِيق فِي ٱلْجَنَّةِ وَفَرِيق فِي ٱلسَّعِيرِ﴾[2]

(اور یونہی ہم نے وحی کے ذریعے اتارا ہے آپ کی جانب قرآن عربی زبان میں تاکہ آپ ڈرائیں اہل مکہ کو اور جو اس کے آس پاس آباد ہیں اور آپ ڈرائیں اکٹھے ہونے کے دن سے جس کی آمد میں کچھ شبہ نہیں ہے اس دن ایک جنت میں اور دوسرا بھڑکتی آگ میں ہو گا)

اس آیہ مقدسہ میں سعیر کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کی وضاحت میں علامہ طبری فرماتے ہیں۔

" (وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ) يقول: ومنهم فريق في الموقدة من نار الله المسعورة على اهلها"[3]

اور ایک فرق جہنم میں ہو گا اور ان میں ایک فریق بھڑکتی ہوئی اللہ کی آگ میں جو اپنے میں موجود کو جھلسا رہی ہو گی)

1۔ ابن عباس، **تنویر المقیاس** 492

2۔ الشوریٰ: 7

3۔ الطبری **جامع البیان** 503/21

جہنم کے اس حصہ کی آگ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی ہو گی جو اپنے میں موجود ہر شئ کو جھلسادے گی اور یہ جہنم کا طبقہ کن کا ٹھکانا ہو گا اس کی وضاحت میں ابن عباس فرماتے ہیں۔

"{فِي السعير} فِي نَار الْوقُود وهم الْكَافِرُونَ"[1]

(سعیر میں آگ میں ڈالے جائیں گے جو کافر ہوں گے)

سعیر بھڑکتی آگ کے شعلوں میں یہ سیاہی مائل سفید ہوتے ہیں اور ان سے شعلے بھی نکل رہے ہوتے ہیں ایک وہ شعلے ہوتے ہیں جن کے ساتھ دھواں ہوتا ہے مگر ایک حدت کی شدت کے باعث انگاروں سے شعلے نکلتے ہیں اس کی وضاحت میں علامہ آلوسی فرماتے ہیں۔

" المسعرة المشعلة في الآخرة بعد الإحراق في الدنيا بالشهب، ولا يمنع من ذلك أنهم خلقوا من نار لأنهم ليسوا نارا فقط بل هي أغلب عناصرهم فهي منهم كالتراب من بني آدم فيتأثرون من ذلك على أنه تكون نارا أقوى من نار"[2]

مسعرۃ یہ دنیا میں آگ کے جلنے کے بعد سیاہی مائل سفید صورت میں شعلے ہیں اور یہ منع نہیں کرتا کہ وہ آگ سے تخلیق ہوئے ہیں کیونکہ وہ فقط آگ نہیں ہیں بلکہ اس میں بہت سے عناصر شامل ہیں جیسے مٹی بنی آدم سے پس اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ آگ دنیا کی آگ سے زیادہ سخت ہے

جہنم کی یہ قسم ایسی آگ پر مشتمل ہے جس میں مختلف اجزاہوں گے اور ہر جزو آگ کی حدت اور حرارت میں اضافہ کرے گا۔ جہنم کی یہ قسم کافروں کے لیے بنائی گئی ہے۔

جہنم کے اس طبقہ کی وضاحت میں بھی ابن عربی نے خاموشی اختیار کی ہے اور سیاق وسباق آیات بھی جہنم کے طبقہ پر ہی دلالت کرتا ہے کیونکہ اس آیت کے پہلے حصہ میں جنت کا ذکر ہے جو ایمان والوں پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا جہنمیوں پر

۔

6۔ جحیم:

جحیم جہنم کے ایک طبقہ اور درک کا نام ہے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر موجود ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿ إِنَّآ أَرۡسَلۡنَٰكَ بِٱلۡحَقِّ بَشِيرا وَنَذِيراۖ وَلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ أَصۡحَٰبِ ٱلۡجَحِيمِ﴾[3]

(بے شک ہم نے بھیجا آپ کو (حبیب ﷺ) حق کے ساتھ (رحمت کی) خوشخبری دینے والا (عذاب سے)

1۔ ابن عباس، **تنویر المقیاس** 406

2۔ الآلوسی، **روح المعانی** 15/11

3۔ البقرۃ:119

ڈرانے والا اور آپ سے باز پرس نہیں ہو گی ان دوزخیوں کے متعلق) جحیم کی وضاحت سے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں"

الْجَحِيم مَا عظم من النَّار"[1]

(جحیم بہت بڑی آگ ہے)

علامہ طبری فرماتے ہیں۔

"الجحيم": ما اشتدّ حرُّه من النار، وهو"الجَاحِم"[2]

(جحیم جہنم کی شدید گرمی ہے اور وہ جہنم کا وہ مقام ہے جو جہنم کے وسط میں انتہائی گرم ہے)

اس کی وضاحت میں علامہ طبری مزید فرماتے ہیں

"وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ نزل من حميم قد أغلي حتى انتهى حرّه، فهو شرابه. (وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ) يقول: وحريق النار يحرق بها"[3]

(داخل ہونا پڑے گا جہنم میں جہاں گرم پانی سے ان کی میز بانی ہو گی جو گاڑھا اور کھولتا ہو گا جو پینے کو ملے گا (جہنم میں ڈالا جائے گا) وہ کہے گا جلانے والی آگ اسے جلادے گی)

یہ مقام جہنم کا انتہائی گرم مقام ہے جو جہنم کے وسط میں ہے اس مقام میں ڈالے جانے والے لوگوں کی میز بانی کھولتے ہوئے گرم اور گاڑھے پانی سے ہو گی اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس پانی میں جہنمیوں کی غلاظت شامل ہو گی وگرنہ پانی جتنا ابال لیں وہ کبھی گاڑھا نہیں ہوتا جب تک اس میں کوئی اور چیز شامل نہ ہو۔

تفسیر ابن عربی میں جحیم پر بات نہیں کی اور سیاق آیات جہنم کے طبقہ پر ہی دلیل ہے اور اس کی وضاحت آحادیث سے ہو جاتی ہے۔

7۔ھاویہ:

قرآن مجید میں صرف ایک مقام پر ھاویہ کا لفظ استعمال ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿فَأُمُّهُ هَاوِيَة﴾[4] (پس اس کا مقام ھاویہ ہے)

1۔السیوطی ، **الدرالمنثور** 271/1

2۔ الطبری ، **جامع البیان** 513/10

3۔ ایضاً 163/23

4۔القارعہ :9

ھاویہ کی وضاحت میں علامہ سیوطی حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل فرماتے ہیں۔

" {فأمه هاوية} قَالَ: مصيره إِلَى النَّار وَهِي الهاوية"[1]

(ان کی منزل ھاویہ ہے یعنی آگ میں پہنچنا وہی ھاویہ ہے)

علامہ سمرقندی فرماتے ہیں کہ اس کو امہ ھاویہ کیوں کہا گیا ہے اس کی وجہ بیان کرتے ہیں۔

"سميت الهاوية لأن الكافر إذا طرح فيها يهوي على هامته وإنما سميت أمه لأنه مصيره إليها ومسكنه"[2]

اس کا نام ھاویہ اس لیے رکھا گیا جب کافر کو اس میں ڈالا جائے گا تو اس کو اس کے مقام تک پہنچا دیا جائے گا اور امہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کیونکہ وہ اس کا ہمیشہ کا مسکن ہے)

اور امہ کی وضاحت میں مزید امام رازی فرماتے ہیں۔

أُمٌّ عَلَى سَبِيلِ التَّشْبِيهِ بِالْأُمِّ الَّتِي لَا يَقَعُ الْفَزَعُ مِنَ الْوَلَدِ إِلَّا إِلَيْهَا وَثَانِيهَا: فَأُمُّ رَأْسِهِ هَاوِيَةٌ فِي النَّارِ ذَكَرَهُ الْأَخْفَشُ وَالْكَلْبِيُّ وَقَتَادَةُ قَالَ: لِأَنَّهُمْ يهوون فِي النار على رؤوسهم وَثَالِثُهَا: أَنَّهُمْ إِذَا دَعَوْا عَلَى الرَّجُلِ بِالْهَلَاكِ قَالُوا: هَوَتْ أُمُّهُ[3]

(ام تشبیہ کی وجہ سے کہا گیا ہے کیونکہ بچے کی گھبراہٹ ماں کے پاس ہی دور ہوتی ہے اور دوسرا ان کے سر کی ام کا مقام ھاویہ ہے اخفش کلبی اور قتادہ نے کہا کیونکہ ان کو سر کے بل جہنم میں ڈالا جائے گا تیسرا جب کسی کو ہلاک ہونے کے لیے چھوڑا دیا جائے تو کہا جاتا تھا اس کی ماں ہلاک ہو گئی)

ھاویہ جہنم کا ایسا مقام ہے جہاں آگ کے انگاروں کے شعلے ہیں اور اس کو امہ ھاویہ اس وجہ سے کہا گیا کہ ماں کے پاس اولاد اور بچے کی سب پریشانی کا حل اور بے اطمنانی کا سکون ہوتا ہے اور لوٹ کر ہر طرف سے اس کے پاس آتا ہے مگر جو ھاویہ میں جائے گا اس کی ابتداء بھی یہیں سے ہو گی اور اس کی انتہا بھی یہیں پے ہو گی جیسے بچہ لوٹ کے اپنی ماں کے پاس آتا ہے ایسے ہی اس کو سکون ملے یا نہ ملے اس کا مقام ھاویہ ہی ہو گا۔

تفسیر بالماثور میں جہنم انسان کے برے اعمال کی سزا کے لیے بنایا گیا ہے اس کے سات طبقات ہیں جن کو سات دروازوں سے ظاہر کیا گیا ہے جن میں لوگ اپنے اعمال کے مطابق جائیں گے اور ان کا ان میں رکنا اور ٹھہرنا دائمی ہو گا اس کا سب سے پہلا مقام جہنم اور سب سے آخری ھاویہ، ھاویہ میں لوگوں کو سروں کے بل ڈالا جائے گا اور ان کے لیے مایوسی ہے کہ وہ جہنم سے کبھی بھی نکل نہ سکیں گے۔

1۔ السیوطی، **الدرالمنثور** 606/8

2۔ السمرقندی **بحرالعلوم** 611/3

3۔ الرازی، **الکبیر** 268/32

تفسیر ابن عربی کی تعبیر مختلف ہے وہ کہتے ہیں۔

ماؤاہ قعر بئر جہنم الطبیعۃ الجسمانیۃ التی تھوی فیہا اھلہا [1]

اس کا ٹھکانہ طبیعت جسمانیہ کے جہنم کے گڑھے میں ہے جس میں اہل جہنم پڑے ہوں گے۔

ابن عربی اس ھاویہ سے مراد بھی طبع جسمانی کا ہی جہنم اور سزا مراد لیتے ہیں جب جمہور مفسرین اس سے جہنم کا حقیقی مقام مراد لیتے ہیں۔

جب سیاق وسباق آیات جہنم کی ہی خبر دیتا ہے قبل کی آیت میں ہے کہ جن کے اعمال وزنی ہوں گے وہ ہمیشہ کی عیش میں ہوں گے اور جن کے اعمال کم وزنی ہوں گے وہ جہنم میں جائیں گے اور وہ بھڑکتی آگ ہے۔

تفسیر بالماثور میں جہنم زمین کے درکات میں سات درکات ہیں جس میں مخصوص افراد اپنے مخصوص اعمال کی وجہ سے جائیں گے یہ جہنم مختلف قسم کی آگ سے تیار کی گئی ہے انسان کے برے اعمال اور عقائد اس کے لیے اس میں جانے کا باعث بنیں گے۔ جب کہ تفسیر اشاری میں جہنم کا سبب برے اعمال ہی ہیں مگر یہ کوئی الگ سے چیز نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی اپنی ذات میں اس کے نفس کا اضطراب ہے جس قدر اس کے برے کے اعمال ہوں گے اس قدر اس کے وجود میں بے سکونی ہو گی کیونکہ سکون اس وقت ہے جب انسان کا تعلق عالم انوار سے ہے مگر نفس جب ایسے اعمال میں مصروف ہے جو سفلی اور نفسانی ہیں تو اس کا رابطہ عالم امر سے کٹ جاتا ہے اور انسان اس دنیا میں کھو جاتا ہے تو اس کا اضطراب بڑھ جاتا ہے جس کو ابن عربی جہنم سے تعبیر کرتے ہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

نتائج تحقیق:

تحقیق ہذا سے جو نتائج حاصل ہوئے ان کو بالترتیب درج کیا جاتا ہے۔

1۔ تفسیر القرآن ایسا علم ہے جو نبی رحمت ﷺ خود بھی فرماتے اور صحابہ کو تعلیم بھی دیتے اور ان کے لیے دعا بھی کرتے جیسے آپ ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن عباس کے لیے دعا فرمائی یا اللہ میرے چچا کے بیٹے کو قرآن مجید کا علم عطا فرماز

2۔ تفسیر القرآن میں سب سے اعلیٰ تفسیر القرآن بالقرآن ہے پھر تفسیر القرآن بالحدیث ہے پھر تفسیر القرآن باقوال صحابہ ہے اس کے بعد اقوال تابعین ہیں اس کے بعد بہت سے اصول وضوابط ہیں جن کا علم ہونا ضروری ہے جس کی تفصیل دے دی گئی ہے۔

1۔ ابن عربي، **تفسیر ابن عربي** 424/2

3۔ تاریخ تفسیر میں یہ بات بھی تحقیق ہذا میں واضح کی گئی ہے کہ تفسیر القرآن کے باقاعدہ صحابہ نے مکاتب قائم کیئے جن میں مکہ میں عبداللہ عباس نے مدینہ میں ابی ابن کعب نے اور کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود نے جس کے بعد تابعین نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔

4۔ یہ بات بھی ثابت ہوئی ہے کہ سب صحابہ مفسر قرآن نہیں تھے بلکہ صحابہ کی ایک مخصوص تعداد تفسیر القرآن میں دلچسپی رکھتے تھی اور ان کو دوسرے صحابہ سے زیادہ دسترس بھی حاصل تھی جس کی واضح مثال سیدنا فاروق اعظم نے متعدد بار عبداللہ بن عباس سے تفسیر سے متعلق سوال کیا۔

5۔ تفسیر اشاری پر بحث میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کی بنیادیں نبی رحمت ﷺ کے زمانہ مبارک میں ہی موجود تھیں اور نبی رحمت ﷺ خود اس کی تائید بھی کرتے اور دور صحابہ بھی ایسی تعبیرات کرتے جن کی روایت خود صحابہ کرام فرماتے۔

6۔ اس تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تفسیر اشاری کی پہلی مکمل تفسیر تفسیر القرآن العظیم سہل بن عبداللہ تستری کی ہے جو تیسری صدی ہجری میں مکمل ہوئی۔

7۔ تفسیر اشاری کو قبولیت عامہ حاصل نہیں ہے البتہ اس کی شرائط ہیں اور مفسر تفسیر اشاری کے بھی کچھ اصول ہیں جو تفسیر بالماثور کے اصولوں کے علاوہ ہیں اگر تفسیر اس پر پوری اترتی ہے تو قابل قبول ہے ورنہ نہیں۔

8۔ جب کبھی تفسیر اشاری اور بالماثور میں اختلاف ہو تو تفسیر بالماثور کو ترجیح حاصل ہوتی ہے کیونکہ تفسیر بالماثور روایت اور درایت کے مطابق ہے جبکہ تفسیر اشاری اکثر کسی کی ذاتی رائے ہوتی ہے اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ قرآن مجید کے سیاق اور ظاہری مفہوم سے نہ ٹکرائے۔

9۔ تفسیر اشاری کی ایک باقاعدہ تاریخ ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا جس میں تفسیر باطنی بھی شامل ہے۔

10۔ تفسیر ابن عربی دوسری تفاسیر سے بالکل منفرد ہے یہ تقریباً ساری ابن عربی کے اپنے منکشفات اور آرا پر مبنی ہے اس کی بہت سی آیات کی تفسیر بالماثور اور اشاری تفاسیر سے بہت مختلف ہے جیسا کہ واقعہ سلیمان میں جن سے مراد وہم، موسیٰ علیہ السلام سے قلب اور فرعون سے نفس امارہ اور اس طرح کی کتنی امثلہ ہیں جن کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ان کی دلیل بھی سوائے ابن عربی کی ذات اور کوئی نہیں۔

11۔ یہ تحقیق کیونکہ عقائد سے متعلق ہے تو عقیدہ توحید کی وضاحت سے اس کا آغاز کیا گیا ہے جس میں اس کائنات کا خالق مالک اور معبود ایک اس کا ہم مثل کائنات میں دوسرا نہیں ہے جبکہ ابن عربی کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ اس کائنات میں دوسرا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ابن عربی اس کائنات کی تحریک کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے منسوب کرت ہیں۔

12۔ تفسیر بالماثور کے مطابق انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی نعمتوں کی وجہ سے کرنی چاہیئے کیونکہ انسان کو سب نعمتیں اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں جبکہ ابن عربی کہتے ہیں نعمتیں عبادت کی وجہ نہیں بلکہ عبادت کی وجہ وہ محبت ہے جو ان نعمتوں کے پیدا کرنے کا سبب بنی ہے۔

14۔ ابن عربی توحید کی کئی اقسام بیان کرتے ہیں توحید ذات، توحید صفات، توحید افعال یہ سب مقامات انسان کو اپنی صفات بدلنے پر عمل کرنے پر اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے پر ملتے ہیں۔

15 ۔عقیدہ وحدۃ الوجود کی وضاحت ابن عربی نے اپنی کتاب فصوص الحکم میں فص آدمیہ کے تحت لکھی ہے جس میں اس کائنات کو جسم اور ذات باری تعالیٰ کو اس کی روح قرار دیتے ہیں اس کی وضاحت اس مثال بخوبی ہوتی ہے جیسے موبائل کے سگنل کا تعلق ایک نیٹ ورک سے ہے اس کے بغیر اس موبائل کی کوئی حیثیت نہیں ایسے اہی اس کائنات کو جو پہلو اللہ کی تجلی کے ربط میں ہے اسی کی وجہ سے اس کائنات کی حرکت ہے یہی ان کا نظریہ وحدۃ الوجود ہے۔

16۔ مستشرقین نے ابن عربی کے اس عقیدہ کو قدیم ایرانی فلسفہ مجوسیت سے ماخوذ قرار دیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اسلام کے عقیدہ توحید پر بہت بڑا حملہ ہے۔

18۔ وحی اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے جو بندوں کو ملتا ہے وحی کی قرآن وحدیث میں متعدد اقسام بتائی گئی ہیں اور یہ لفظ اپنے لغوی اور اصطلاحی دونوں معانی میں استعمال ہوا ہے اور اصطلاحی ایسا کلام ہے جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کے ساتھ خاص ہے جس کا مقصد انسانیت کی ہدایت ہے باقی اصطلاحی وحی وہ انسان نبی غیر نبی شہد کی مکھیوں حتیٰ کہ شیاطین کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

19۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ وحی کے حصول کے لیے انسان کی روحانی ترقی بہت ضروری ہے جب انسان کا دل افق اعلیٰ تک پہنچ جاتا ہے تو وہ وحی کے قابل ہو جاتا ہے۔

20۔عقید رسالت کے تحت یہ تحقیق ابن عربی اور جمہور کے نزدیک اس بات کو ثابت کرتی ہے انبیاء اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے افراد جو انسانیت کی بھلائی کے لیے کتاب اور احکام لے کر آتے ہیں اور رسول معصوم ہوتا ہے اور اسے اس کے قبیلہ کی جانب بھیجا جاتا ہے تاکہ لوگ اعتراض نہ کر سکیں کہ ہم اسے جانتے نہیں جبکہ ابن عربی کہتے ہیں کہ نبی رسول میں

فرق ہوتا ہے نبی صاحب عرفان ہوتا ہے اور رسول صاحب عرفان ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب احکام بھی ہوتا ہے اور نبیوں میں کچھ نبی اللہ کے ولی ہوتے ہیں تو نبیوں میں یہ بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں۔

21۔ ایک اور بہت ہی منفرد بات بھی ابن عربی کی سامنے آئی ہے جو تحقیق ہذا کا حصہ ہے ابن عربی کہتے ہیں ایک رسول شریعت ہوتا ہے اور ایک رسول عقل یعنی عقل کو ماننے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ دیتا ہے جیسے نبیوں کو احکام دے کر بھیجتا عقل کو تسلیم کی توفیق دیتا ہے تو عقل بھی رسول ہوتی ہے مگر یہ فلسفہ ابن عربی کا اپنا ہے۔

22۔ ابن عربی کے نزدیک جو معرفت رسول سے محروم ہوتا وہ معرفت ربانی سے بھی محروم ہوتا ہے اگر اس کو معرفت خدا حاصل ہوتی تو یہ کبھی بھی اللہ کے رسول کا انکار نہ کرتا کیونکہ انبیاء کو بھی تو اللہ نے ہی بھیجا ہے۔

23۔ انبیاء کا غضب ابن عربی کہتے ہیں غضب الٰہی ہوتا ہے جیسے سامری کو موسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے سزا ملی کہ وہ لوگوں کو کہتا تھا مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔

24۔ تحقیق ہذا سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی نوری مخلوق ہیں افلاک ان کا مسکن ہے یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے سکون اور عذاب کا باعث ہیں مؤمنین کے معاون جیسے غزوہ بدر اور باقی غزوات میں ہوا یہ سراپا خیر ہیں اور طاقتور اتنے کہ کوئی بھی مخلوق ان کو اپنے کاموں کی انجام دہی سے روک نہیں سکتی فرشتوں کی ایک قسم روح ہے جو فرشتوں کو بھی دکھائی نہیں دیتے یہ اللہ تعالیٰ کا پیغام انبیاء کی جانب لاتے ہیں جبکہ ابن عربی کے نزدیک آسمانوں کی روح اور نفوس ہیں جبرائیل عقل فعال ہیں میکائیل چھٹے آسمان کی روح ہیں اسرافیل چوتھے آسمان کی روح ہیں اور عزرائیل ساتویں آسمان کی ورح ہیں۔

25۔ تقدیر سے متعلق تحقیق ہذا سے واضح ہوا کہ اس کو ماننا ایمان کا حصہ ہے اس کا منکر کافر ہے تقدیر کی کئی اقسام ہیں اور تقدیر بدلتی ہے جس کی دلیل کعب احبار کی روایت ہے کہ اگر تقدیر بدلتی نہ ہوتی تو میں تمہیں سب بتا دیتا اور تقدیر کے بدلنے کی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ دعا کرتے ابن عربی کے نزدیک تقدیر کی اچار اقسام ہیں لوح اول، لوح قضا السابق، لوح محیولیٰ اور نہاں ہے یعنی جو بطن مادر میں لکھی جاتی ہے۔ ایک قسم سب کے متعلق اتفاق ہے کہ وہ بدلتی نہیں ابن عربی کے نزدیک کفر اور ایمان بھی اسی کا حصہ ہے۔

25۔ عقیدہ آخرت سے متعلق توضیحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ عقیدہ ہی اسلام کا ایسا عقیدہ ہے جو زندگی حدود و قیود میں گزارنے پر انسان کو مجبور کرتا ہے اس کا آغاز قیامت سے ہوگا اور قیامت کی علامات کبریٰ دس ہیں شق قمر، دخان سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دابۃ الارض کا نکلنا، ظہور مہدی، تین مقامات پر خسف اور آگ کا نکلنا جو لوگوں کو میدان

محشر میں جمع کرے گی۔ ان سب کے دلائل موجود ہیں اور سیاق کلام ان کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ مگر ابن عربی ان سب کی توجیہ اپنے انداز میں کرتے ہیں ابن عربی کہتے ہیں دخان کوئی حقیقت نہیں بلکہ موت کی سختی ہے اور سورج کا مغرب سے طلوع ہونا یہ انسان کی ایمان سے محرومی ہے یاجوج ماجوج برے وہم خیالات اور وساوس ہیں دابۃ الارض جسم کی بری تبدیلیاں ہیں جو گناہوں کی وجہ سے ہیں مہدی یا تو عیسیٰ ہیں یا ختم ولایت ان پر ہو گی بقیہ علامات پر ابن عربی نے بات نہیں کی۔

26۔ جہنم کے سات درکات ہیں جہنم، لظیٰ، حطمہ، سقر، سعیر، جحیم، ھاویہ جہنم مقام سزا ہے لظی دوسرا طبقہ ہے جو خالص انگاروں کا گھر ہے مگر ابن عربی اسے طبیعیہ سفلیہ کی آگ کہتے ہیں حطمہ بھڑکتی آگ ہے ابن عربی کہتے ہیں کہ یہ روح سے متصل آگ کی ایک قسم ہے سقر یہ جہنم کا چھٹا طبقہ ہے اس میں ولید بن مغیرہ رہے گا اور تقدیر کے منکر، جحیم جہنم کا وسط ہے اور ھاویہ یہ مرجع ہے بدکردار کا جبکہ ابن عربی ان سات طبقات کی توجیہ الگ کرتے ہیں کہ یہ حواس خمسہ شہوات اور غضب کی آگ ہے۔

سفارشات

1۔ مقالہ ہذا میں عقائد سے متعلقہ وضاحت کر دی گئی ہے جیسا کہ ابن عربی کی زبان بہت پیچیدہ ہے تو اور بہت سے عنوانات بھی ہیں جن پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

2۔ ابن عربی کی زبان بہت پیچیدہ ہے اور تصوف سے متعلق ہے تو اصطلاحات تصوف اور تفسیر ابن عربی کی تشریحات پر تحقیق ہو سکتی ہے۔

3۔ ابن عربی صوفی ہونے کے ساتھ ایک فلسفی بھی تھے تو ان کی صوفیانہ اور فلسفیانہ ابحاث کی تحقیق پر کام کی ضرورت ہے۔

4۔ عقائد کے علاوہ فقہی ابحاث سے متعلق تفسیر ابن عربی کی وضاحتوں کا کسی فقہی تفاسیر سے تقابل ہو سکتا ہے۔

5۔ تفسیر اشاری فیضی اور فلسفی دونوں کی جامع تفسیر ہے تو ان کی وضاحتوں کا تجزیہ ہو سکتا ہے۔

6۔ صوفیانہ اصطلاحات کی وجہ تسمیہ اور ابن عربی کا طرز استدلال کا تحقیقی مطالعہ بھی ایک مناسب تحقیقی موضوع ہے۔

فہرست آیات

نمبر شمار	آیات	سورۃ نام	آیت نمبر	صفحہ نمبر
1	ایاک نعبد	الفاتحه	4	45
	ٱهۡدِنَا ٱلصِّرَٰطَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ	الفاتحه	6	27
	وَإِلَٰهُكُمۡ إِلَٰه وَٰحِد لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا	البقره	163	77
2	وَٱلۡمُطَلَّقَٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَٰثَةَ قُرُوٓء	البقره	228	5
	قُلۡ مَن كَانَ عَدُوّا لِّجِبۡرِيلَ فَإِنَّهُۥ نَزَّلَهُۥ عَلَىٰ	البقره	97-98	130
3	فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوۡ عَلَىٰ سَفَر فَعِدَّة مِّنۡ أَيَّامٍ	البقره	185	6
	ٱلزَّانِيَةُ وَٱلزَّانِي فَٱجلِدُواْ كُلَّ وَٰحِد مِّنۡهُمَا مِاْئَةَ جَلۡدَة	البقره	228	6
4	إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ ٱلۡمَيۡتَةَ وَٱلدَّمَ وَلَحۡمَ ٱلۡخِنزِيرِ	البقره	173	7
5	وَلَيۡسَ ٱلۡبِرُّ بِأَن تَأۡتُواْ ٱلۡبُيُوتَ مِن ظُهُورِهَا	البقره	189	14
6	وَلَقَدۡ ءَاتَيۡنَا مُوسَى ٱلۡكِتَٰبَ وَقَفَّيۡنَا مِنۢ بَعۡدِهِ	البقره	87	26
7	من ذالذی یشفع عنده الا باذنه	البقره	255	45
8	وَإِذِ ٱسۡتَسۡقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوۡمِهِۦ فَقُلۡنَا ٱضۡرِب بِّعَصَاكَ ٱلۡحَجَرۖ فَٱنفَجَرَتۡ مِنۡهُ ٱثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡنٗاۖ	البقره	60	52
9	وَإِلَٰهُكُمۡ إِلَٰه وَٰحِد لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا	البقره	163	77-78
10	يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعۡبُدُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُمۡ وَٱلَّذِينَ مِن	البقره	21	96
11	يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعۡبُدُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُمۡ وَٱلَّذِينَ مِن	البقره	21	80
12	فَلَا تَجۡعَلُواْ لِلَّهِ أَندَاداً وَأَنتُمۡ تَعۡلَمُونَ	البقره	222	97
13	وَلَمَّا جَآءَهُمۡ رَسُول مِّنۡ عِندِ ٱللَّهِ	البقره	101	111
14	لَّيۡسَ ٱلۡبِرَّ أَن تُوَلُّواْ وُجُوهَكُمۡ قِبَلَ ٱلۡمَشۡرِقِ وَٱلۡمَغۡرِبِ	البقره	177	123
15	قُلۡ مَن كَانَ عَدُوّا لِّجِبۡرِيلَ فَإِنَّهُۥ نَزَّلَهُۥ عَلَىٰ قَلۡبِكَ	البقره	97-98	130

17	وَإِذَا قِيلَ لَهُ ٱتَّقِ ٱللَّهَ أَخَذَتْهُ ٱلْعِزَّةُ بِٱلْإِثْمِ فَحَسْبُهُ	البقره	206	203
18	إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرا وَنَذِيراۖ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَٰبِ ٱلْجَحِيمِ	البقره	119	224
19	إِن تَصْبِرُواْ وَتَتَّقُواْ وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ ---	آل عمران	126-125	122
20	لِيَقْطَعَ طَرَفا مِّنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓاْ أَوْ يَكْبِتَهُمْ	آل عمران	127	123
21	وَسَارِعُوٓاْ إِلَىٰ مَغْفِرَة مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلْأَرْضُ	آل عمران	186	133
22	كُلُّ نَفْس ذَآئِقَةُ ٱلْمَوْتِۗ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْۖ	آل عمران	185	150
23	۞ مَأْوَىٰهُمْ جَهَنَّمُۖ وَبِئْسَ ٱلْمِهَادُ	آل عمران	197	203
24	وَٱلَّٰتِي يَأْتِينَ ٱلْفَٰحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ فَٱسْتَشْهِدُواْ	النساء	6	15
25	وَٱبْتَلُواْ ٱلْيَتَٰمَىٰ حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغُواْ ٱلنِّكَاحَ فَإِنْ ءَانَسْتُم	النساء	6	7
26	إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيكَ ٱلكِتَٰبَ بِٱلحَقِّ لِتَحكُمَ بَينَ ٱلنَّاسِ بِمَآ	النساء	105	8
27	ٱلَّٰتِي يَأْتِينَ ٱلْفَٰحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ فَٱسْتَشْهِدُواْ عَلَيْهِنَّ	النساء	15	42
28	۞ أَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْس	النساء	1	91
29	وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ ٱللَّهِۚ	النساء	64	111
30	وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ ٱللَّهِ	النساء	64	113
31	إِنَّ ٱلَّذِينَ تَوَفَّىٰهُمُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمْ قَالُواْ فِيمَ	النساء	97	124
32	ٱلَّذِينَ تَتَوَفَّىٰهُمُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمْۖ	النساء	97	131
34	إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَداۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرا	النساء	169	204
35	فَمَنِ ٱضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍلِّإِثْمٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ	المائده	3	7

36	مَا جَعَلَ ٱللَّهُ مِنۢ بَحِيرَةٍوَلَا سَآئِبَة وَلَا وَصِيلَة وَلَا حَام	المائده	103	14
37	ٱلۡيَوۡمَ أَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِينَكُمۡ ---	المائده	3	29
38	قُل لَّا يَسۡتَوِي ٱلۡخَبِيثُ وَٱلطَّيِّبُ	المائده	100	63
39	لَوۡ أَعۡجَبَكَ كَثۡرَةُ ٱلۡخَبِيثِۚ	المائده	100	64
40	كُلَّمَا جَآءَهُمۡ رَسُولُۢ بِمَا لَا تَهۡوَىٰٓ أَنفُسُهُمُ	المائده	70	111
41	وَلَوۡ أَنَّ أَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ ءَامَنُواْ وَٱتَّقَوۡاْ لَكَفَّرۡنَا عَنۡهُمۡ سَيِّـَٔاتِهِمۡ	المائده	65	193
42	ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَلَمۡ يَلۡبِسُوٓاْ إِيمَٰنَهُم بِظُلۡمٍ أُوْلَٰٓئِكَ لَهُمُ ---	الانعام	82	5
43	وَلَا تَقۡرَبُواْ مَالَ ٱلۡيَتِيمِ إِلَّا بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ حَتَّىٰ	الانعام	152	7
44	۞مَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهۡدِيَهُۥ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهُۥ لِلۡإِسۡلَٰمِ	الانعام	126	55
45	وَمَن يُرِدۡ أَن يُضِلَّهُۥ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجاً---	الانعام	125	56
46	إِنۡ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّۖ	الانعام	51	100
47	وَكَذَٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوّا شَيَٰطِينَ ٱلۡإِنسِ	الانعام	112	106
48	وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إلا يَعْلَمُهَا وَلا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الأَرْضِ وَلا رَطْبٍ وَلا يَابِسٍ	الانعام	59	136
49	وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقا وَعَدۡلاۚ لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَٰتِهِ	الانعام	115	141
50	هَلۡ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأۡتِيَهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ أَوۡ يَأۡتِيَ رَبُّكَ أَوۡ يَأۡتِيَ بَعۡضُ	الانعام	158	150
51	هُوَ ٱلَّذِي يَتَوَفَّىٰكُم بِٱلَّيۡلِ وَيَعۡلَمُ مَا جَرَحۡتُم بِٱلنَّهَارِ ثُمَّ يَبۡعَثُكُمۡ	الانعام	60	165
52	قُلۡ إِنَّمَآ أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ مِن رَّبِّي	الاعراف	203	110
53	۞ٱلۡوَزۡنُ يَوۡمَئِذٍ ٱلۡحَقُّۚ فَمَن ثَقُلَتۡ مَوَٰزِينُهُۥ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُفۡلِحُون	الاعراف	8	175
54	لَّمَن تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ لَأَمۡلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكُمۡ أَجۡمَعِينَ	الاعراف	18	204
55	إِذۡ يُغَشِّيكُمُ ٱلنُّعَاسَ أَمَنَة مِّنۡهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيۡكُم مِّنَ	الانفال	11	11

56	فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَٰرَهُمْ	الانفال	50	125
57	لَّيْسَ عَلَى ٱلضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى ٱلْمَرْضَىٰ وَلَا عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنفِقُونَ	التوبه	91	34
58	لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُول مِّنْ أَنفُسِكُمْ	التوبه	128	116
59	ا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَن يَسْتَغْفِرُواْ لِلْمُشْرِكِينَ	التوبه	113	142
60	هُوَٱلَّذِيٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُۥ بِٱلْهُدَىٰ وَدِينِ ٱلْحَقِّ لِيُظْهِرَهُۥ	التوبه	33	158
61	يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَٰن وَجَنَّٰت لَّهُمْ فِيهَا نَعِيم مُّقِيمٌ	التوبه	21	193
62	وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتِ جَنَّٰت تَجْرِي مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ	التوبه	72	196
63	قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلْقَآيِ نَفْسِيٓ	يونس	15	102
64	وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ءَايَاتُنَا بَيِّنَٰت قَالَ ٱلَّذِينَ لَا	يونس	15	103
65	وَلِكُلِّ أُمَّة رَّسُول فَإِذَا جَآءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِٱلْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ	يونس	47	112
66	وَلِكُلِّ أُمَّة رَّسُول	يونس	47	116
67	وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ إِبْرَٰهِيمَ بِٱلْبُشْرَىٰ قَالُواْ سَلَٰمًا	هود	69	71
68	فَلَعَلَّكَ تَارِكُ بَعْضَ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيْكَ وَضَآئِقُ	هود	12	107
69	وَقَالَ نِسْوَة فِي ٱلْمَدِينَةِ ٱمْرَأَتُ ٱلْعَزِيزِ تُرَٰوِدُ فَتَىٰهَا عَن نَّفْسِهِۦ قَدْ شَغَفَهَا	يوسف	30	34
70	وَقَالَ نِسْوَة فِي ٱلْمَدِينَةِ ٱمْرَأَتُ ٱلْعَزِيزِ تُرَٰوِدُ فَتَىٰهَا عَن نَّفْسِهِۦ قَدْ شَغَفَهَا	يوسف	39	77
71	جَنَّٰتُ عَدْن يَدْخُلُونَهَا وَمَن صَلَحَ مِنْ ءَابَآئِهِمْ وَأَزْوَٰجِهِمْ وَذُرِّيَّٰتِهِمْ	الرعد	23	198
72	يَمْحُواْ ٱللَّهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِندَهُۥ أُمُّ ٱلْكِتَٰبِ	الرعد	39	137
73	فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُواْ لَهُۥ	الحجر	29	89
74	إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَواْ وَّٱلَّذِينَ هُم مُّحْسِنُون	النحل	128	57

75	ثُمَّ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ أَنِ ٱتَّبِعۡ مِلَّةَ إِبۡرَٰهِيمَ حَنِيفا وَمَا كَانَ	النحل	123	79
76	ٱلَّذِينَ تَتَوَفَّىٰهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَٰمٌ عَلَيۡكُمُ	النحل	32	130
77	يُنَزِّلُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةَ بِٱلرُّوحِ	النحل	2	132
78	وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبۡعَثَ رَسُول	الاسراء	15	118
79	فَتَهَجَّدۡ بِهِۦ نَافِلَةً لَّكَ عَسَىٰٓ أَن يَبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَاما مَّحۡمُودا	الاسراء	79	180
80	قُلۡ إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَر مِّثۡلُكُمۡ يُوحَىٰٓ إِلَيَ	الكهف	110	101
81	يُذَا ٱلۡقَرۡنَيۡنِ إِنَّ يَأۡجُوجَ وَمَأۡجُوجَ مُفۡسِدُونَ فِي ٱلۡأَرۡضِ	الكهف	94	153
82	إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ كَانَتۡ لَهُمۡ جَنَّٰتُ ٱلۡفِرۡدَوۡسِ نُزُلًا	الكهف	107	189
83	وَٱذۡكُرۡ فِي ٱلۡكِتَٰبِ مُوسَىٰٓۚ إِنَّهُۥ كَانَ مُخۡلَصا وَكَانَ	مريم	51	74
84	يَوۡمَ نَحۡشُرُ ٱلۡمُتَّقِينَ إِلَى ٱلرَّحۡمَٰنِ وَفۡدا وَنَسُوقُ ٱلۡمُجۡرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرۡدا	مريم	86	170
85	وَإِن مِّنكُمۡ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتۡمًا مَّقۡضِيًّا ثُمَّ ن	مريم	71	178
86	ٰتِ عَدۡنٍ ٱلَّتِي وَعَدَ ٱلرَّحۡمَٰنُ عِبَادَهُۥ بِٱلۡغَيۡبِۚ إِنَّهُ	مريم	61	199
87	وَأَنَا ٱخۡتَرۡتُكَ فَٱسۡتَمِعۡ لِمَا يُوحَىٰ	طه	13	105
88	ٰأَنَا ٱخۡتَرۡتُكَ فَٱسۡتَمِعۡ لِمَا يُوحَىٰٓ	طه	13	105
89	إِذۡ أَوۡحَيۡنَآ إِلَىٰٓ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰٓ أَنِ ٱقۡذِفِيهِ فِي	طه	38	105
90	ٱذۡهَبۡ أَنتَ وَأَخُوكَ بِـَٔايَٰتِي	طه	42	54
91	قَالَ فَٱذۡهَبۡ فَإِنَّ لَكَ فِي ٱلۡحَيَوٰةِ أَن تَقُولَ لَا مِسَاسۖ	طه	97	120
92	يَوۡمَئِذ يَتَّبِعُونَ ٱلدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ وَخَشَعَتِ ٱلۡأَصۡوَاتُ	طه	108	169
93	وَجَعَلۡنَا ٱلسَّمَآءَ سَقۡفا مَّحۡفُوظاۖ وَهُمۡ عَنۡ ءَايَٰتِهَا	الانبياء	32	5
94	وَلَقَدۡ ءَاتَيۡنَا مُوسَىٰ وَهَٰرُونَ ٱلۡفُرۡقَانَ وَضِيَآء وَذِكۡرا	الانبياء	48	62
95	قُلۡنَا يَٰنَارُ كُونِي بَرۡدا وَسَلَٰمًا عَلَىٰٓ إِبۡرَٰهِيمَ	الانبياء	69	68

96	لَوۡ كَانَ فِيهِمَآ ءَالِهَةٌ إِلَّا ٱللَّهُ لَفَسَدَتَا	الانبياء	22	78
97	وَلَقَدۡ كَتَبۡنَا فِي ٱلزَّبُورِ مِنۢ بَعۡدِ ٱلذِّكۡرِ أَنَّ ٱلۡأَرۡضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ ٱلصَّٰلِحُونَ	الانبياء	105	157
99	ٱقۡتَرَبَ ٱلۡوَعۡدُ ٱلۡحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَٰخِصَةٌ أَبۡصَٰرُ ٱلَّذِينَ	الانبياء	97	162
100	إِنَّمَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ أَنَّمَآ إِلَٰهُكُمۡ إِلَٰهٞ وَٰحِدفَهَلۡ	الانبياء	108	100
	ٱقۡتَرَبَ ٱلۡوَعۡدُ ٱلۡحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَٰخِصَةٌ أَبۡصَٰرُ ٱلَّذِينَ كَ	الانبياء	97	163
101	أَلَمۡ تَرَ أَنَّ ٱللَّهَ أَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآء فَتُصۡبِحُ ٱلۡأَرۡضُ	الحج	63	32
102	وَلَوِ ٱتَّبَعَ ٱلۡحَقُّ أَهۡوَآءَهُمۡ لَفَسَدَتِ ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلۡأَرۡضُ وَمَن	المومنون	71	87
103	ٱلَّذِينَ يَرِثُونَ ٱلۡفِرۡدَوۡسَ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ	المؤمنون	11	191
104	ٱلزَّانِيَةُ وَٱلزَّانِي فَٱجۡلِدُواْ كُلَّ وَٰحِد مِّنۡهُمَا مِاْئَةَ جَلۡدَة	النور	2	6
105	ٱلزَّانِيَةُ وَٱلزَّانِي فَٱجۡلِدُواْ كُلَّ وَٰحِدمِّنۡهُمَا مِاْئَةَ جَلۡدَة	النور	2	42
106	وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مِنكُمۡ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ	النور	55	159
		الفرقان	33	2
107	إِنَّ ٱلَّذِينَ تَوَفَّىٰهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمۡ قَالُواْ فِيمَ	الفرقان	25	126
108	تِلۡكَ ءَايَٰتُ ٱلۡكِتَٰبِ ٱلۡمُبِينِ	الشعراء	2	145
109	وَتَفَقَّدَ ٱلطَّيۡرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ أَرَى ٱلۡهُدۡهُدَ أَمۡ كَانَ	النمل	40	48
110	قَالَ عِفۡرِيت مِّنَ ٱلۡجِنِّ أَنَا۠ ءَاتِيكَ بِهِۦ قَبۡلَ أَن تَقُومَ	النمل	39	65
111	وَإِذَا وَقَعَ ٱلۡقَوۡلُ عَلَيۡهِمۡ أَخۡرَجۡنَا لَهُمۡ دَآبَّةمِّنَ ٱلۡأَرۡضِ تُكَلِّمُهُمۡ أَنَّ ٱلنَّاسَ	النمل	84	157
112	وَيَوۡمَ يُنفَخُ فِي ٱلصُّورِ فَفَزِعَ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِي ٱلۡأَرۡضِ	النمل	87	168
113	وَيَوۡمَ يُنفَخُ فِي ٱلصُّورِ فَفَزِعَ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِي ٱلۡأَرۡضِ	النمل	87	169
114	إِنَّ خَيۡرَ مَنِ ٱسۡتَـٔۡجَرۡتَ ٱلۡقَوِيُّ ٱلۡأَمِينُ	القصص	24	59

115	قَالَتۡ إِحۡدَىٰهُمَا يَٰٓأَبَتِ ٱسۡتَـٔۡجِرۡهُ	القصص	26	59
116	رَبِّ إِنِّي لِمَآ أَنزَلۡتَ إِلَيَّ مِنۡ خَيۡرٖ فَقِيرٞ	القصص	24	61
117	وَإِنَّ ٱللَّهَ لَمَعَ ٱلۡمُحۡسِنِينَ	العنكبوت	69	46
118	وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُم مِّنَ ٱلۡجَنَّةِ غُرَفٗا تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُ	العنكبوت	58	186
119	يَٰبُنَيَّ لَا تُشۡرِكۡ بِٱللَّهِۖ إِنَّ ٱلشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيمٞ	لقمان	13	5
120	وَلَوۡ أَنَّمَا فِي ٱلۡأَرۡضِ مِن شَجَرَةٍ أَقۡلَٰمٞ وَٱلۡبَحۡرُ يَمُدُّهُۥ مِنۢ بَعۡدِهِۦ سَبۡعَةُ أَبۡحُرٖ	لقمان	27	33
121	تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمۡ عَنِ ٱلۡمَضَاجِعِ يَدۡعُونَ رَبَّهُمۡ خَوۡفٗا	السجده	16	80
122	تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمۡ عَنِ ٱلۡمَضَاجِعِ يَدۡعُونَ رَبَّهُمۡ خَوۡفٗا	السجده	16	86
123	تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمۡ عَنِ ٱلۡمَضَاجِعِ يَدۡعُونَ رَبَّهُمۡ خَوۡفٗا وَطَمَعٗا	السجده	16	99
124	أَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ فَلَهُمۡ جَنَّٰتُ ٱلۡمَأۡوَىٰ	السجده	19	201
125	وَقَالُواْ ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ ٱلَّذِيٓ أَذۡهَبَ عَنَّا ٱلۡحَزَنَ	فاطر	34	73
126	وَنُفِخَ فِي ٱلصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ ٱلۡأَجۡدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمۡ يَنسِلُونَ	يٰسين	51	168
127	إِذَا قِيلَ لَهُمُ ٱتَّقُواْ مَا بَيۡنَ أَيۡدِيكُمۡ وَمَا خَلۡفَكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُونَ	يٰسين	45	174
128	ٱلۡيَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلَىٰٓ أَفۡوَٰهِهِمۡ وَتُكَلِّمُنَآ أَيۡدِيهِمۡ وَتَشۡهَدُ أَرۡجُلُهُم	يٰسين	65	179
129	ٱلُواْ ٱبۡنُواْ لَهُۥ بُنۡيَٰنٗا فَأَلۡقُوهُ فِي ٱلۡجَحِيمِ	الصافات	97	67
130	قَالَ يَٰٓإِبۡلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَن تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَيَّ	ص	75	90
131	لَهُمۡ غُرَفٞ مِّن فَوۡقِهَا غُرَفٞ	الزمر	20	80
132	ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوۡاْ رَبَّهُمۡ لَهُمۡ غُرَفٞ مِّن فَوۡقِهَا غُرَفٞ	الزمر	20	85
133	لَهُمۡ غُرَفٞ مِّن فَوۡقِهَا غُرَفٞ	الزمر	20	98
134	وَسِيقَ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوۡاْ رَبَّهُمۡ إِلَى ٱلۡجَنَّةِ زُمَرًاۖ حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءُوهَا وَفُتِحَتۡ أَبۡوَٰبُهَا	الزمر	73	188

135	ٱلنَّارُ يُعۡرَضُونَ عَلَيۡهَا غُدُوّٗا وَعَشِيّٗاۚ وَيَوۡمَ تَقُومُ ٱلسَّاعَةُ	الغافر	46	162
136	◌َتَّىٰٓ إِذَا مَا جَآءُوهَا شَهِدَ عَلَيۡهِمۡ سَمۡعُهُمۡ وَأَبۡصَٰرُهُمۡ	فصلت	20	178
137	إِنَّ ٱلَّذِينَ قَالُواْ رَبُّنَا ٱللَّهُ ثُمَّ ٱسۡتَقَٰمُواْ	فصلت	30	132
138	قُلۡ إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَر مِّثۡلُكُمۡ يُوحَىٰٓ إِلَيَّ أَنَّمَآ إِلَٰهُكُمۡ	فصلت	6	109
139	وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ ٱللَّهُ إِلَّا وَحۡيًا أَوۡ	الشورىٰ	51	104
140	◌َٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ وَيَسۡتَغۡفِرُونَ لِمَن فِي ٱلۡأَرۡضِۗ	الشورىٰ	5	126
141	كَذَٰلِكَ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ قُرۡءَانًا عَرَبِيّٗا لِّتُنذِرَ أُمَّ ٱلۡقُرَىٰ وَمَنۡ حَوۡلَهَا وَتُنذِرَ يَوۡمَ ٱلۡجَمۡعِ لَا رَيۡبَ فِيهِۚ فَرِيق فِي ٱلۡجَنَّةِ وَفَرِيق فِي ٱلسَّعِيرِ	الشورى	7	113
142	وَإِنَّهُۥ لَعِلۡم لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمۡتَرُنَّ بِهَا وَٱتَّبِعُونِۚ هَٰذَا صِرَٰط مُّسۡتَقِيم	الزخرف	61	160
143	فَٱرۡتَقِبۡ يَوۡمَ تَأۡتِي ٱلسَّمَآءُ بِدُخَان مُّبِين	الدخان	10	148
144	أَفَلا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلى قُلُوبٍ أَقْفالُها	محمد	24	31
145	◌َ◌ٰلِكَ بِأَنَّهُمُ ٱتَّبَعُواْ مَآ أَسۡخَطَ ٱللَّهَ	محمد	28	127
146	فَهَلۡ يَنظُرُونَ إِلَّا ٱلسَّاعَةَ أَن تَأۡتِيَهُم بَغۡتَة فَقَدۡ	محمد	18	159
147	وَٱسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۢبِكَ وَلِلۡمُؤۡمِنِينَ وَٱلۡمُؤۡمِنَٰتِۗ وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ مُتَقَلَّبَكُمۡ وَمَثۡوَىٰكُمۡ	محمد	19	164
148	وَجَآءَتۡ كُلُّ نَفۡس مَّعَهَا سَآئِق وَشَهِيدٞ	ق	21	72
149	والسقف المرفوع	الطور	5	5
150	إِنۡ هُوَ إِلَّا وَحۡي يُوحَىٰ	النجم	4	110
151	عَلَّمَهُۥ شَدِيدُ ٱلۡقُوَىٰ	النجم	5	110
152	وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلۡهَوَىٰٓ إِنۡ هُوَ إِلَّا وَحۡي يُوحَىٰ	النجم	2ـ3	116
153	ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ	النجم	8	129
154	عِندَهَا جَنَّةُ ٱلۡمَأۡوَىٰٓ	النجم	15	202
155	ٱقۡتَرَبَتِ ٱلسَّاعَةُ وَٱنشَقَّ ٱلۡقَمَرُ	القمر	1	149

156	يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي ٱلنَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُواْ مَسَّ سَقَرَ	القمر	48	211
157	كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَان وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو ٱلْجَلَٰلِ وَٱلْإِكْرَام	الرحمٰن	27ـ26	146
158	فَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ ٱلْمُقَرَّبِينَ فَرَوْح وَرَيْحَان وَجَنَّتُ نَعِيم	الواقعه	88	195
159	هُوَ ٱلْأَوَّلُ وَٱلْآخِرُ وَٱلظَّٰهِرُ وَٱلْبَاطِنُۖ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ	الحديد	3	91
160	مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةفِي ٱلْأَرْضِ وَلَا فِيٓ	الحديد	22	136
161	لِلْفُقَرَآءِ ٱلْمُهَٰجِرِينَ ٱلَّذِينَ أُخْرِجُواْ مِن دِيَٰرِهِمْ وَأَمْوَٰلِهِمْ	الحشر	8	70
162	مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلا بِإِذْنِ اللَّهِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ	التغابن	11	144
163	قَدْ أَنزَلَ ٱللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرارَّسُولا يَتْلُواْ عَلَيْكُمْ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ مُبَيِّنَٰت	الطلاق	11ـ10	116
164	مَلَٰٓئِكَةٌ غِلَاظ شِدَاد لَّا يَعْصُونَ ٱللَّهَ مَآ أَمَرَهُمْ	التحريم	6	134
165	فَإِذَا نُفِخَ فِي ٱلصُّورِ نَفْخَةوَٰحِدَة	الحاقه	13	134
166	فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَٰبَهُۥ بِيَمِينِهِۦ فَيَقُولُ هَآؤُمُ ٱقْرَءُواْ كِتَٰبِيَهْ	الحاقه	19	134
167	كَلَّآۖ إِنَّهَا لَظَىٰ	المعارج	15	208
168	وَكَانَتِ ٱلْجِبَالُ كَثِيبا مَّهِيلًا	المزمل	14	10
169	لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْداوَلَا شَرَابًا	النباء	24	12
170	وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَٰفِظِينَ كِرَاما كَٰتِبِينَ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ	الانفطار	10	124
171	إِذَا السمآء انشقت	الانشقاق	1	69
172	إِنَّ ٱلَّذِينَ فَتَنُواْ ٱلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُواْ فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ	البروج	10	206
173	وَٱلسَّمَآءِ وَٱلطَّارِقِ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا ٱلطَّارِقُ ٱلنَّجْمُ--	الطارق	3ـ2ـ1	4
174	تَنَزَّلُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ وَٱلرُّوحُ	القدر	4	26
175	فَأُمُّهُۥ هَاوِيَة	القارعه	9	215
176	فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَٰزِينُهُۥ فَهُوَ فِي عِيشَة رَّاضِيَ٧ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَٰزِينُهُۥفَأُمُّهُۥ هَاوِيَة	القارعه	7ـ6	178
177	كَلَّاۖ لَيُنۢبَذَنَّ فِي ٱلْحُطَمَةِوَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا ٱلْحُطَمَةُ	الهمزه	5ـ4	210
178	نَارُ ٱللَّهِ ٱلْمُوقَدَةُٱلَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى ٱلْأَفْـِٔدَةِ	الهمزه	7ـ6	209
179	قُلْ --- ٱللَّهُ ٱلصَّمَدُ	االاخلاص	4ـ1	77

فہرست احادیث

نمبر شمار	احادیث	کتاب کانام	صفحہ نمبر
1	الرَّمْلُ السَّائِلُ وَبِيلًا شَدِيدً	بخاری	10
2	لا تصدقو ا ہل الکتاب ولا تکذبوہم وقولوا آمنا باالله وما انزل الینا	بخاری	15
3	اتعلم احداً اعلم منک فقال موسیٰ لا فاوحیٰ الله الیٰ موسیٰ علیٰ	بخاری	16
4	(ان الله امرنی ان اقراء علیک لم یکن الذین کفروا قال سمانی لک قال نعم فبکی	مسند احمد	21
5	مایبکیک؟ قال یارسول الله ابکانی ان کنا فی زیادة من دیننا فاما اذا کمل فاند لم یکمل قط "شیء الانقص ، قال صدقت	مصنف ابن ابی شیبہ	30
6	وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّه	بخاری	92
7	الإِيمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَبِلِقَائِهِ، وَرُسُلِهِ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ	بخاری	123
8	عَلَى أَنْقَابِ المَدِينَةِ مَلَائِكَةٌ لَا يَدْخُلُهَا الطَّاعُونُ، وَلَا الدَّجَّالُ	بخاری	152
9	لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ	مسلم	161

نمبر شمار	فہرست تفصیل مصادر و مراجع
1	القرآن الکریم
2	طاہر محمود یعقوب الدکتور **اسباب الخطاء فی التفسیر**، طبع دار ابن جوزیہ، الدمام سعودی عریبیہ 1425ھ
3	: العسکری ابوھلال الحسن بن عبداللہ الاوائل للعسکری المکتبہ دار البشیر الطنطا1408ھ213
4	الشیخ خالد عبدالرحمٰن العک **اصول التفسیر وقواعدہ** دار ش لفائس 1986ء
5	البیضاوی، ناصرالدین ابو السعید عبداللہ بن عمر، انوار لتنزیل و اسرار التاویل دار الاحیاء التراث العربی بیروت 1418ھ
6	عبدالملک بن حبیب بن حبیب، اشراط الساعۃ وذہاب الاخیار بقاء الاشرار الناشر اضواء السلف 2005ء
7	الملاح، ابو عبدالرحمٰن محمود بن محد، الاحادیث الضعیفہ الموضوعۃ التی حکم علیہا الحافظ ابن کثیر فی تفسیرہ، مکتبہ العلوم والحکم المدینۃ المنورہ 2010ء
8	الزرکشی، بدر الدین محمد بن عبداللہ بن بہادر، **البرہان فی علوم القرآن**، دار المعرفۃ البیروت، لبنان 1957ء
9	فہد بن عبدلرحمٰن، **اصول التفسیر ومناہجہ**، الریاض 2017
10	البخاری، ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل، **الصحیح البخاری** لسلطانیہ باالطبعۃ الکبریٰ المیریہ 1433ھ
11	السمرقندی، ابو اللیث، نصر بن محمد، بحرالعلوم، الناشر الشاملہ 1431ھ
12	الخازن علاؤالدین علی بن محمد بن ابراہیم، **الباب التاویل ومعانی التنزیل** دار لکتب العلمیہ بیروت، 1415ھ
13	الذہبی، الدکتور، محمد حسین، التفسیر و المفسرون، دار الحدیث قاہرہ، 2012ء
14	ابن عربی، الشیخ الاکبر ابی ابکر محی الدین محمد بن علی، **تفسیر ابن عربی**، دار الکتب العلمیہ 2001ء
15	غلام شمس الرحمٰن، **تفسیر اشاری کی روایت کا منہج**، جلد 12 شمارہ 32 (2018
16	الدکتور عبدالرحیم، السید مقیل حسین، **التفسیر الاشاری، واہم کتبہ، (س ن)**
17	تستری، ابو محمد، سہل بن عبداللہ، تفسیر تستری دار لکتب العلمیہ بیروت 199الت

18	فیصل ندیم، تفسیر واصول تفسیر، تعارف، ضرورت، واہم کتابیں مکتبہ الشباب العلمیہ، لکھنؤ 2016
19	فیصل ندیم، تفسیر واصول تفسیر، تعارف، ضرورت، واہم کتابیں مکتبہ الشباب العلمیہ، لکھنؤ 2016
20	الماتریدی ،ابو المنصور ،محمد بن محمد ،تفسیر ماتریدی ،تاویلات اهل السنة ،ناشر دارلکتب العلمیه بیروت ،ط،اول 2005ء
21	ابن کثیر ، ابو الفداء ، اسماعیل بن محمد ، تفسیر القرآن العطیم ، دار الطیبة للنشروالتوزیع1999ء
22	السمعانی ابو المظفر منصور بن محمد بن عبدالجبار بن ا حمد المروزی الشافعی التفسیر السمعانی الناشر دار الوطن الریاض السعودیه 1997ء
23	اعظمی، شمس الدین، تصوف واحسان، خواجہ شمس الدین ریسرچ سوسائیٹی (س ن)
24	ابن عباس ،تنویر المقیاس فی تفسیر ابن عباس دار الکتب العلمیه لبنان 1432ھ
25	الطبری ،ابی جعفر ،محمد بن جریر ،**جامع البیان عن تاویل آی القرآن** ،مرکزالبحوث والدراسات العربیه والاسلامیه 2001ء
26	القرطبی،ابو عبدالله محمد بن احمد،**الجامع لاحکام القرآن** دارالکتب العلمیه 1432ھ
27	السلمی ، ابی عبدالرحمٰن ،محمد بن حسین ، ، **حقائق التفسیر**،دارالکتب العلمیه بیروت لبنان 2001ء
28	الزمخشری ،ابوالقاسم محمود بن عمر ، الکشاف حقائق غوامض التنزیل الناشر دار الکتاب العربی بیروت 1407ھ
29	الآلوسی ـ شہاب الدین ،محمود بن عبدالله الحسینی ، **روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع المثانی** دار الکتب العلمیه ،لبنان 1431ھ
30	القشیری،ابوالقاسم عباد لکریم بن ہوازن،رسالہ قشیریہ (مترجم شاہ محمد چشتی) ادارہ پیغام القرآن لاہور 2007ء
31	الشافعی ، محمد بن ادریس ،**الرسالة**(دار الکتب العلمیه بیروت، 2005ء)
32	الآلوسی، ،شہاب الدین محمود بن عبدالله روح المعانی، التفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی دار الکتب العلمیه بیروت 1431ھ،
33	ـ الاندلسی،شہاب الدین احمد بن محمد المعروف ابن عبدربه، **العقدالفرید** الذہبی دار الکتب العمیه بیروت1404ھ2/206،
34	النسفی ،ماتریدی، عمر بن محمد ،شرح عقائد نسفیه مترجم عبدالناصر لطیف ، ناشر نظامیه کتاب گھر لاہور 2013ء

35	العسقلانی ،،احمد بن علی بن حجر، الفتح الباری ، دارالمعرفۃ البیروت۔1389ھ
36	الابن الصلاح ، عثمان بن عبدالرحمٰن،**فتاویٰ لابن صلاح**، الناشرمکتبۃ العلوم بیروت1407ھ
37	الشوکانی، محمد بن علی بن محمد بن عبداللہ ، فتح القدیر ، ناشر دار الکم الطیب بیروت دمشق ، 1957ء
38	الفیروز آبادی، محمد بن یعقوب،مجدالدین ، **القاموس المحیط** ،مکتبہ تحقیق التراث موسسۃ الرسالہ دمشق،1998ء
39	الفراھیدی ،خلیل بن احمد ،**کتاب العین، دار المکتبۃ الھلال، 1431ھ**
40	الافریقی، ابن المنظور **لسان العرب** ،مطبع الکبریٰ،ببولاق مصر المحمیہ 1300ھ
41	الزرقانی ،محمد عبدالعظیم ، **مناہل العرفان فی علوم القرآن** ، دارالکتب العربیۃ بیروت(س۔ن)
42	ابو بکر بن ابی شیبہ ،**مصنف ابن ابی شیبہ** موسسۃ العالمیہ العربیہ)1989ء،
43	ابن تیمیہ ، **ابو العباس احمد بن عبدالحلیم مجموع الفتاویٰ** ،الناشر مجمع الملک الفھد المدینہ النبویہ 1990
44	الطیالسی ،ابوداؤد سلیمان بن داؤد ، مسند ابی داؤد الطیالسی ناشر دار الھجر مصر 1999ء
45	الاصفہانی ، ابوا لقاسم حسین بن محمد ، المفردات فی غریب القرآن ، دارالقلم الدار الشامیۃ بیروت ، 1412ھ
46	القاری، الھروی،علی بن سلطان ابو الحسن نور الدین ، مرقاۃ المفاتیح مشکاۃ المصابیح دار الفکر بیروت لبنان 2002،
47	الرازی، ابو عبداللہ محمّد بن عمر بن الحسن، التمیمی،مفاتیح الغیب ،دارالاحیاءالتراث بیروت1420ھ
48	القشیری ،مسلم بن حجاج مؤلف عبدالعظیم بن عبدالقوی بن عبداللہ،صحیح مسلم محقق ناصر الدین البانہ المکتب االاسلامی بیروت لبنان 1981ء۔